
انتساب

سخنور کے شعراء

ابن انشاء ، ذوالفقار علی بخاری ، بہار کوٹی ، بہزاد لکھنوی ، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم ، تحسین سروری ، سید محمد جعفری — ! حفیظ ہوشیارپوری ، سید آلِ رضا ، شکیب جلالی ، شورش کاشمیری ، سراج الدین ظفر ، سید عابد علی عابد ، عندلیب شادانی ، قابل اجمیری ، قمر جلالوی ، ماہر القادری ، مصطفےٰ زیدی ، منتظر صدیقی اور ناصر کاظمی کے نام

جن کی یاد آج آنکھوں میں ستاروں
کی طرح جگمگا رہی ہے۔

سلطانہ مہر

ع

مُصنّف : سُلطانہ مہر
ناشر : ادارۂ تحریر، ۱۸۸۷ پی آئی بی کالونی کراچی ۵
سرورق : مصوّر، آذر زوبی
مطبع : احمد برادرس ، کراچی
خطاط : راجہ بشیر۔ محمد اکرم
تعداد : گیارہ سو
دوسرا ایڈیشن
قیمت: ۱۵۰/ روپے

سال اشاعت ۱۹۸۰ء
پہلا ایڈیشن مئی ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔

ترتیب

دیکھیں کیا گذری ہے ...!

میں نے جب پاکستان میں صحافت کے میدان میں قدم رکھا (یہ ۱۹۶۶ء کی بات ہے) تو اردو اخبار اور رسالوں کے صفحاتِ خواتین 'میرے پسندیدہ اشعار' سے آگے نہیں بڑھے تھے۔ اس سے شعر و ادب کی تو کوئی خدمت نہ ہوتی تھی۔ ہاں شعر پسند کرنے والی خواتین یا مردوں کے نام شائع ہو جاتے تھے۔ میں نے تحریری طرحی مشاعرے کا سلسلہ شروع کیا۔ لیکن اوّل تو پاکستان میں شاعرات ہی کم تھیں۔ ان میں سے صفِ اوّل کی شاعرات نے اسے 'مرگ انبوہ' سے زیادہ کی اہمیت نہ دی تب خوب سے خوب تر کی تلاش مجھے "آج کا شاعر" تک لے آئی۔ میری خواہش تھی کہ اس دور کے شعراء جو نامساعد حالات میں بھی مقدور بھر ادب کی خدمت کر رہے ہیں انہیں قارئین سے متعارف کرایا جائے۔ اس طرح ان گمنام شعراء کے متعارف ہو جانے کا امکان بھی تھا جن کے تعارف کی دُور دُور تک کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ یوں مستقبل کے مؤرخ کو تاریخ شعر مرتب کرتے وقت وہ مواد فراہم ہو سکتا تھا۔ جس کی قدر کچھ اہلِ تحقیق ہی جانتے ہیں۔

اس سلسلے کو شروع کرنے سے پہلے میں نے چند احباب سے مشورہ بھی کیا اور بیشتر نے مجھے اس 'خدمت' سے باز رہنے کا مشورہ دیا کہ راہیں بہت ناہموار ہو جائیں گی۔ لیکن میں نے ناہموار راہوں اور خارزار پر چلنے کا فیصلہ کرتے ہوئے ۱۱ ستمبر ۱۹۶۷ء کو استاد قمر جلالوی مرحوم کے تعارف سے "آج کا شاعر" کے عنوان کے تحت روزنامہ جنگ کے صفحہ خواتین میں اس سلسلے کا آغاز کیا اور پھر —

پھر دو سال کے بعد استاد قمرؔ ہی کی پہلی برسی کے موقع پر جناب سحرؔ انصاری کے تعارف کے ساتھ (جو ۲۷، اکتوبر ۱۹۶۹ء کو شائع ہوا) یہ سلسلہ ختم کردیا۔ اس عرصہ میں کم و بیش سو شعراء و شاعرات کا تعارف میں نے شائع کیا۔ اور یہ سلسلہ ابھی دراز ہوتا مگر دوستوں کی نہ صرف دوستی بلکہ دشمنوں کی سی چیرہ دستیوں نے میرے لئے اسے ناممکن بنا کر رکھ دیا۔ بعض کو یہ گلہ تھا کہ ان کا تعارف محض تعارف کیوں تھا۔ خراجِ عقیدت کیوں نہ تھا۔ جن کے تعارف کی اشاعت سے میں چند مجبوریوں کی بنا پر قاصر رہی ان کی سفارشیں، دھمکیاں اور دشنام طرازی نے مجھے شدید ذہنی اذیت میں مبتلا کردیا۔ ایک تعارف چھاپنے کے سلسلے میں رشوت، احباب پروری اور دشمنی جیسے اعزازات سے مجھے نوازا گیا۔ ایک شاعرِ محترم نے محض غلط فہمی کی بنا پر یہ ہجو یہ نظم کہہ کر اپنی برادری میں تقسیم کرادی۔ ایسی کرم فرمائی کہ جسے دیکھ کر تہذیب و ادب کی سٹی گم تھی ؎

زباں بگڑی تو بگڑی تھی ....

وہ لوگ کہ جو پڑھے لکھے اور دانشور کہلاتے ہیں۔ انہوں نے گھٹ جوڑ، بھاگ دوڑ اور عزتِ نفس کے فقدان کا ایسا مظاہرہ کیا کہ اگر ان واقعات کی نشاندہی کی جائے تو شاید سننے والوں کو ان حضرات سے نفرت نہ ہو تو ان کی کم مائیگی پر رحم آجائے۔ کچھ ایسی کیفیت ان دنوں میری بھی تھی۔ لیکن اس وقت یہ خواہش میرے دل کے ایک گوشے میں ضرور تھی کہ میں بوقتِ فرصت اپنی اس محنت کو کتابی شکل میں قارئین کے سامنے ضرور پیش کروں گی۔ سو آج خدا کا شکر ہے کہ میں اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہوگئی ہوں۔

یہ کتاب "سخن ور" ان مضامین سے انتخاب کا مجموعہ ہے جو میں نے لکھے تھے اب اضافہ و ترمیم کے ساتھ یہ آپ کے ہاتھ میں کتابی شکل میں موجود ہے۔ اس میں صرف وہ "انٹرویوز" شامل ہیں جو شائع کئے گئے تھے۔ علاوہ تین شعراء کے جن کا انتقال ہوچکا تھا۔ لیکن "سخن ور" کی جلد دوم میں جس کے کام کا آغاز ہوچکا ہے۔ ان تمام

شعراء کرام کا تعارف شامل ہوگا جن سے نیاز حاصل کرنے کی سعادت سے میں ناگزیر وجوہ کی بنا پر محروم رہی تھی۔ زندگی نے وفا کی تو اس کی دوسری جلد انشاء اللہ سالِ رواں میں ہی مکمل کر لوں گی۔

یہ کتاب کیا ہے، کیسی ہے اس کا فیصلہ میں نے اپنے قارئین پر چھوڑا جن کی رائے کا مجھے انتظار رہے گا۔

آخر میں ان تمام احباب کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جنہوں نے اس کتاب کی ترتیب و اشاعت کے سلسلے میں میری رہنمائی کی اور مجھے گرانقدر مشوروں اور اپنے قیمتی وقت سے نوازا۔

محترم مصوّر آذر زوبی کی میں بے حد شکر گذار ہوں جنہوں نے سرورق کو "سخن ور" کے خاکے سے سجایا کہ بقول ان کے سخنور کی نگاہ چاروں طرف رہتی ہے اور زوبی کے منتخبہ تین رنگ جن سے دنیا کے باقی سارے رنگ جنم لیتے ہیں اس سرورق کی دلکشی میں اضافہ کرتے ہیں۔

سلطانہ مہر

۲۱، اپریل ۱۹۷۹ء

تاریخی افادیت

سُلطانہ مہر جہاں ایک اچھی افسانہ نگار ہیں وہاں ایک ہنرمند صحافی بھی ہیں۔ وہ "جنگ کراچی" کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ان کی زیرِ نظر تصنیف "سخنور" جس میں ساٹھ معاصر شعراء کے قلمی چہرے کچھ اس طرح پیش کئے گئے ہیں کہ وہ اپنی کہانی آپ سناتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی فنکارانہ صلاحیت کا ایک کامیاب نمونہ ہے متواتر تین سال تک یہ انٹرویو جنگ اخبار میں چھپتی رہی ہیں۔ ان کا یہ کالم اس قدر مقبول ہوا کہ جنہیں یہ خوف لاحق ہوا کہ مبادا وہ ان کی نظرِ انتخاب سے رہ جائیں۔ انہوں نے سفارشی خطوط اور ہرکارے بھی دوڑا لئے۔ چنانچہ انہوں نے کوئی انتخابی نظریہ اختیار کرنے کے بجائے سبھی کو دعوتِ گفتگو دی ہے۔ اور اس امر کا وعدہ کیا ہے کہ جو اس انتخابی فہرست سے رہ گئے ہیں وہ اپنا چہرہ اس تذکرے کی دوسری جلد میں دیکھیں گے۔

اس تذکرے کی جو تاریخی افادیت ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ کل کے مؤرخ ہوں یا دورِ حاضر کے، وہ اس تذکرے سے بڑا قیمتی مواد حاصل کریں گے۔ کاش ایسے تذکرے عہدِ ماضی میں لکھے گئے ہوتے تو ہمیں اپنے کلاسیکی شعراء کو سمجھنے میں کتنی مدد ملتی۔

لیکن یہاں میں اس کی تاریخی افادیت ہی کا ذکر کرنا نہیں چاہتا۔ یہ تذکرہ ہمارے اس ذوقِ تجسس کو بھی سامانِ تسکین بہم پہنچاتا ہے، کہ دیکھیں ہمارے یہ شعراء جو

مشاعروں میں گرجتے برستے یا گنگناتے اور لبھاتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ اندرونِ خانہ کیونکر ہیں۔ ان کا گھریلو ماحول اور ان کے محرکاتِ شعری کیا رہے ہیں۔ اس طرح کی بہت سی چھوٹی چھوٹی باتوں تک رسائی اس تذکرے کے آگے پڑھنے سے ہوتی ہے، اس میں شبہ نہیں کہ حقیقی تصویر پہ سے پردہ تو ذرا ہی سا اٹھتا ہے لیکن طائرِ خیال کو اپنی پرواز کے لئے خاصے اشارے مل جاتے ہیں۔

سلطانہ مہر نے اس تذکرے میں شامل شعرا کی گفتگو کو اس فنکارانہ مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ وہ کسی پردہ داری کے بغیر اظہارِ ذات کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ کام بغیر سلیقہ کے نہیں آتا۔ اس کا تعلق سوال کی نوعیت اور گفتگو کرنے والے کی برمحل دخل اندازی سے بھی ہوتا ہے۔ سلطانہ مہر کو یہ فن خوب آتا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے شاعر کی جہاں ایک مختصر سوانح حیات دی ہے۔ وہاں اس کے کلام کی انفرادی خصوصیات کو بھی اُجاگر کیا ہے۔ اس کام میں متعلقہ شاعر اُن کا مددگار بھی رہا ہے۔ میرا یہ خیال ہے کہ ایسا کوئی اور تذکرہ، اتنا دلچسپ اور بامزہ اس دور میں ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔

پروفیسر ممتاز حسین

۱۸، اپریل ۱۹۷۹ء

سوانحی معلومات

پُرانے زمانے کے صاحبانِ ذوق اور ادب دوستوں میں سے ہر ایک کے پاس ایک بیاض ہوتی تھی۔ کوئی اچھا شعر سنا لکھ لیا۔ کوئی کام کی بات کان میں پڑی۔ اسے درج کر لیا۔ کھانسی زکام سے لے کر لاعلاج بیماریوں تک کے طبّی نسخے جمع کر لئے۔ گھر کے بچّوں کی پیدائش، افرادِ خاندان، دوست احباب اور معززینِ شہر کی تاریخ ہائے وفات مع مادّہ ہائے تاریخ محفوظ کرلیں۔ غرض ان بیاضوں میں دنیا بھر کی ہر وہ چیز مل جاتی تھی جو کہیں اور نہیں مل سکتی تھی۔ ان بیاضوں میں شعروں کے جمع کرنے پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ کسی کے جی میں آیا تو شاعر کا نام بھی لکھ دیا، ورنہ بلا نام ہی سہی۔ کچھ لوگوں نے شاعروں کے نام کے ساتھ ان کے حالات میں ایک آدھ جملہ بھی لکھ دیا۔ بس یہیں سے ہماری پُرانی تذکرہ نویسی کا آغاز ہو گیا۔ "نکاتِ الشعرا" (میر) سے لے کر "سخن شعرا" (نساخ) تک درجنوں تذکرے لکھے گئے، اور یہی ہماری ادبی تاریخ کی بنیاد ہیں۔ ان تذکروں میں ہزار خامیاں سہی، لیکن یہی ایک خوبی کیا کم ہے کہ ہم اپنے بے شمار شاعروں سے انہیں تذکروں کے ذریعے واقف ہوئے۔

بیسویں صدی میں لے دے کے ایک ہی تذکرہ "خم خانۂ جاوید" لکھا گیا اور وہ بھی مکمل نہیں ہو سکا۔ اب یہ حال ہے کہ ہم اپنے شاعروں ادیبوں کے بارے میں بنیادی معلومات حاصل کرنا چاہیں تو کوئی ایسی کتاب نہیں ملتی جو ہماری رہنمائی کر سکے۔ خدا بھلا کرے مالک رام صاحب کا جو گزشتہ دس بارہ برس سے ہر مرنے والے ادیب کی سوانح عمری

لکھ دیتے ہیں۔ اب تک وہ کوئی پونے دو سو ادیبوں اور شاعروں کے مختصر حالاتِ زندگی لکھ کر "تذکرہ معاصرین" کے نام سے تین جلدوں میں شائع کر چکے ہیں۔ حالات کے تلاش کرنے میں انہیں بے شمار دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ مرحوم ادیبوں کے رشتہ داروں، دوستوں اور جاننے والوں کو بار بار خط لکھتے ہیں۔ اخباروں میں شائع ہونے والی خبریں جمع کرتے ہیں تب کہیں جا کر بات بنتی ہے۔

شاعروں ادیبوں کے مرنے کے بعد ان کے حالات جمع کرنے کا خیال تو سبھی کو آتا ہے۔ لیکن معلوم نہیں اس نیک کام کے لئے کسی کے مرنے کا انتظار کیوں کیا جاتا ہے۔ اگر کسی کے جیتے جی اس کے حالات لکھ دیئے جائیں، اور اس سلسلے میں صاحب سوانح کی مدد بھی حاصل کر لی جائے تو سوانحی تحریر معتبر و مستند ہو سکتی ہے۔

آج سے بارہ سال قبل سلطانہ مہر نے روزنامہ جنگ کراچی" میں "آج کا شاعر" کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا تھا۔ یہ کوئی دو سال جاری رہا اور اس کے تحت بیسیوں شعرا کے حالاتِ زندگی شائع ہوئے۔ ان مضامین کے ساتھ ہر شاعر کا انتخابِ کلام، تصویر اور عکس تحریر بھی شائع کیا جاتا تھا۔

یہ سلسلہ بہت مقبول ہوا۔ لیکن اس کی یہی مقبولیت اس کے خاتمے کا سبب بھی بنی۔ بہت سے ایسے شاعر جن کے حالات فوری طور پر اس سلسلے میں شامل نہیں کئے جا سکتے تھے۔ ان کی فرمائشوں نے سلطانہ مہر کو اتنا پریشان کیا کہ انہوں نے عافیت اسی میں دیکھی کہ یہ سلسلہ ہی ختم کر دیا۔ کاش ایسا نہ ہوتا۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہتا تو اُردو کے سوانحی ادب میں قابلِ قدر اضافہ ہوتا۔

اخباروں میں جو چیزیں چھپتی ہیں، ان سے مستقل طور پر استفادہ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اخبار کی زندگی ایک دن کی ہوتی ہے۔ دوسرے دن کسی کو یاد بھی نہیں رہتا کہ کل اخبار میں کیا چھپا تھا۔ ایسے کتنے لوگ ہوں گے جنہوں نے اس مفید سلسلۂ مضامین کے تراشے محفوظ کر لئے ہوں۔ اس قسم کی تحریروں کو کتابی صورت میں محفوظ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ سلطانہ مہر نے بہت اچھا کیا کہ وہ اپنے مضامین کو کتابی صورت میں شائع

کر رہی ہیں۔ "آج کی شاعرات" وہ ۱۹۷۴ء میں شائع کر چکی ہیں۔ اب شاعروں کے بارے میں مضامین "سخنور" کے نام سے شائع ہو رہے ہیں۔ پہلی جلد میں ساٹھ شاعروں کے حالات ہیں۔ دوسری جلد بھی عنقریب شائع ہو گی۔

آئندہ اوراق میں آپ کو شعرا کے جو حالات ملیں گے، ان کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ سلطانہ مہر نے ہر شاعر سے ملاقات کر کے اس کے حالات معلوم کئے ہیں یہی وجہ ہے کہ بعض سوانحی خاکوں میں آپ بیتی کا رنگ نمایاں ہے۔ سلطانہ مہر نے ہر شاعر کے بارے میں بنیادی معلومات ہی جمع نہیں کیں بلکہ بعض اہم مسائل پر ان کی آراء کو بھی اس طرح محفوظ کر دیا ہے کہ ہر شاعر کے ذہنی رجحانات اور ادبی نقطۂ نظر سے بھی آگاہی ہو جاتی ہے۔

اس کتاب میں متعدد ایسے شعرا کے حالات شامل ہیں جن کے بارے میں اب تک بہت کم لکھا گیا ہے۔ اور بعض شاعر تو ایسے بھی ہیں جن سے متعلق سوانحی معلومات صرف اسی کتاب میں ملتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ صورتحال اس کتاب کی اہمیت و افادیت میں بہت اضافہ کرتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب سراج الدین ظفر۔ سید محمد جعفری تحسین سروری اور بعض دوسرے شعرا کا انتقال ہوا تھا تو دہلی سے جناب مالک رام نے ان مرحومین کے حالات طلب کئے تھے۔ مجھے ان کے بارے میں سلطانہ مہر کے مضامین کے سوا کچھ نہیں ملا تھا۔ اور یہی میں نے مالک رام صاحب کو بھیج دیئے تھے۔ ان مضامین سے انہوں نے اپنے "تذکرۂ معاصرین" میں خاصا استفادہ کیا ہے۔

کتاب کا یہ پہلا حصہ جو آپ کے پیش نظر ہے۔ اس کے مضامین اسی صورت میں شائع نہیں ہو رہے۔ جس صورت میں یہ اخبار میں چھپے تھے۔ مصنفہ نے تقریباً سبھی مضامین میں مفید اضافے کئے ہیں اور بہت سے ایسے امور کا اضافہ کیا ہے جن کا تعلق ان مضامین کی اخباری اشاعت کے بعد کے زمانے سے ہے۔ کتاب میں چند مضامین ایسے بھی شامل کئے گئے ہیں جو کسی وجہ سے اخبار میں شائع نہیں ہو سکے تھے۔

سلطانہ مہر اردو کی نامور صحافی ہیں۔ وہ "جنگ" کے صفحہ خواتین کی انچارج ہیں۔ لیکن ان کی اصل حیثیت افسانہ نگار اور ناول نویس کی ہے۔ ان کے چار ناول اور افسانوں کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ ان کا ناول "جب بسنت رُت آئی" اپنی نوعیت کی منفرد ادبی تخلیق ہے۔ اردو میں پہلی مرتبہ اس ناول کے ذریعے بمبئی کے بوہری اور میمن برادری کی معاشرت کی عکاسی کی گئی ہے۔ سلطانہ مہر کے افسانوں کے مجموعے "بند سیپیاں" میں جو بیباکی اور جرأتِ اظہار ملتی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے انھوں نے اردو افسانے کو کئی زندہ رہنے والے کردار دیئے ہیں۔ ان کرداروں کے ذریعے انھوں نے ہمارے معاشرے کے بعض خاص پہلوؤں کی جو تصویر کشی کی ہے وہ کچھ انہیں کا حصّہ ہے۔ افسانہ نگار کی حیثیت سے سلطانہ مہر کی کامیابی کی گواہی عصمت چغتائی اور احمد ندیم قاسمی نے بھی دی ہے۔

سلطانہ مہر کا تعلق بمبئی کے ایک میمن گھرانے سے ہے۔ ان کی مادری زبان گجراتی ہے۔ اردو انھوں نے اپنے شوق اور محبت سے سیکھی ہے۔ معاملہ جب شوق کا ہو تو محنت رائیگاں نہیں جاتی۔ سلطانہ مہر کی قدآور ادبی شخصیت، اسی کاردبار شوق کی روشن مثال ہے۔

مجھے یقین ہے کہ زیرِ نظر کتاب ادبی حلقوں میں مقبول ہو گی۔ اور کیا تعجب کہ اس مقبولیت کو دیکھ کر سلطانہ مہر اپنے اخبار میں اس سلسلے کو دوبارہ جاری کر دیں۔

مشفق خواجہ

۱۶ر اپریل ۱۹۷۹ء

احسان دانش



آتش خاموش
جادۂ نو
چراغاں
حدیث ادب
درد زندگی
زخم و مرہم
شیرازی
گورستان
مقامات
میراث مومن
نفیر فطرت
نوائے کارگر

پیدائش سنہ ۱۹۱۴ء



چوتھی جماعت کے لئے کتابیں آئیں تو ان کی خاطر گھر کے برتن فروخت کرنا پڑے۔ اس کے بعد نہ بیچنے کے لئے کوئی سامان تھا نہ اگلی جماعت کے لئے کتابیں آسکیں۔ چنانچہ اردو کا یہ منفرد شاعر باقاعدہ تعلیم سے محروم رہ گیا۔

یہ المناک کہانی ہے احسان دانش کی۔ جنہوں نے کاندھلہ ضلع مظفر نگر۔ یوپی میں جنم لیا۔ والد صاحب معمولی پڑھے لکھے تھے اور مزدور طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ تعلیم چھوٹ جانے کے بعد احسان الحق بھی باپ کے ساتھ مزدوری کرنے لگے۔ ریت کھودنے سے فرصت ملتی تو خود ہی پڑھا کرتے۔ کھانے کے وقفے میں دوسرے مزدور سو جاتے تو یہ دیوان غالب سنبھال کر اپنے شعور کو بیدار کرنے میں محو رہتے۔ احسان دانش ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ پندرہ سال کی عمر تھی کہ کسی سے سن لیا کہ لاہور میں کتب خانوں کی بہتات ہے اور انسان خریدے بغیر بھی کتابیں پڑھ سکتا ہے۔ یہ سن کر لاہور جانے کی ٹھان لی اور غالباً ۲۹ء میں وہاں پہنچے۔ لاہور نے پردیسی مسافر کو آسرا دیا اور اینٹیں ڈھونے کا کام مل گیا۔ اس زمانے میں چار گھنٹے مطالعے کو مل جاتے تھے۔ مگر جی چاہتا تھا کہ اور پڑھیں آخر ایک جگہ چوکیداری کی ملازمت کرلی۔ اس میں مطالعے کے لئے کافی وقت مل جاتا تھا۔ کچھ عرصے اسکول اور کالجوں کے چکر بھی لگائے تاکہ چپراسی یا بیرے کا کام مل جائے تو پڑھنے میں آسانی ہو لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ اردو، ہندی، عربی، فارسی کا مطالعہ کیا۔

زیادہ تر سوانح، فلسفہ اور تنقید کی کتابیں پڑھیں۔ انگریزی کبھی نہیں پڑھی۔ ضرورت ہی نہ سمجھی (اگرچہ اب صرف انگریزی فلمیں دیکھتے ہیں اور انہیں سمجھ بھی لیتے ہیں۔ بغیر استاد کی مدد سے انہوں نے اتنا پڑھ لیا کہ اب ہندی، اردو، عربی، فارسی دوسروں کو پڑھا سکتے ہیں پڑھانے کے اصول انہوں نے خود ایجاد کئے ہیں۔ جن کی مدد سے بڑے کم وقت میں یہ زبانیں پڑھائی جا سکتی ہیں۔

احسان دانش جب مزدوری کرتے تھے تو چار آنے روز پاتے تھے۔ چوکیداری شروع کی تو گویا ترقی مل گئی۔ یعنی رہنے کی جگہ اور اکٹھے چودہ روپے تنخواہ پھر کچھ استعداد بڑھی تو رات کو پروف پڑھنے اور بچوں کے لئے نظمیں لکھنے کا کام ڈھونڈھ لیا۔ اسی میں سے کچھ رقم باقاعدگی سے گھر بھی بھیجتے تھے۔ اس لئے کہ اب کنبے کا بار انہی پر تھا۔ چودہ پندرہ سال کی عمر میں والدہ کے حکم پر عزیزوں میں شادی کر لی۔ احسان اپنی والدہ کو پرستش کی حد تک چاہتے تھے اس لیے انہی کی خواہش پر اور ان کی دعا سے ہی انہوں نے علم کی دولت حاصل کر لی۔ کچھ عرصے بعد گورنمنٹ ہاؤس میں مالی کے ماتحت کے طور پر ملازمت مل گئی کچھ دن اس میں گزارے پھر ریلوے میں چپراسی ہو گئے آٹھ روپے تنخواہ تھی۔ مطالعہ جاری تھا۔ یہ مطالعہ کسی خاص نظام کے تحت نہ تھا۔ جو کتاب جس موضوع کی ہاتھ آئی پڑھ ڈالی۔ اس طرح پڑھنے کا نام انہوں نے "آوارہ خوانی" رکھ چھوڑا ہے جو اپنی جگہ بے حد دلچسپ نام ہے۔ ریلوے کی ملازمت کے دوران ایک روزنامے کی ادارت انہیں پیش کی گئی۔ یہ کام چونکہ مذاق کے مطابق تھا لہٰذا ریلوے کی ملازمت چھوڑ دی لیکن پھر پتہ چلا کہ پرچے کی پالیسی ایک خاص سیاست کی پابند ہے۔ یہ اس کے لئے تیار نہ ہوئے۔ چنانچہ گیلانی بک ڈپو میں سیلز مین ہو گئے تنخواہ بیس روپے تھی اور کتابوں کی دوکان تھی۔ انہیں اور کیا چاہیئے تھا۔ کئی برس خوب جی لگا کر پڑھا اور پیسے جمع کرتے رہے۔ ڈھائی سو روپے ہو گئے تو اپنے خرچ پر اپنا پہلا مجموعہ "حدیث ادب" شائع کیا۔ اس زمانے میں یہی لاگت آتی تھی۔ گیلانی بک ڈپو کے تجربے سے انہوں نے خوب فائدہ اٹھایا اور اپنے مجموعے کے تبادلے میں دوسری کتابیں مختلف اداروں سے حاصل کر کے، "مکتبہ دانش" قائم کر لیا۔ یہ تقسیم سے قبل کا واقعہ ہے۔ بیوی اور

سخن ور (تذکرہ شعراء)

والدین کو اس سے پہلے ہی لاہور بلوا چکے تھے۔ مکتبہ دانش کے قیام کے بعد سے انہیں مالی دشواریوں سے نجات مل گئی تو ریسرچ کا شوق پیدا ہوا۔ قلمی نسخے اکٹھے کرنے لگے اس وقت ان کے مکتبے میں اردو، ہندی، فارسی اور عربی کی تین سو سے زیادہ محض ڈکشنریاں موجود ہیں۔ ابن عربی کے ساڑھے چار ہزار صفحات کے علمی سرمائے کے دنیا میں صرف دو قلمی نسخے ہیں۔ ایک جرمنی کے ایک عجائب گھر میں ہے اور دوسرا ان کے پاس ہے۔ اٹھارہ سو قلمی نسخے احسان دانش نے منہ مانگے دام دے دے کر حاصل کئے ہیں۔ ۱۸۵۷ء اور اس کے قریب انگریز افسروں اور والیان ملک کے خطوط کا ایک اچھا ذخیرہ ان کے پاس ہے۔ ان خطوط کو اگر شائع کیا جائے تو برصغیر کی تاریخ از سر نو لکھنا پڑے گی۔

احسان دانش ہندوستان میں جگہ جگہ جا کر مشاعرے پڑھتے اور جو معاوضہ ملتا وہ ان نوادرات کی خریداری پر خرچ کرتے تھے۔ اب چاہتے ہیں کہ ان کے نام سے ایک میوزیم قائم کیا جائے جس میں وہ ان نوادرات کو جمع کر دیں تاکہ پوری قوم ان سے فائدہ اٹھا سکے۔ اس سلسلے میں حکومت کو درخواست بھی دے رکھی تھی۔ ابھی تک یہ درخواست سرخ فیتہ کی نظر ہے۔

تقسیم سے پہلے احسان دانش کے آٹھ مجموعے شائع ہو چکے تھے۔ یعنی حدیث ادب، نوائے کارگر، چراغاں، شیرازہ مقامات، آتش خاموش، جادہ نو، زخم و مرہم اور تفسیر فطرت۔ (احسان دانش جس وقت یہ بتا رہے تھے تو شاعر لکھنوی بولے کہ یہ دعوی غلط ہے کیونکہ میں نے تو تمہارا ایک بھی مجموعہ نہیں پڑھا۔ اس پر احسان دانش نے جواب دیا "کیوں اپنی بدذوقی کا اشتہار دے رہے ہو؟")۔

نثر میں بھی ان کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ طبقات، جس میں تجربات اور اقوال جمع کئے گئے ہیں۔ لغات الاصلاح جس میں اردو کے پانچ ہزار الفاظ اکٹھے کئے گئے ہیں جن کو غلط بولا اور لکھا جاتا ہے۔ زبان کی اصلاح پر ایک اور کتاب دستور اردو، اور ایک رسالہ علم عروض پر شائع ہو چکا ہے۔ دو مجموعے "فصل سلاسل اور رنگ رس، تیار ہیں" جہان دانش" اپنی سوانح لکھی ہے جو چھ سو صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں کسی جگہ مبالغے سے کام نہیں لیا ہے

(اب اس کا دوسرا حصہ مکمل کر رہے ہیں) جہانِ دانش پر انہیں آدم جی انعام ملا۔ ۱۹۷۸ء میں انہیں حکومت پاکستان نے ستارۂ خدمت کے اعزاز سے نوازا۔ اردو کے محاورات پر ایک کتاب "اساس المثال" اور تذکیر و تانیث پر چار سو صفحے کے رسالے کے مسودے بھی تیار ہیں۔ انہوں نے ریاضی بھی خود پڑھی اور اصول ریاضیات مرتب کئے۔

۱۹۳۵ء میں احسان کی والدہ اور ۱۹۳۶ء میں والد جدا ہو گئے۔ والد بیمار تھے کہ کسی نے آکر کہا کہ احسان کا انتقال ہو گیا۔ اس صدمے سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ بہرحال والدین کی زندگی میں ہی انہوں نے گھر کے حالات تبدیل کر دیئے تھے۔ جب کہیں سے ہزار دو ہزار روپے آتے احسان بینک سے چاندی کے سکوں میں تبدیل کراتے اور لا کر ماں باپ کے قدموں میں ڈال دیتے کہ ان سے چھو کر یہ میرے استعمال کے لائق ہو جائیں گے۔

باقاعدہ تعلیم سے محرومی کا انتقام لینے کے لئے احسان نے اپنے گھر میں دانش گاہ کے نام سے ایک اسکول کھول رکھا ہے۔ جہاں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے اور بچوں اور بچیوں سے صرف اتنی فیس لی جاتی ہے کہ اساتذہ کی تنخواہیں ادا ہو جائیں۔

احسان ۱۹۷۸ء میں ایک لغت بھی مرتب کر رہے تھے جس کے تین ہزار صفحات لکھ چکے تھے۔

"فرہنگِ دانش" نامی اس لغت میں نہ صرف اردو، فارسی اور عربی بلکہ ہندی، سندھی، پشتو، بنگالی اور انگریزی کے الفاظ بھی شامل کئے جا رہے ہیں۔ تکمیل کے بعد یقیناً یہ اپنی قسم کی ایک ہی ڈکشنری ہوگی۔

ماہنامہ "جام نو" کراچی نے غالباً ۱۹۶۷ء میں "احسان دانش نمبر" شائع کیا تھا۔ دیگر رسائل کو ابھی توفیق نہیں ہوئی۔

احسان دانش کے پانچ بچے ہیں۔ ایک صاحبزادے ذیشان دانش لندن میں ٹیکسٹائل انجینئر تھے۔ دوسرے فیضان دانش نے لسانیات میں پی ایچ ڈی کیا اور گورنمنٹ ڈگری کالج باغبانپورہ میں پڑھاتے ہیں۔ تیسرے سلیمان دانش ڈرافٹسمین ہیں۔ دو لڑکیاں بھی ہیں۔ احسان دانش کو موجودہ نظامِ تعلیم سے شکایت ہے کہ اس کی بنا پر طلبا اور اساتذہ

دونوں کا علم کھوکھلا ہوتا ہے۔ پھر یہاں بہترین دماغوں کو سائنس کی طرف لگا دیا جاتا ہے
حالانکہ دوسرے ممالک میں اس کے برعکس ہوتا ہے۔ کیونکہ قیادت ہمیشہ آرٹس کے
ذمے ہوتی ہے۔ انتظامیہ میں بھی آرٹس کے فنکاروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہمارے ہاں
بدتر دماغ ہی فنون کی جانب آتے ہیں۔ پھر وہ افسر بنتے ہیں تو ظاہر ہے کہ نظام درست
نہیں رہ پاتا۔ انہوں نے کہا کہ مضامین کی تعداد گھٹانی چاہیئے اور معیار بڑھانا چاہیئے
کہ بچے کا رجحان کس جانب ہے۔

احسان دانش نے زندگی میں بے شمار فاقے کئے لیکن کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا
کبھی قرض نہیں لیا۔ آج خدا کے فضل سے وہ عالمی شہرت کے مالک ہیں ان کی پچاس نظموں
کے ایک مجموعے کا روسی زبان میں اور پھر دوسری سترہ زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان کو دنیا
سے یہی شکایت ہے کہ امیر آدمی غریب کو اس کی محنت کا پورا معاوضہ نہیں دیتے اور غریبوں
کو تعلیم حاصل کرنے کی سہولتیں حاصل نہیں ہیں۔ اس کے خلاف وہ جہاد کر رہے ہیں اور
کرتے رہیں گے۔ شورش کاشمیری ان کے پہلے شاگرد تھے اور انہوں نے ہی محبت سے
ان کا نام 'شورش' رکھا تھا۔ انارکلی لاہور میں رہتے ہیں۔ اور اس وقت کے انتظار
میں ہیں کہ جب ادیبوں اور شاعروں کی صحیح معنوں میں قدر کی جائے۔

خدا کرے یہ وقت ان کی زندگی ہی میں آجائے تاکہ ان کا سارا کلام کتابی صورت میں
ہمیں دیکھنے ملے۔

احسان دانش

عکسِ فن

کیا مر گئے اہلِ جنوں کچھ جذبہ تو لو
اٹھتی نہیں کہیں سے بھی دار و رسن کی بات

مرے شہپاروں کی کھائیں گے قسم اہلِ ادب
میں نے سیارے تراشے ہیں چراغِ شام سے!

ہر حسین تبسّم کا اختتام ہے آنسو
ہے ہر اک بلندی کے دامنوں میں گہرائی

دل اُمنڈ آیا ہے احسان بھر آئے آنسو
جب سُنا ہے کسی فن کار نے فن بیچ دیا

تم سادہ مزاجی سے مٹے پھرتے ہو جس پر
وہ شخص تو دنیا میں کسی کا بھی نہیں ہے

دِل سوزِ الم سے جلتا ہے لبریز لہو سے سینہ ہے
اس ملک میں رہنے والوں کا یہ مرنا ہے یا جینا ہے

اطہر نفیس

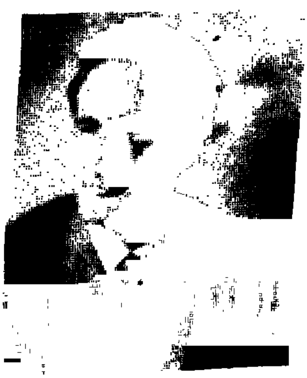


کلام

پیدائش سنہ ۱۹۳۲ء

مرا دل زندہ ہے جو آج دنیا کی ہنسی اور دل کا شیوہ تھا
ہم نے جب سے جینا سیکھا جینا کارِ دشوار ہوا

اطہر نفیس ۳۰/۳/۷۹



اطہر نفیس

" شاعری یا ادب کے بارے میں میرے خیالات بہت پیچیدہ یا فلسفیانہ نہیں ہیں۔ میں نے شاعری کو جس طرح محسوس کیا ہے اسی طرح عرض کروں گا۔ میں شاعری کو شاعری کی پوری ذات سے تعبیر کرتا ہوں میرے نزدیک کوئی بھی تخلیقی فن، فنکار کی تمام زندگی پہ محیط ہوتا ہے۔ اور اگر زندگی میں سیاست کا کوئی حصہ ہے (اور یقیناً ہے) تو پھر شاعری پہ سیاست کا اثر انداز ہونا بھی ضروری ہے۔ مگر ایک شاعر اپنی شاعری میں سیاست کو کس طرح قبول کرے گا یہ اس کا اپنا مسئلہ ہے کسی اور کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ شاعر کو ایک مخصوص لائحہ عمل " مرتب کر کے " عطا کرے۔"

میرا سوال تھا کہ "سیاست اور شاعری میں باہمی تعلق کیا ہے" اور اس کا جواب دے رہے تھے جناب اطہر نفیس۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ "میں اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ شاعری یقینی طور پہ سیاست یا دیگر خارجی عوامل کی تابع ہو۔ میرے نزدیک اعلیٰ شاعری ان تمام چیزوں سے بالاتر ہو کر ان تمام چیزوں سے اپنا رشتہ قائم رکھتی ہے۔"

اطہر نفیس علی گڑھ کے ایک قصبہ میں ۳۲ء یا ۳۳ء میں پیدا ہوئے بغرضِ تعلیم زیادہ تر علی گڑھ میں رہے ابھی تعلیم جاری تھی کہ ملک تقسیم ہو گیا۔ اور ۴۶ء میں یہ بھی پاکستان آ گئے۔ ان کے گھر میں کوئی باقاعدہ شاعر تو نہ تھا لیکن علم دوستی اور سخن فہمی عام تھی۔ تقسیم سے پہلے انہیں مشاعروں میں جانے اور کلام سننے کا شوق تھا ۴۸ء میں انہوں

نے بھی شعر کہنے کی ابتداء اور غزل سے کی - جو آج بھی ان کی محبوب صنف ہے ۔
اطہر نفیس ادب میں نعرے بازی کے قائل نہیں ۔ ان کا کہنا ہے کہ ادب کو مختلف تحریکوں کے زیر اثر خواہ وہ سیاسی ہوں یا اخلاقی خانوں میں بانٹ دینا غلط ہے ۔ اس طرح ادب میں ایک طرح کی یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے جو نہیں ہونا چاہیئے ۔ دراصل ادب تخلیق کرنا ادیب کا ذاتی مسئلہ ہے یہ الگ بات ہے کہ اس کی تخلیق اپنے قاری تک پہنچتے پہنچتے خود قاری کی جذباتی کشمکش اور ذہنی مسائل کی آئینہ دار ہو جائے اور شاید اسی طرح شاعری یا ادب اپنے پڑھنے والوں میں پھیلتا ہے اور اسی بنیاد پہ شاعری قبول عام کا درجہ حاصل کرتی ہے ۔
۱۹۴۷ء سے قبل اور بعد کی شاعری کے نمایاں فرق پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ "۴۷ء سے پہلے کی اور موجودہ شاعری میں ایک نمایاں فرق موجود ہے ۔ میرے خیال میں ہر نصف صدی کے بعد بلکہ بسا اوقات اس سے بھی کم مدت میں ادب میں ایک نمایاں تبدیلی ضرور ہوتی ہے اسی لئے ۱۹۴۷ء سے پہلے اور بعد کی شاعری میں ایک نمایاں فرق موجود ہے اور ایک گہرا ربط بھی ہے ۔ یہ نمایاں فرق ان لوگوں کی شاعری میں ہے ، جو شاعری کی اور خصوصاً غزل کی ایک مسلسل روایت سے شعوری یا غیر شعوری طور پر بہت دور ہٹ گئے ہیں اور گہرا ربط ان لوگوں کی شاعری میں ہے ۔ جنہوں نے اردو غزل کے فطری ارتقاء میں مثبت حصہ لیا ہے ۔ اطہر نفیس نے ان لوگوں پر اعتراض کیا جو خود کو منفرد کہلوانے کے شوق میں نامانوس زبان اور مضحکہ خیز تشبیہوں اور استعاروں سے کام لیتے ہیں دراصل انفرادیت الفاظ کے الٹ پھیر یا نت نئی علامتوں کے استعمال سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ شاعرانہ تجربے کی صداقت سے پیدا ہوتی ہے اچھی شاعری بقول میر خوش سلیقگی کے ساتھ جگر خون کرنے کا کام ہے ۔"
کیا شاعری اظہار جرأت کا بہترین ذریعہ ہے ؟"
میرے اس سوال کے جواب میں انہوں نے کہا "میں شاعری کے بارے میں پیچیدہ خیالات بالکل نہیں رکھتا ۔ ہاں میرے نزدیک شاعری اظہار ذات کا بہترین ذریعہ ہے

سخن در تذکرہ شعراء — **اظہر نفیس**

اور ہر شاعر حسبِ توفیق اظہار ذات ہی کے لئے شعر کہتا ہے۔ اب یہ اپنے اپنے سلیقے کی بات ہے کہ کون کس طرح اپنی کیفیات اور اپنے اندر چھپے ہوئے روحانی کرب کو اظہار میں لاتا ہے۔ ایک بات اور سنتی چلئے اور وہ یہ کہ یا تو کوئی شاعر۔ شاعر ہوتا ہے۔ یا نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ میں "ناشاعروں" کے بارے میں یہ باتیں نہیں کہہ رہا ہوں میری مراد تو اُن زندہ لوگوں سے ہے جو شاعری کو اپنی تقدیر بنا چکے ہیں۔ اور اس سلسلے میں میرا منشور میرے اس شعر سے سمجھ لیجئے۔

ع لفظ گونگے ہیں انہیں گویائی دینے کیلئے
زندگی کے سچے لمحوں میں غزل کہتا ہوں میں

یہی وجہ ہے کہ میرا سرمایہ شعری اوروں کے مقابلے میں کم ہے۔ یعنی میں تھوک کے حساب سے غزلیں نہیں کہتا۔

شاعری کی کسی صنف سے میرا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ میں تمام اصناف کو اہمیت دیتا ہوں۔ بشرطیکہ ان اصناف کے ذریعے مجھ تک "شاعری" پہنچے۔ اگر شاعری نہیں پہنچے گی تو میں غزل سے بھی انکار کر دوں گا۔ جبکہ غزل میری محبوب صنف سخن ہے۔

میری غزلوں کا پہلا مجموعہ "کلام" کے نام سے مکتبہ فنون لاہور کی جانب سے شائع ہو چکا ہے۔ اور جب میں یہ سنتا ہوں کہ میرا مجموعہ بازار میں نہیں ملتا یعنی سب کا سب بک گیا تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔ ردلیسے ایک راز کی بات آپ کو بتا دوں کہ یہ مجموعہ نسبتاً کم تعداد میں چھپا تھا اور اس لئے کم چھپا تھا کہ جلد بک جائے۔ تاکہ اس کا دوسرا ایڈیشن چھاپا جا سکے مگر اب میں دوسرے ایڈیشن کے بجائے دوسرے مجموعے کی تیاری کر رہا ہوں۔ نئے دوست۔ یعنی وہ شعراء جو میرے بعد کی نسل میں شمار ہوتے ہیں۔ میرے لئے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ میں نئے لکھنے والوں کو بہت ذوق و شوق سے پڑھتا ہوں خصوصیت کے ساتھ مجھے اسد محمد خاں۔ عبیداللہ علیم نصیر ترابی۔ جمال احسانی۔ پروین شاکر۔ ثروت حسین۔ عدیم ہاشمی، خالد احمد۔ نجیب احمد اور امجد اسلام امجد۔ اور افتخار عارف سے بہت توقعات ہیں۔ ان شاعروں کے علاوہ اور

بھی کئی نوجوان دوست ہیں ۔ جو پسند ہیں ۔"

اطہر نفیس اپنے آپ کو بنیادی طور پر غزل کا شاعر سمجھتے ہیں، لیکن انہوں نے آزاد نظمیں بھی کہی ہیں ۔ ان کا کہنا ہے کہ آزاد نظم میں آہنگ ضروری ہے بہت سے لوگ آزاد نظم کے نام پر نثر لکھ لاتے ہیں ۔ جو شاعری تو شاعری اچھی نثر کا بھی نمونہ نہیں بن سکتی ۔ ان کے خیال میں ادب یا شعر کی پہلی اور ضروری شرط ابلاغ ہے ۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہر آدمی، خواہ وہ کسی بھی ذہنی سطح کا ہو آپ کی تخلیق کے تمام تر حسن کو سمجھ لے لیکن اگر چند ذہین اور پڑھے لکھے لوگ بھی آپ کے کلام کو سمجھنے سے قاصر رہیں ۔ تو پھر ایسے شاعروں کو شاعری ترک کر کے کوئی اور کام کرنا چاہیئے ۔"

اطہر بھائی ایک طویل عرصے سے روزنامہ جنگ سے وابستہ ہیں ۔ مشاعروں میں بہت کم شریک ہوتے ہیں اور جب کبھی پکڑے گئے تو اپنے اشعار اور اپنے ترنم سے بے کیف ماحول کو کیف آگیں بنا دیتے ہیں ۔ شاعر بہت اچھے ہیں اس لئے کہ انسان بھی بہت اچھے ہیں ۔ ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلیویژن سے ان کی کئی غزلیں گائی گئی ہیں اور مقبول ہوئیں ۔ خصوصاً مشہور گلوکارہ فریدہ خانم نے جو غزل گائی ۔

وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا اب اس کا حال سنائیں کیا
کوئی مہر نہیں کوئی قہر نہیں پھر سچا شعر سنائیں کیا

اس کے باوجود اطہر نفیس نے سچے شعر کہے ہیں ۔ اتنے سچے کہ جیسے غالبؔ یا میرؔ بول رہا ہے ۔

دل تو یوں کہتا ہے ۔ جیسے کوئی دکھ مجھ کو نہیں
شام ہوتے ہوتے جانے کیوں بکھر جاتا ہوں میں

کیوں مرے دیوار و در کرتے نہیں مجھ سے کلام
کتنے ارمانوں سے یارو اپنے گھر جاتا ہوں میں

کون سمجھے گا مری تنہائیوں کے کرب کو
ملنے جلنے والوں سے کترا کر گذر جاتا ہوں میں

٭

اطہر نفیس

عکسِ فن

کیوں اتنے دُکھوں سے گذرا وہ، کیوں اتنا میرا خیال کیا
جو حال کہ میرا ہونا تھا، وہ اس نے اپنا حال کیا

دُھوپ سر پر ہے تو پھر بے سائباں زندہ رہو
اے مرے اطہر نفیس اے جانِ جاں زندہ رہو

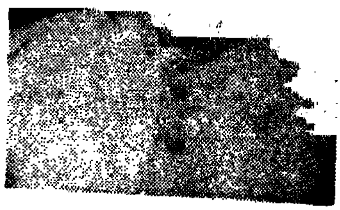
بہت چھوٹے ہیں مجھ سے میرے دُشمن
جو میرا دوست ہے مجھ سے بڑا ہے

کیا وقت پڑا ہے ترے آشفتہ سروں پر
اب دشت میں ملتے نہیں، ملتے ہیں گھروں پر

کیوں مرے دیوار و در کرتے نہیں مجھ سے کلام
کتنے ارمانوں سے یارو اپنے گھر جاتا ہوں میں

سیّد اقبال عظیم

مضراب
قابِ قوسین
مشرقی پاکستان میں اردو
سات ستارے



پیدائش ۱۹۱۳ء

مانا کہ زندگی سے ہمیں کچھ ملا نہیں ہے
اسی زندگی کو ہم نے بہت کچھ دیا بھی ہے

اقبال عظیم
۸.۱.۷۹

سید اقبال عظیم

۱۹۴۷ء کی تقسیم کے نتیجے میں اردو کے بیشتر ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں نے مغربی پاکستان کا رخ کیا۔ کیونکہ ایک حد تک تو انہیں اپنا کلچر یہاں ملنے کی توقع تھی۔ کچھ اہل ہمت مشرقی پاکستان (حالیہ بنگلہ دیش) چلے گئے۔ اقبال عظیم بھی ان ہی میں سے ایک تھے۔ یہ جولائی ۱۹۵۰ء کی بات ہے۔ فضل احمد کریم فضلی صاحب سابق مشرقی پاکستان میں ایجوکیشن سیکریٹری تھے۔ چنانچہ اقبال ڈھاکہ گورنمنٹ ڈگری کالج میں پہلے لکچرار ہوئے بعد میں شعبۂ اردو کے سربراہ مقرر ہوئے۔

۸ر جولائی ۱۹۱۳ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ یہ ان جیالوں کا شہر ہے جنہوں نے ۱۸۵۷ء میں بدیسی سامراج کے خلاف ملک گیر تحریک کا آغاز کیا تھا۔ اقبال کی تعلیم کا زمانہ لکھنؤ میں گذرا۔ بی اے کیا۔ اور ایم۔ اے کے لئے لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لیا لیکن حالات ناسازگار ہونے کی وجہ سے ایم۔اے کی تعلیم مکمل نہ کرسکے اور معلمی کی سند کے لئے ٹیچرز ٹریننگ کالج لکھنؤ میں داخلہ لیا۔ بعد میں اردو میں ایم۔اے آگرہ یونیورسٹی سے کیا۔ ۳۹ء میں معلم کی حیثیت سے حمید پور (باندھا کے قریب) میں ملازمت کرلی۔ اس سے قبل یکے بعد دیگرے والد اور والدہ کے انتقال کی وجہ سے بھائی بہنوں کی پرورش کی ذمہ داری نے اقبال کو ایک طویل جدوجہد کی آزمائش کی بھٹی سے گذارا اور یوں ان کی فکر اور سوچ میں نکھار پیدا ہوتا چلا گیا۔ اس زمانے میں اقبال نے ٹیوشنز بھی کیں۔ لکھنؤ

میں سلطان مالدیپ کے بچوں کو تعلیم دی۔ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے بھی وابستہ رہے۔ کچھ دنوں ہفتہ وار "ترقی" کی ادارتی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اس کے بعد فلمی تبصرے اور کہانیاں بھی لکھیں۔ ۱۹۵۲ء میں چاٹگام کالج میں تبادلہ ہو گیا۔ جہاں صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے ۱۹۵۰ء تک رہے۔ پھر اسی حیثیت سے ڈھاکہ کالج واپس آگئے۔ ۱۹۵۱ء میں ڈاکٹر عندلیب شادانی مرحوم کے مشورے پر ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے ڈھاکہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ تحقیقی مقالہ "بنگال میں اردو" دو سال میں مکمل کرنا تھا اور ضابطے کے مطابق ڈھاکہ میں ایک سال قیام کرنا ضروری تھا لیکن تبادلے کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو سکا۔ انہوں نے بنگلہ زبان کا اعلیٰ معیار کا امتحان بنگلہ اکیڈمی سے پاس کیا ہے اور مطالعہ کرتے رہے۔ ہندی کا چونکہ انہوں نے اعلیٰ زبان کا امتحان پاس کیا ہے۔ چنانچہ عبدالرحیم خان خاناں میرابائی اور رس رکھان کا مطالعہ خصوصی طور پر کیا۔

اقبال عظیم اور سودا میں قدر مشترک یہ ہے کہ دونوں نے اپنی شاعری کا آغاز ہجو سے کیا۔ یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ کالج کے ایک صاحب کی ہجو لکھی تھی جو اپنی حرکتوں کی بناء پر مسلسل مذاق کا نشانہ بنے رہتے تھے۔ اس کا کوئی شعر انہیں یاد نہیں لیکن ۱۹۳۶ء میں جو پہلی غزل کہہ کر بزم ادب لکھنؤ کے مشاعرے میں پڑھی اس کا ایک شعر یہ ہے۔

سعی کوششیں کر رہا ہوں ہنسنے کی
اشک آنکھوں میں آئے جاتے ہیں

ابتدا میں دو غزلیں قدیر لکھنوی کو دکھائی تھیں وہ ان کے والد مقبول عظیم عرش کے ہم عصروں میں سے تھے۔ انہوں نے مستقل شاگردی کسی کی اختیار نہیں کی۔ دو غزلیں صفی لکھنوی اور دو آرزو لکھنوی کو دکھائیں۔ ان بزرگوں نے بڑی حوصلہ افزائی کی لطف کی بات یہ ہے کہ ان کے بڑے بھائی جناب وقار عظیم مرحوم دلی میں ماہنامہ "آجکل" کے ایڈیٹر تھے۔ ایک بار انہوں نے شاعر اقبال عظیم کا کلام کہیں چھپا دیکھا تو غزل بھیجنے کے لئے انہیں سرکاری خط لکھا۔ یعنی بحیثیت ایڈیٹر کے۔

اقبال صاحب کو شعر کہنے کے لئے دماغی سکون اور نکھری ستھری فضا درکار ہوتی ہے لیکن کوئی حادثہ کوئی اچھوتی بات بھی شعر کہنے کی محرک بن جاتی ہے۔ شدتِ غم یا شدتِ مسرت میں وہ شعر نہیں کہہ سکتے۔ عموماً مغرب کے بعد یا طلوعِ آفتاب سے قبل ٹہلتے ہوئے شعر کہتے ہیں۔ ترنم غضب کا پایا ہے اور مشاعروں میں ترنم سے پڑھتے ہیں۔ وہ اس کے قائل ہیں کہ ہر سیاسی اور سماجی تحریک ادب کو بھی متاثر کرتی ہے۔ گو خود کبھی کسی سیاسی تحریک سے وابستہ نہیں رہے لیکن بنگال میں اردو سے متعلق ہر تحریک میں شریک رہے۔ میر غالب، مومن، مصحفی، داغ، آرزو اور حسرت کے معتقد ہیں۔ مرثیے میں انیس اور مزاح وطنز گوئی میں اکبر الہ آبادی کے فن کے معترف ہیں۔ جوش، حفیظ، فراق اور مجاز کے ساتھ یگانہ چنگیزی کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ اقبال کو اردو شاعری کی معراج سمجھتے ہیں۔ زمانۂ طالب علمی میں آلِ رضا سے متاثر تھے اور اُن کا پہلا مجموعہ "غزلیات نوائے رضا" انہیں کسی زمانے میں پورا پورا حفظ تھا۔ مرحوم آلِ رضا کی نازک مزاجی، جامہ زیبی، سنجیدہ ترنم نرم ونازک اشعار اور شہزادوں جیسی شخصیت آج بھی ان کی نگاہوں میں گھومتی ہے۔

اقبال عظیم نے نثر میں بھی بہت کچھ لکھا۔ ۱۹۵۴ء میں ان کی کتاب "مشرقی بنگال میں اردو" شائع ہوئی۔ جس میں وہاں کی دوسو سالہ لسانی اور ادبی ترقی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ۱۹۵۶ء میں انہوں نے حکیم ناطق لکھنوی کا مجموعہ مرتب کرکے تبصرے کے ساتھ شائع کرایا۔ ایک مختصر کتاب "سات ستارے" ہے۔ جس میں پاکستان کے سات معماروں کی سوانح آسان زبان میں درج ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین متعدد رسالوں میں شائع ہوئے۔ ڈھاکہ ریڈیو ان کے تقریباً ڈیڑھ سو پروگرام نشر کر چکا ہے۔ جن میں نظم ونثر دونوں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی ایک درجن نصابی کتابیں ان طلباء کے لئے لکھ چکے ہیں جن کی مادری زبان بنگلہ ہے۔

ان کی اہلیہ کا انتقال ۱۹۶۲ء میں ہوا۔ اقبال عظیم نے سخت محنت اور خودداری کی زندگی گزاری ہے۔ اہلیہ کے انتقال کے بعد ۶۳ء میں ان کی آنکھیں "گلاکوما" (آنکھوں کا بلڈ پریشر) سے متاثر ہوئیں۔ اس صورتِ حال کے بعد اقبال مطالعے کی

لذت سے محروم ہو گئے ۔ لیکن کتابیں دوسروں سے پڑھوا کر سنتے ہیں اور لکھنے کے لئے بھی دوسروں کی خدمات حاصل کرنا پڑتی ہیں ۔ لیکن کہتے ہیں کہ

مجھے ملال نہیں اپنی بے نگاہی کا
جو دیدہ ور ہیں انہیں بھی نظر نہیں آتا

مارچ ۱۹۷۵ء میں ان کے کلام کا مجموعہ "مضراب" کراچی سے شائع ہوا ان کا نعتیہ کلام "قاب قوسین" جون ۱۹۷۷ء میں کراچی سے شائع ہوا ۔ اپنے اشعار میں انہیں یہ شعر بہت پسند ہے ۔

پرسش حال کی فرصت تمہیں ممکن ہے نہ ہو
پرسش حال طبیعت کو گوارا بھی نہیں

ایک غیر معروف شاعر خلش کلکتوی کا یہ شعر بھی انہیں بہت پسند ہے ۔

شکوہ اپنوں سے کیا جاتا ہے غیروں سے نہیں
آپ کہہ دیں تو کبھی آپ سے شکوہ نہ کریں

سیّد اقبال عظیم

عکسِ فن

ظلم سے ہم ڈر گئے یہ تم سے کس نے کہہ دیا
ظلم قانوناً روا ہو جائے تو ہم کیا کریں

تم نے خود نور کا ظلمت سے کیا ہے سودا
کر کے توہینِ سحر، شام کو الزام نہ دو!

نظریں بدل گئیں تو کچھ ایسا غم نہ تھا
ذہنوں کے زاویے بھی بدلتے چلے گئے

زخموں پہ تا کہ اوروں کی نظریں نہ پڑ سکیں
زخمی بدن سلیقے سے کفنا دیا گیا

ہو تو رہی ہیں کوششیں آرائشِ چمن!
لیکن چمن غریب میں اب کچھ رہا بھی ہے

بارہا اقبال عزمِ جستجو کے سامنے
حادثاتِ زندگی کو سر جھکا لینا پڑا

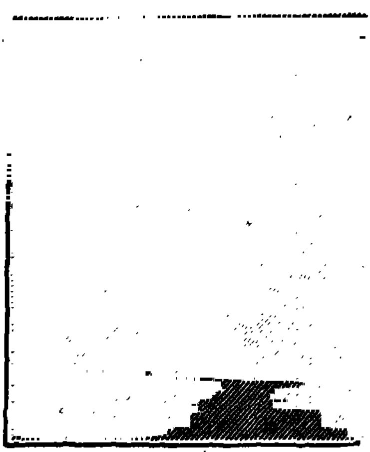
تمہارے بعد چراغوں کا کام ہی کیا تھا
نہ تم ہی لوٹ کے آئے نہ پھر چراغ جلے

انجم اعظمی



لہو کے چراغ
چہرہ

پیدائش سنہ ۱۹۳۱ء



ساحر لدھیانوی کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ "تلخیاں" میرے ہاتھ میں تھا میری دوست امینہ نے دیکھا تو پوچھ بیٹھی۔

"تم جانتی ہو ساحر کا اصلی نام کیا ہے؟"

"اصلی سے کیا مراد ہے؟" میں نے بجائے جواب دینے کے سوال کر ڈالا۔

"یہ کہ ساحر تو قلمی نام ہے۔ ویسے ان کا نام عبدالحئی ہے۔" حیرت کا ایک پہاڑ گویا مجھ پر ٹوٹ پڑا۔

"کیا واقعی؟"

"ہوں" وہ بے پرواہی سے بولی اور چیونگم چبانے لگی۔ یہ ۱۹۶۵ء کی بات ہے پھر دس سال بعد پھر اسی قسم کی حیرت کا مجھے سامنا کرنا پڑا۔ جب انجم اعظمی نے یہ انکشاف کیا کہ ان کا نام مشتاق احمد عثمانی ہے اور قلمی نام انجم اعظمی ۔ ۲؍ جنوری ۱۹۳۱ء کو بمقام اعظم گڑھ ضلع یوپی (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ اردو ادبیات میں ایم اے کیا۔ ڈاکٹر اسلوب احمد انصاری، رشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر خورشید الاسلام جیسے اساتذہ کی صحبت میسر آئی۔ شعر کب سے کہنے شروع کئے اس کا احساس ہی نہ ہوا۔ ذہن کی کیاری میں آپ ہی آپ یہ کونپل جب پھلواری بن گئی تو ایک انجانی سی خوشی محسوس ہوئی۔

انجم اعظمی نے نظمیں زیادہ تعداد میں لکھی ہیں۔ لیکن ابتدائی کلام کے مجموعے کا نام "لب و رخسار" ہے اور جیسا کہ نام سے ظاہر اس میں لب و رخسار کی باتیں ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۹۵۱ء میں علی گڑھ سے شائع ہوا۔ ۱۹۶۱ء میں نظموں اور غزلوں کا دوسرا مجموعہ "لہو کے چراغ" کراچی سے شائع ہوا۔

"میں نے غزل میں ان کے تجربات کے متعلق ان کی رائے پوچھی؟"

"فرمایا" سارے تجربے کبھی کامیاب نہیں ہوتے لیکن یوں سوچئے کہ جو آزاد نظم عبدالحلیم شرر

کے ہاں ایک ناکام تجربہ تھا وہ آج ہماری شاعری کا ایک عام لہجہ ہے۔ اسی طرح زندگی نئی نئی علامتیں ادب کے حوالے کرتی رہتی ہے۔ یہی علامتیں ادب کی روح ہوتے ہیں اور وہی ادب آفاقی ہوتا ہے جو لمحہ کی ابدیت کو پا لیتا ہے۔

انجم اعظمی آزاد نظم کو غزل اور دیگر اصناف سخن پر ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ بقول ان کے یہ صرف ایک صنف ہی نہیں ہے بلکہ ہماری شاعری کے لئے نئی زبان کی تلاش کے مترادف بھی ہے۔

انجم اعظمی نہ صرف شاعر اور نقاد ہیں۔ بلکہ ایک طویل عرصہ سے درس و تدریس کے شعبے سے بھی وابستہ ہیں۔ چنانچہ میں نے ان سے ہمارے موجودہ نصاب کے بارے میں رائے چاہی۔ جس پر انہوں نے فرمایا کہ اساتذہ ہی کا دوسرا نام تعلیم ہے۔ لیکن آپ نے نصاب کے بارے میں پوچھا ہے تو یہ جان لیجئے کہ ابھی اساتذہ کے علاوہ باقی تمام حضرات تعلیم کے بارے میں رائے دینے کا حق رکھتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے ملک میں آج تک اساتذہ سے پوچھنے کی زحمت گوارہ ہی نہ کی گئی کہ تعلیم کے معیار کا مطلب کیا ہے"۔

جدید شاعری کے بارے میں بھی اپنے رائے کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ جب شاعری جدید عہد کے انسان کے تصورات، احساسات اور افکار کو پیش کرتی ہے تو جدید کہلاتی ہے اس اجمال کی تفصیل میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن اتنا لازمی ہے کہ تشبیہات 'استعارات' علامات اور فضا میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ جدید شاعری اپنے لئے جس زبان کی تخلیق کرتی ہے وہ صنعتی شہر کے ترقی منفی و مثبت پہلوؤں کی غماز ہوتی ہے۔ اس لئے آج کی نظم غزل سے زیادہ روح عصر کی ترجمان ہے۔ کیونکہ اس کی زبان میں تبدیلی زیادہ آتی ہے اور آنے کے امکانات ہیں۔

جدید افسانے کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ جدید افسانے کی کوئی تکنیک نہیں ہے کیونکہ ٹیکنیک صرف سہارا ہوتی ہے۔ اصل چیز خود افسانہ اور اس کا تاثر ہوتا ہے۔ افسانہ اپنے تاثر کے اعتبار سے ہی جدید ہوتا ہے۔ اگر اس عہد کی روح کے منافی ہوگا تو جدید نہ ہوگا اس زمانے میں بے شمار ایسے افسانے لکھے گئے ہیں جن میں کوئی خاص ٹیکنیک استعمال نہیں ہوتی ہے۔ اس کے باوجود ان افسانوں کو جدید افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ آج افسانہ "نئی حقیقت نگاری" ہی سب سے اہم سمجھی جاتی ہے۔ کردار کرداروں کا عمل اور ان کی انفرادیت اسی سے افسانہ بڑا معیار

یا معمولی بن جاتا ہے۔

"آج کا تنقیدی ادب آپ کے خیال میں معیاری ہے؟ تنقید برائے تنقید ہونا چاہیے۔ یا تنقید برائے ادب؟"

انجم اعظمی نے جواب دیا۔ ارسطو، کالرج، آرنلڈ، ایلیٹ، حالی، شبلی، مجنوں، فراق اور بہت سارے دوسرے نقادوں کو پڑھنے کے بعد بھی جی چاہتا ہے کہ ادب کے بارے میں بے شمار باتیں کہی جائیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک کی عظمت مسلّم لیکن ادب کی رفتار تو اسی وقت قائم رہے گی جب ہماری فکریں ہمارا ساتھ دیتی رہیں۔ میرے خیال میں جدید تنقید نے اسی طرح جنم لیا۔ ہمارے عہد میں ادب کے بارے میں خیالات بدلتے ہیں اور مزید بدلیں گے۔ آج صرف اتنا کہہ دینے سے کام نہیں چلے گا کہ ادب اور زندگی کا رشتہ بہت گہرا ہے لیکن اس رشتے کی ساری لطافتوں کا ذکر نہ ہو تو ادب کی سرجھ بوجھ پیدا نہ ہوگی۔ ہمیں زندگی سے گہرے رشتے کے باوجود اس وحدت کا تجزیہ کرنا ہوگا جس کا نام ادب ہے۔ وہ حسن ہے تو حسن کے معنی بتانے ہوں گے۔ وہ جذبہ ہے تو کس سطح پہ پہنچ کر ادب بنا ہے اور اگر فکر ہے تو فلسفہ سے الگ ہو کر ادب کیسے تخلیق ہو گیا وغیرہ وغیرہ۔ انہی بحثوں میں جدید تصورات اور نظریات کو شامل کر کے آج کی تنقید ہمیں ادب سمجھنے اور تخلیق کرنے میں مدد دے سکتی ہے اور دے رہی ہے۔"

۱۹۷۵ء میں انجم اعظمی کا نیا مجموعۂ کلام "چہرہ" شائع ہوا۔ اس میں ۱۹۶۱ء سے لے کر ۱۹۷۵ء تک کی تخلیقات شامل ہیں۔ اس مجموعے میں پروفیسر مجتبیٰ حسین صدر شعبہ اردو جامعہ بلوچستان لکھتے ہیں کہ "انجم نے شاعری کو کھیل نہیں بنایا کیونکہ کھیل والی شاعری دو چار برس سے زیادہ نہیں چلتی۔ انجم نے تو ایک طویل سفر طے کیا ہے۔ شاعری کا بھی اور ذات کی آگہی کا بھی وہ ایک طویل سفر طے کر کے گاؤں سے شہر تک پہنچے ہیں۔ تاریخی ارتقاء کا یہ شعور ان کی شاعری کو مسخرگی سے بچا کر وہاں پہنچا دیتا ہے جہاں ہوٹل ہوں، فٹ پاتھ ہوں۔ بینک ہوں، جسم ہوں یا دھواں دیتی ہوئی چمنیاں ہوں یہ سب ایک سوال بن جاتی ہیں کہ آدمی کو عقائد اور رسوم معاشی بے انصافی اور اجارہ داری کی بیکری سے نکلے ہوئے کیک کی طرح کب تک تقسیم کیا جائے گا؟ اور ان سوالوں کا جواب بلاشبہ انجم اعظمی کی شاعری میں ہمیں ملتا ہے۔"

☆

انجم اعظمی

عکسِ فن

سر میں سودا سہی، سر پھوڑنے اب جاؤں کہاں
اس خرابے میں جہاں کوئی بھی دیوار نہیں

دل ہے ویراں، آنکھ میں انجم
ایک مدت سے کم ہے آب بہت

گریباں چاک پھرتی ہے ہوس بھی
ہوس کی تشنگی بھی کم نہیں ہے

وہ خوشی پائی ہے ہم نے جس کا یہ انداز ہے
اک سکوں دل میں رہے اور غم سے سارا گھر جلے

سپردگی میں کہاں جسم و جاں کی ہے تقسیم
جو وصل سے ہو گریزاں تو عشق بھی نہ کرو

کیوں مبتلائے غم ہو بھلا بے سبب کوئی
اے آدمی کی ذات خوشی ہے تو رقص کر

عالم عالم اعظمی صاحب کا افسانہ سنا
جاننے والے انہیں ہر بزم میں ڈھونڈا کیے

ابنِ انشا



چاند نگر
اس بستی کے اک کوچے میں
چینی نظمیں

پیدائش ۱۹۲۷ء
وفات ۱۹۷۸ء

ابیات

کل چودھویں کی رات تھی، شب بھر رہا چرچا ترا
کچھ نے کہا یہ چاند ہے، کچھ نے کہا چہرا ترا
ہم بھی وہیں موجود تھے، ہم سے بھی سب پوچھا کیے
ہم ہنس دیے، ہم چپ رہے، منظور تھا پردا ترا

اس شہر میں کس سے ملیں، ہم سے تو چھوٹیں محفلیں
ہر شخص تیرا نام لے، ہر شخص دیوانا ترا!
کوچے کو تیرے چھوڑ کر، جوگی ہی بن جائیں مگر
جنگل ترے، پربت ترے، بستی تری، صحرا ترا

...

اے بے دریغ و بے اماں، ہم نے کبھی کی ہے فغاں؟
ہم کو تری وحشت سہی، ہم کو سہی سودا ترا
ہم پر یہ سختی کی نظر؟ ہم ہیں فقیرِ رہگزر
[illegible] ترا، [illegible] دامن کبھی تھاما ترا

[illegible] شعر کے ابیات سے شہرہ ہوا [illegible] ترا
[illegible] سننی ہو تو چل، کہتا ہے کیا اچھی غزل
[illegible]

ابنِ انشا

ابن انشاء

نام ۰۰۰؛

"والدین نے شیر محمد تجویز کیا تھا۔ لیکن ہم نے عمر کے دسویں گیارھویں برس میں "ابن انشا" اختیار کر لیا" اور اسی نام سے ہمیشہ لکھتے رہے۔ مزید وضاحت یہ کہ اس نام کی وجہ تسمیہ کچھ نہیں اور نہ ہی سید انشاء اللہ خاں انشا سے کسی طرح کی نسبت ہے۔ وطن مالوف ضلع جالندھر ہے جہاں ۱۹۲۷ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم لدھیانہ، لاہور اور کراچی میں حاصل کی ۱۹۴۷ء کے مہاجرین کے سیلاب میں پاکستان آئے ۱۹۴۹ء سے کراچی میں مقیم تھے۔ ۱۹۵۳ء میں کراچی ہی سے ایم اے کیا۔ اپنی شگفتہ نثر کی وجہ سے انہوں نے مزاح نگاروں میں ایک لافانی مقام حاصل کر لیا۔ لیکن بقول ان کے اصل فن تو ان کا شاعری ہی تھا۔ گھر کا ماحول ایسا نہ تھا جو پشت پناہی کرتا اور ان کی ادبی صلاحیتوں کو جلا ملتی لیکن چونکہ خداداد صلاحیتیں قدرت نے طبیعت میں بدرجہ اتم رکھی تھیں۔ لہذا بہت کم عمری سے ہی لکھنا شروع کر دیا۔ اور بغیر کسی استاد کے تعاون سے ہی اپنی منزل کا خود تعین کیا اور کامیابی کی راہیں تلاش کر لیں۔

ابن انشا کو قدیم ادیب کے مطالعے کا ابتدا ہی سے شوق تھا۔ چنانچہ میر امن، محمد حسین آزاد، میر تقی میر، نظیر، رتن ناتھ سرشار اور بابائے اردو مولوی عبدالحق کا بغور مطالعہ کیا اور انہی کی تحریروں سے متاثر بھی ہوئے۔ مولوی عبدالحق کو اپنا استاد مانتے تھے

ان کا مندرجہ ذیل شعر ان کے اس تاثر کی توضیح کرتا ہے جو انہوں نے مندرجہ بالا اساتذہ سے قبول کیا۔

سیدھے دل کو آن دلوچیں میٹھی باتیں سندر بول
میرؔ، نظیرؔ، کبیرؔ اور انشاؔ سارا ایک گھرانا ہے

ابن انشا کی شاعری پر ہندی کا اثر بہت زیادہ ہے۔ ہندی زبان و ادب کا انہوں نے بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا اور آل انڈیا ریڈیو میں اپنی ہندی مہارت کی وجہ سے ہی ملازمت بھی کی۔ گو کہ فارسی بھی پڑھی اور شد بد بعض اور زبانوں میں بھی تھی۔ لیکن اردو سے دلی اور جذباتی تعلق نے ان کی تخلیقات کو اسی زبان سے وابستہ رکھا۔ اگرچہ انگریزی میں بھی انہوں نے کئی مضامین لکھے ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۳ء میں روزنامہ "ڈان" میں باقاعدہ ان کے مضامین اور کالم شائع ہوتے رہے ہیں۔ مگر یہ سب فرضی ناموں سے شائع ہوئے ہیں۔ مثلاً پہلا درویش، دمشقی، نانا فرنویسی وغیرہ وغیرہ۔ ۱۹۶۵ء کے آخر تک روزنامہ جنگ اور انجام میں ان کا قلمی نام "حاجی بابا" رہا ہے۔ اپنے اصل نام یعنی ابن انشاء کے نام سے انہوں نے ۵ر نومبر ۱۹۶۵ء سے لکھنا شروع کیا۔ "سویرا" لاہور میں ان کی ایک نظم "بغداد کی ایک رات" اور مزاحیہ مضمون "معاہدہ چھانگا مانگا" نے ان کی مزاح نگاری کا بھی لوہا اہل قلم سے منوالیا۔ دوسری زبانوں کے مضامین کا ترجمہ کرنے میں بھی انہیں کمال حاصل تھا۔ سب سے بلند ترجمہ انہوں نے ایک روسی ناول کا کیا جس کا اردو نام "سحر ہونے تک" ہے۔ بعد میں دوبارہ یہ "مجبور" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ۱۹۵۶ء میں ریڈگر ایلن کی پر اسرار کہانیوں کا ترجمہ "اندھا کنواں" او ہنری کی کہانیوں کو "لاکھوں کا شہر" اور شین بیگ کا ناول "مون از ڈاؤن" کا ترجمہ "شہر پناہ" کے نام سے کیا۔

ابن انشاء کے سفرنامے روزنامہ جنگ میں قسط وار شائع ہو کر قارئین سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان کا مشہور سفرنامہ "چلتے ہو تو چین کو چلئے" ۱۹۶۷ء میں منظر عام پر آیا۔ "چاند نگر" ان کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ ان کی نظم کا ایک شعر

؎ اس بستی کے اک کوچے میں اک انشاؔ نام کا دیوانہ
اک نار پہ جان کو ہار گیا، مشہور ہے اس کا افسانہ

سے ماخوذ ہے "اس بستی کے اک کوچے میں" تجویز کیا گیا۔ یہ مجموعے ہاتھوں ہاتھ بکے اور انشاء کی شاعری کتابوں سے نکل کر ریڈیو اور ٹیلیویژن تک پہنچ گئی۔ مرحوم گلوکار سید امانت علی مرحوم نے ان کا ایک گیت

انشاء جی اٹھو اب کوچ کرو اس شہر میں دل کو لگانا کیا

گایا تو گلی گلی اس گیت کی دھوم مچ گئی۔ اب نہ انشاء ہم میں ہیں نہ سید امانت علی۔ لیکن جب ٹی وی کے پردے پر امانت علی یہ گیت گانے آجاتے ہیں تو دلوں میں اپنی یادوں کے نشتر اتار جاتے ہیں۔

ان کی نظموں میں بغداد کی ایک رات، تنگھائی، مضافات، اعتماد، امن کا آخری دن وغیرہ بہت مشہور رہیں۔ یہ نظمیں ان کے مجموعے "چاند نگر" کے دور کی ہیں۔ بعد کی نظموں میں "دیوار گریہ" خاصی مشہور ہے۔ ان کی شاعری کا ایک بڑا حصہ جنگ کی تباہ کاریوں اور ویرانیوں سے متعلق ہے۔ جو کوریا کی لڑائی سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔

ابن انشاء کے کہنے کے مطابق انہیں چاند سے والہانہ شیفتگی تھی۔ ان کی بیشتر غزلوں میں چاند ایک سمبل کی صورت میں ملتا ہے۔ شاعری کے علاوہ نثر میں ان کے مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ "خمارِ گندم" کے نام سے لاہور سے شائع ہوا۔ ان کے دوسرے مجموعے "آوارہ گرد کی ڈائری" ابن بطوطہ کے تعاقب میں۔ دنیا گول ہے، اردو کی آخری کتاب، قصہ ایک کنوارے کا۔ (منظوم ترجمہ) شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

بقول انشاء شاعری کی اداسی اور نثر کا چنچل پن بظاہر دونوں رنگ متضاد معلوم ہوتے ہیں لیکن دونوں اصلی اور گہرے ہیں۔ ان کی شاعری دل کے معاملات سے بحث کرتی ہے اس میں کسک بھی بلا کی ہے لیکن نثر میں عام زندگی کی بشاشت اور مسکراہٹ غائب ہے۔

عملی زندگی میں ابن انشاء نیشنل بک سینٹر (قومی کتاب گھر) سے وابستہ تھے۔ اس ادارے کا مقصد لوگوں میں مطالعے کا فروغ اور کتابوں کی ترویج و ترقی ہے۔ مطالعاتی مواد کے

امور میں ابن انشاء پاکستان میں یونیسکو کے نمائندے بھی تھے اور بطور مشیر یونیسکو انہیں فلپائن، انڈونیشیا، افغانستان، ایران، لنکا، سنگاپور، جاپان، یورپ، مصر اور لبنان بھی بھیج چکی تھی۔ ۱۹۶۰ء میں پاکستان رائٹرز گلڈ کے مرکزی اعزازی خان بھی تھے۔
بچوں کی شاعری میں ابن انشاء کا خاص رنگ ہے بچوں کے لئے ان کی نظموں کا مجموعہ "بلو کا بستہ" ۱۹۵۸ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں چینی نظموں کا ایک ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔
اپنی زندگی اور شاعری کا فلسفہ انہوں نے "چاند نگر" کے دیباچے میں رقم کر دیا ہے۔ کہتے ہیں "انسانیت کا دھیلہ بھر جوہر میرے نزدیک دنیا بھر کی دولت پر بھاری ہے۔ دکھ اور آسودگی احتیاج اور فراغت جنگ اور امن زندگی کے بنیادی مسائل ہیں۔ جو شخص ان کا اثر قبول نہیں کر سکتا وہ اپنے زمین زاد بھائیوں سے مخلص نہیں ہو سکتا۔ ان معاملات میں غیر جانبداری غلط اور ناممکن ہے"۔
غزل میں ان کی رائے میں عہد حاضر کے نوجوان شعراء نے جن میں سے بعض زیادہ مشہور بھی نہیں ایسے سچے اور گہرے مضامین نکالے ہیں کہ قدما کے ہاں ان کی مثالیں نہیں ملتیں۔ بقول ان کے قدما کے ہاں بھرتی بہت ہے۔ جب کہ ہمارے آج کے بہت سے غزل گو میں جذبے کی صداقت جاری و ساری ہے۔ انشاء جی ہنس مکھ انسان تھے۔ خود بھی ہنستے تھے اور دوسروں کو بھی ہنساتے تھے۔ اپنی باتوں سے اپنی تحریروں سے جانے اس ہنستی صورت کو کس کی نظر کھا گئی کہ وہ کینسر جیسے موذی مرض کا شکار ہو گئے اور ۱۱ جنوری ۱۹۷۸ء کو لوگوں کو ہنسانے والا یہ شخص اپنے اصول کے خلاف روتا چھوڑ کر چلا گیا۔

٭

ابنِ انشاء

عکسِ فن

ساون بھادوں ساٹھ ہی دن ہیں پھر وہ رُت کی بات کہاں
اپنے اشک مسلسل برسیں، اپنی سی برسات کہاں

حُسن کے نام پہ یاد آئے سب منظر فیضؔ کی نظموں کے
وہی رنگِ حنا وہی بندِ قبا وہی پھُول کھلے پیراہن کے

دیدہ و دل نے درد کی اپنے بات بھی کی تو کس سے کی
وہ تو درد کا بانی ٹھہرا، وہ کیا درد بٹائے گا!

انشاؔ اب انہی اجنبیوں میں چین سے باقی عمر کٹے
جن کی خاطر بستی چھوڑی نام نہ لو ان پیاروں کا

اور تو کوئی بس نہ چلے گا ہجر میں درد کے ماروں کا
صُبح کا ہونا دوبھر کر دیں رستہ روک ستاروں کا

رات کے خواب سُنائیں کس کو رات کے خواب سہانے تھے
دُھندلے دُھندلے چہرے تھے پر سب جانے پہچانے تھے

ذوالفقار علی بخاری



راگ دریا
سرگزشت

پیدائش ۱۹۰۴ء
وفات ۱۹۷۵ء

دن کا آغاز نہ انجام جو یا رب جانے
وہ کسی رات کی پہچان ہے نہ پہچان سحر

بخاری
۲۶ نومبر

ذوالفقار علی بخاری

بخاری صاحب سے میں نے پوچھا۔ آپ نے شاعری کیوں شروع کی تو بولے:
"غلطی ہو گئی معاف فرمایئے۔"
"پہلی غلطی کب ہوئی؟" میں نے پوچھا۔ تو انہوں نے بتایا۔
"تیرہ چودہ سال کی عمر میں۔"
غرض بچپن کی ان معصوم غلطیوں کا نتیجہ ایک کہنہ مشق شاعر کی شکل میں ہمارے سامنے آیا۔ جنہیں ذوالفقار علی بخاری کہا جاتا ہے۔ وہ بخاری جو اپنے بھائی پطرس بخاری کے ساتھ مل کر بخاری برادران کہلاتے تھے۔ اور آل انڈیا ریڈیو اور پھر ریڈیو پاکستان کے قیام اور استحکام میں جن کا بڑا ہاتھ ہے۔
ذوالفقار علی بخاری ۱۹۰۴ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہاں حاصل کی اور اس کے بعد لاہور اور لندن جا کر اس کی تکمیل کی۔ آپ کے والد اسد اللہ شاہ بخاری بھی شاعر تھے۔ محمد حسین آزاد اور ارشد گورگانوی کے ہم عصر تھے۔ چار کم سو سال عمر پائی۔ ان کے نعتیہ کلام کا مجموعہ انیسویں صدی میں شائع ہو چکا تھا۔
بخاری صاحب نے شاعروں میں حسرت موہانی، ڈاکٹر اقبال، مرزا یاس یگانہ چنگیزی، نواب سائل، وحشت کلکتوی وغیرہ سے استفادہ کیا لیکن کسی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ عربی میں آپ نے مولانا عبدالعزیز میمن اور فارسی میں مولانا

شاداںؔ بلگرامی سے کسب علم کیا۔ اس لحاظ سے عندلیب شادانی اور کوکب شادانی کے استاد بھائی ہوئے۔ لیکن انہوں نے اپنے خاندانی نام میں کوئی ترمیم گوارا نہ کی اور ذوالفقار علی شادانی کے بجائے اپنے آپ کو ذوالفقار علی بخاری کہلوانا ہی پسند کیا۔

بخاری صاحب اور ان کے عظیم بھائی پطرس مرحوم نے زندگی بھر بہت کمایا اور کتابوں پر خرچ کیا۔ لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد ہجرت کے دوران ان کا جو سامان تلف ہوا اس میں ساری کتابیں بھی غائب ہوگئیں۔ اس کا صدمہ بخاری صاحب کو اتنا ہوا کہ اس کے بعد سے ہی ان کے بال سفید ہونا شروع ہو گئے۔

بخاری صاحب کو اردو شاعروں میں پانچ شاعر بہت پسند تھے۔ یعنی میرؔ، سوداؔ، غالبؔ اقبالؔ اور حسرتؔ۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان کے کلام پر جس استاد کا اثر زیادہ غالب ہے اسے انہوں نے کبھی یاد نہیں کیا میرا مطلب انیسؔ سے ہے غالباً بخاری صاحب نے انیسؔ کا بغور گہرا مطالعہ کیا ہے اور لاشعوری طور پر ان سے بے حد متاثر ہوئے ہیں۔

ترقی پسندی کے بارے میں ان کا نظریہ یہ تھا کہ جو شخص اپنے گرد و پیش سے باخبر ہو وہ سب سے زیادہ ترقی پسند ہے۔ اس سلسلے میں وہ اپنے دوست حضرت رئیس امروہوی کو اس دور کا سب سے بڑا ترقی پسند سمجھتے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر ترقی پسند ادب سے آپ کی مراد اشتراکی ادب ہے تو اس کے متعلق عرض ہے کہ ایسے ادب اور ادیبوں سے مجھے بڑی دلچسپی ہے۔ مگر

'ہر چہ آید بہ سر اولاد آدم بگذرد'

یا یوں کہئے کہ یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا۔

بخاری صاحب اس کے بھی قائل نہیں تھے کہ ادب میں جمود ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے اخبار 'جنگ' کی مثال دی اور کہا کہ مولانا ظفر علی خاں کے زمانے میں جو اخبار نکلتے تھے ان میں اور آج میں کس قدر فرق ہو چکا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ آج کل ڈائجسٹ قسم کے رسالوں کی جتنی اشاعت ہے اتنی کبھی مخزن، زمانہ، کہکشاں اور نیرنگ خیال کی مل کر بھی نہیں ہوئی۔ ان کا خیال تھا کہ جو لوگ جوانی سے گذر کر پیری میں قدم رکھ چکے ہیں

ان کے لئے ادب میں البتہ جمود آگیا ہے لیکن جو جوان اہل قلم ہیں ان کے نزدیک مردہ ادب میں اور جان پڑ گئی ہے۔

بخاری صاحب جب تک زندہ رہے جواں حوصلہ انسانوں کی طرح زندہ رہے۔ یہ ان کی زندگی کا ایک ایسا پہلو تھا۔ جو کبھی ان سے جدا نہیں ہوا۔ ریڈیو پاکستان کو ایسا ڈائرکٹر جنرل کبھی نہ ملا ہوگا۔ جسے یہ تک خبر رہتی ہو کہ آج فلاں نیوز ریڈر نے فلاں خبر نامے میں ایک لفظ کا تلفظ غلط کر دیا تھا اور خان صاحب نے "امین" میں "بہاگ" کا سُر لگا دیا تھا۔ کراچی میں نومبر ۱۹۶۷ء میں قائم ہوا تو بخاری صاحب ہی کی نگرانی میں ہوا وہ اس کے پہلے ڈائرکٹر جنرل تھے۔

نئی نسل کے شعراء اور ادیبوں کے لئے بخاری صاحب کا پیغام تھا کہ ان کے دل میں وطن کی محبت دھڑکنا چاہیے۔ خواہ یہ فریاد بن کے دھڑکے یا نغمۂ مسرت بن کر۔

بخاری صاحب کو کھانے میں ہر وہ چیز پسند تھی۔ جس میں گھی اور مرچیں کم ہوں۔ پُر تکلف غذا کھا کر ندامت محسوس کرتے تھے اور اپنے آپ کو مجرم سمجھتے تھے وہ کبھی یہ نہیں بھولتے تھے جس ضلع میں وہ رہتے ہیں۔ وہاں اب بھی ایسے لوگ ہیں جو نان شبینہ کے محتاج ہیں۔

بخاری صاحب نے مجھے بھی مشورہ دیا تھا کہ آپ اپنے بچوں کو سادہ غذا کی عادت ڈالئے اور اس قسم کا کھانا پکایئے جس سے باورچی خانے میں کم سے کم وقت گزارنا پڑے انہوں نے کہا نئی نسل کی خواتین کے پاس اتنا وقت نہیں ہے جتنا ان کی نانیوں اور دادیوں کے پاس ہوتا تھا۔ آج کی مصروفیات بہت زیادہ ہیں۔

بخاری صاحب روز بلا ناغہ ورزش کرتے تھے اور صبح چار بجے سے چھ بجے تک مطالعہ کرتے تھے۔

وہ شام کو ٹینس بھی بلا ناغہ کھیلتے تھے۔ ان کا کوئی مجموعہ کلام کتابی شکل میں نہیں لیکن "راگ دریا" کے نام سے موسیقی پر ایک کتاب لکھی تھی۔ موسیقی سے انہیں انتہا درجے

کا شغف تھا۔ ابھی حال ہی میں (اپریل ۱۹۷۹ء کے اوائل میں) جب میری ملاقات ان کی بیٹی محترمہ زریں سے ہوئی تو میں نے ان کے پاس راگوں کی کمپوزیشن کے بارے میں بخاری صاحب کے ہاتھ کی لکھا ہوا مسودہ دیکھا جس میں موسیقی کے تمام راگوں کی تفصیلات موجود ہیں۔ یہ کتاب ان کی زندگی میں نہ ہی کاش کہ اب کسی طرح شائع ہو جاتی۔

"سرگذشت" کے عنوان سے بخاری صاحب نے اپنی آپ بیتی روزنامہ "حریت" کراچی میں ایک عرصے تک لکھتے رہے۔ بعد میں اسی عنوان سے یہ کتابی شکل میں شائع ہوئی۔ ۱۲ جولائی ۱۹۷۵ء کو بخاری صاحب کا انتقال ۷۶ سال کی عمر میں ہوا۔ جناب مرزا ظفر الحسن نے سہ ماہی جریدہ "غالب" کا ذوالفقار علی بخاری نمبر اسی سال شائع کیا اس کے اداریئے میں مرزا ظفر الحسن بخاری صاحب کے بارے میں کہتے ہیں کہ۔

"بات صرف اتنی نہیں ہے کہ موصوف کی آواز مائیکروفون کے لئے بہت خوبصورت اور موزوں تھی۔ بہتوں کی آواز بہتر بھی تھی۔ اصل ہنر اس آواز کا استعمال ہے۔ فکر و خیال کو ان دیکھے اور سینکڑوں ہزاروں میل کے رقبے میں پھیلے ہوئے سامعین تک آواز کے سہارے پہنچایا جاتا ہے۔ ترسیل کا یہ عمل اس لحاظ سے ایک جوا ہے کہ ذرا کوئی چوک ہوئی اور سننے والے نے کھٹ سے اپنا ریڈیو بند کر دیا یا اسٹیشن بدل دیا۔ لیکن ان کی آواز کا جادو۔ اندازِ بیان کا سحر۔ ہر ایک سن کر کہتا ہے بخاری ہے۔ بخاری ہے۔"

اور یہ حقیقت بھی ہے کہ ذوالفقار علی بخاری جب ریڈیو یا ٹی وی پر مرثیہ انیس پڑھتے تھے تو آنکھوں کے سامنے لفظ لفظ کی تصویر کھینچ دیتے تھے۔ یہی حال مشاعروں کا تھا۔ وہ کیفی اعظمی کی تعریف کرتے تھے کہ جب اسٹیج پر آتا ہے تو چھا جاتا ہے لیکن خود بخاری صاحب تحت اللفظ پڑھتے تھے اور مشاعرہ لوٹ لیتے تھے۔ اب ان کا سا اندازِ بیان کون لے کر آئے گا۔۔۔!

ذوالفقار علی بخاریؔ

عکسِ فن

بہت کچھ پاؤ گے دنیا میں پیارے
محبت پاؤ گے لیکن ہمیں میں

بخاریؔ کی تڑپ حافظؔ کی مستی
تمہارے نغمۂ وجد آفریں میں

نہ ہوگا اس سے زیادہ جہاں میں اندھیرا
کہ دوست دوست کو دیکھے مگر نہ پہچانے

کسی کا ہو کے جینا چاہتا ہوں
محبت میں فنا ہونا چاہتا ہوں

راحتوں میں ہمیں مزا نہ ملا
دل کو اب درد آشنا کیجئے

جس کا بخشا ہوا غم ہے مجھے راحت سے سوا
مرے غم خانے میں وہ شخص بھی آیا ہوتا

اس جہاں میں تو جہنّم بھی ہے جنّت بھی
کوئی فردوس یہاں بھی تو بنایا ہوتا

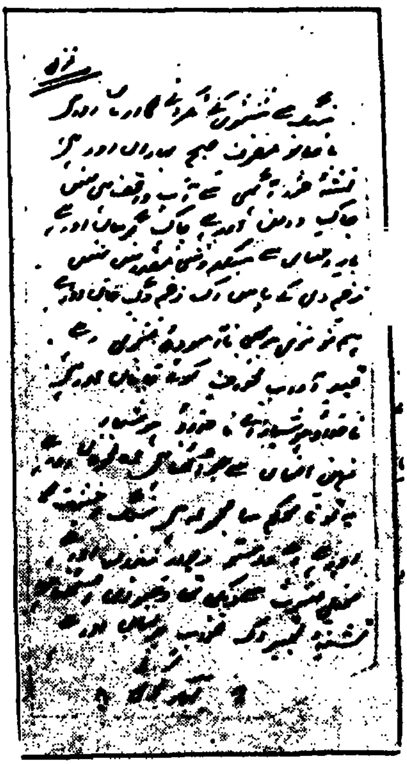
یہ زندگی ہے کہ بے اختیار جیتا ہوں
یہ زندگی ہے تو پھر اختیار کیا ہوگا

بہار کوٹی

ذات و کائنات



پیدائش ۱۹۰۵ء
وفات ۱۹۷۱ء



محبوب خدا لکھ کر سینے سے لگا لیتا
جب درد سے جھنجھلا کر دشوار نظر آتے

بہار کوٹی

بہارؔ کوٹی

اجمیر شریف سے جن لوگوں کا رابطہ رہا ہے وہ بہارؔ کوٹی سے ضرور واقف ہیں۔ وہ کمشنر کے دفتر میں ایک ذمہ دار عہدے پہ فائز تھے اور زائرین کو ہر قسم کی سہولت پہنچانے میں پیش پیش رہا کرتے تھے۔ راجستھان جیسی سنگلاخ زمین میں شعر و ادب کا پودا لگا کر اس کی آبیاری کرنا اور اجمیر کو ایک اہم شہری مرکز بنا دینے کا اعزاز بھی انہیں حاصل رہا ہے۔ وہ وہاں معنیؔ اجمیری اور آثمؔ اجمیری کے ہم عصر تھے اور انجمن فروغ ادب اجمیر کے ذریعہ انہوں نے اکیس برس ادب کی خدمت کی۔ ہر سال وہ ایک شاندار آل انڈیا مشاعرہ کرتے تھے، جس کے ذریعہ اس عہد کے صف اول کے تمام ہی شاعروں کو اجمیر سے متعارف کیا گیا۔ انجمن فروغ ادب سے جو دوسرے لوگ وابستہ تھے۔ ان میں اثرؔ جلیلی، افقؔ اجمیری، وقارؔ صدیقی، قابلؔ اجمیری برقؔ اجمیری جذبیؔ نیازی اور مضطرؔ اجمیری قابل ذکر ہیں۔

بہارؔ کوٹی کا اصل نام محمود الحسن خاں ہے قصبہ کوٹ ضلع فتح پور ہسوہ (یوپی) میں ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ خاندانی پیشہ زمینداری تھا۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق ابتدا میں گھر پہ تعلیم ہوئی۔ اردو، ہندی اور فارسی پڑھائی گئی۔ پھر اسکول اور کالج میں انگریزی تعلیم بھی حاصل کی۔

بہارؔ کوٹی نے ۱۵ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن پانچ سال بعد ۱۹۲۸ء میں ادبی دنیا لاہور کے ذریعہ پہلی مرتبہ ان کا کلام منظر عام پہ آیا۔ اس کے بعد نگار لکھنؤ زمانہ کانپور

۔عالمگیر' لاہور، اور شاعر' آگرہ میں ان کی تخلیقات چھپتی رہیں، شعر و ادب کے علاوہ علمی اور تاریخی مضامین بھی لکھتے تھے۔ کچھ افسانے بھی لکھے جو شاعر' میں شائع ہوئے۔ اس زمانے میں 'چاند' اور 'مادھوری' نامی دو ممتاز ہندی رسالے نکلتے تھے۔ ان میں بھی ان کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ ان کے افسانوں کے دو مجموعے رائل ایجوکیشنل بک ڈپو دہلی سے شائع ہوئے۔ ان میں 'گلگیر' تو ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں کی نذر ہو گیا۔ البتہ دوسرا مجموعہ 'خاکستر' اب تک دستیاب ہے۔

مولوی عبدالباری معنی اجمیری نے ایک کتاب "ہمارے خواجہ" لکھی تھی۔ بہار کوٹی نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا جو 'آور گریٹ خواجہ' (OUR GREAT KHWAJA) کے نام سے شائع ہو کر بڑی مقبول ہوئی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران سرکاری طور پر اردو، ہندی اور انگریزی میں وار (WAR) پبلسٹی کے کتابچے لکھنے کا کام بھی ان کے سپرد کیا گیا۔ یہ کتابچے ہندوستان گیر پیمانے پر شائع ہوئے۔

بہار کوٹی شروع سے گہرے مطالعے کے عادی تھے۔ انہوں نے اردو کے تمام اساتذہ اور اہم معاصرین کو پڑھا اور فارسی میں عرفی۔ بیدل۔ نظیری، سعدی اور حافظ سے پوری طرح استفادہ کیا تھا۔ زندگی بھر ان کے مطالعے کا سلسلہ جاری رہا۔

شاعری میں آپ نے علامہ عیش فیروز پوری مرحوم کے آگے زانوے ادب تہہ کیا۔ یہ اس قسم کے استادوں میں تھے جو شاگردوں سے جان توڑ محنت لیا کرتے تھے۔ اور ان کی مشق بڑھانے کے لئے فی البدیہہ مشاعرے کرایا کرتے تھے یعنی ایک مصرعہ دے دیا اور پندرہ منٹ کا وقت دے کر سب سے پرچے لے لئے جاتے۔ تین سال تک آپ مسلسل ان امتحانوں میں شامل ہوتے رہے۔ اور ۱۹ سال کی عمر میں ہی استاد نے انہیں فارغ التحصیل فن قرار دے دیا۔

بہار کوٹی کی طبیعت میں استغنا لا پرواہی کی حد تک پایا جاتا تھا۔ چنانچہ کبھی اپنے کلام کی حفاظت نہیں کی اور تقسیم کے ہنگاموں میں بیشتر کلام ضائع ہو گیا۔ پھر بھی اتنی غزلیں موجود ہیں کہ اس سے دو مجموعے ترتیب دیئے جا سکیں۔ ان کی وفات کے بعد ان کے

صاحبزادے محمد اظہار الاسلام نے ان کے کلام کا مجموعہ 'نفات وکائنات' کے نام سے ۱۹۸۰ء میں شائع کیا۔ جس میں پروفیسر منظور حسین شور، احسان دانش، پروفیسر ابوالخیر کشفی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے بہار کی شاعری پر تبصرہ کیا ہے۔

ان کے شاگرد برصغیر کے مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور بعض شاگرد تو ادب میں ممتاز مقام حاصل کر چکے ہیں۔ لیکن دوسرے استادوں کی طرح بہار کوٹی کو نام لے کر اپنے مشہور شاگردوں کا ذکر کرنے کا شوق نہیں تھا۔ بلکہ ان کی طبیعت کی انکساری تو لفظ 'شاگرد' یا خوشہ چین استعمال کرنے کے بجائے 'شعری وابستگان' پر اکتفا کرتی تھی۔ انھوں نے شاعری کو ذاتی منفعت کا ذریعہ کبھی نہیں بنایا اور نہ ہی اپنے شاگردوں کو اس کی اجازت دی کہ وہ استاد کے لئے مشاعرہ کرکے یا کوئی کتاب شائع کرکے رقم اکٹھی کریں۔

تقسیم سے پہلے ان کے فن کے بارے میں مختلف رسائل میں مضامین شائع ہوئے۔ ۱۹۴۲ء میں شاعر آگرہ نے اس عہد کے اساتذہ کا تذکرہ شائع کیا تو مشاہیر کی اس صف میں بہار کوٹی بھی موجود تھے۔ لیکن یہ مقام حاصل کرنے کے بعد تقسیم کے بعد جب وہ کراچی پہنچے تو امتداد زمانہ کے شکار ہوگئے۔ حد یہ کہ بعض احباب نے انہیں پہچاننے سے بھی تکلف برتا۔

بہار کوٹی ہمیشہ عملی انسان رہے اور محنت کے بل بوتے پر کبھی مفلوک الحال کے شکار نہیں رہے۔ وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے اور ہر حال میں خوش رہتے تھے۔ ان کے نزدیک ادب کی صرف قسمیں تھیں، معیاری اور غیر معیاری ان کے خیال میں وہ سارا ادب جو اصولوں پر پورا نہ اترے اور جو قواعد زبان کی رو سے صحیح نہ ہو غیر معیاری ہے۔ زبان، محاورہ اور روزمرہ کی غلطیوں کے علاوہ ادب میں سفلی جذبات کے اظہار کو بھی وہ بڑی گھٹیا بات تصور کرتے تھے۔

بہار کوٹی کراچی ایرو کلب میں ملازم تھے اور لیاقت آباد میں قیام تھا۔ مقامی مشاعروں میں وہ بہت کم شرکت کرتے تھے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ دور حاضر کے مشاعرے ان کے نزدیک صرف تفریح کا ذریعہ بن کر رہ گئے تھے۔ بہار کا انتقال ۱۹۷۱ء میں ہوا۔

بہار کوٹی

عکسِ فن

تڑپا کچھ اس طرح سے دلِ غم زدہ بہار
بھرپور ظلمتوں میں نشانِ سحر ملا

کیا زندگی اگر نہ تمنا کوئی رہے
پی بھی تو اس قدر کہ غمِ تشنگی رہے

جنوں پر ہنسنے والو اس جنوں کی
بڑی قیمت ادا کرنی پڑی ہے

عشق کیفِ بے کراں کا نام ہے
اس سے پہلے زندگی الزام ہے

کسی سے اہلِ جنوں کے سوا نہ ٹوٹ سکے
وہ سومنات جو ذہنِ بشر میں ہوتے ہیں

وہ عشق ہی نہیں جو نویدِ وصال دے
یہ وقت آ بھی جائے تو حکمت سے ٹال دے

ہر نظر پُر التفات و پُر خلوص
اب سنبھلنا حوصلے کا کام ہے

بہزاد لکھنوی

- ثنائے حبیب
- کیف وسرود
- نعت حضور
- ذکر حضور
- نقش بہزاد
- نغمات بہزاد
- نغمۂ نور
- موج نور
- چراغ طور
- وجد وحال
- نغمہ روح
- کرم بالائے کرم
- فیضان حرم
- کفر وایمان



DECEMBER 26
1967
Tuesday

پیدائش سنہ ۱۹۰۱ء
وفات سنہ ۱۹۷۴ء

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

بہزاد لکھنوی

غالباً ۴۸ء یا ۴۹ء کا واقعہ ہے، بمبئی میں صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ کے میدان میں آل انڈیا مشاعرہ ہو رہا تھا۔ مشاعرہ ٹکٹ سے تھا اور چھ سات ہزار آدمیوں کا مجمع تھا۔ آل انڈیا پیمانے کے کوئی ڈیڑھ درجن شاعر تو بمبئی ہی میں موجود تھے۔ حسرت موہانی، فراق گورکھپوری اور آٹھ دس دوسرے چوٹی کے شاعر باہر سے آئے تھے لیکن مشاعرہ ٹھنڈا جا رہا تھا۔ بڑے بڑے دھانسو اور مشاعرہ لوٹ قسم کے شاعروں کو پکارا گیا۔ لیکن وہ اسٹیج پر بیٹھے ہوئے شعراء سے مروتاً اور اخلاقاً قسم کی داد حاصل کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکے۔ مجمع تو جیسے گونگے کا گڑ کھائے بیٹھا تھا۔ صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ کے پرنسپل اور انجمن ترقی اردو بمبئی کے نائب صدر سید شہاب الدین دیسنوی اناؤنسر تھے۔ انہوں نے یہ صورت حال دیکھ کر اعلان کیا۔

"اب جناب بہزاد لکھنوی سے التماس ہے کہ وہ اپنا کلام پیش کریں" بہزاد حسب معمول شیروانی کے بٹن کھلے ہوئے، گلے میں ایک دھجی بندھی جس میں انگوٹھا پڑا ہوا تھا۔ گویا روایتی دیوانوں کی طرح گریبان سے الجھتے مائیک پہ آئے اور بغیر کسی تمہید کے غزل شروع کر دی ؎

؎ اے جذبۂ دل گر میں چاہوں ہر چیز مقابل آ جائے
منزل کے لئے دو گام چلوں اور سامنے منزل آ جائے

مطلع پڑھنا تھا کہ مجمع لوٹ پوٹ ہوگیا۔ پوری غزل کے دوران یہی کیفیت رہی۔ ایک ایک شعر آٹھ آٹھ مرتبہ پڑھوایا گیا۔ اور پھر دوسری اور تیسری غزل تک نوبت پہنچ گئی۔ اسٹیج پر جو شعرا بیٹھے تھے ان میں شکیل بدایونی نے مجروح سلطان پوری سے کہا۔ "یا تو ہم روپیہ کما لیں یا یہ مقام حاصل کرلیں۔ دونوں باتیں ایک ساتھ ہونی ناممکن ہیں"۔
اس واقع کے گواہ آج بھی کراچی میں موجود ہیں۔

بہزاد ۱۹۰۱ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ سردار حسین خاں نام رکھا گیا تھا۔ والد کا نام سجاد حسین تھا۔ کلکتے سے انٹر کیا اور ریلوے میں ملازم ہوگئے۔ ۱۹۳۱ء میں ایک بزرگ نے انہیں سینے سے لگایا تو ان پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہوگئی۔ ہر وقت وحشت سوار رہتی تھی۔ بس شعر کہنے سے تسکین ملتی تھی۔ کیونکہ بہزاد فطری شاعر تھے۔ آٹھ سال کی عمر میں شاعری یا تک بندی شروع کردی تھی۔ چھپ کر کہتے تھے اور اپنے دوستوں کو سناتے تھے۔ کسی نے ماسٹر صاحب سے شکایت کردی۔ انہوں نے امتحان کے طور پر مصرعہ دیا۔
"خدا معلوم کب تک انتظارِ نامہ بر ہوگا"

تیسری جماعت کے بچے نے فوری طور پر اس پر مصرعہ لگا کر یوں شعر بنا دیا۔

اے سردار اب تو بیقراری بڑھتی جاتی ہے
خدا معلوم کب تک انتظارِ نامہ بر ہوگا

لکھنؤ میں شاعروں کی عجیب فضا تھی۔ ایک ایک رات میں دس دس مشاعرے ہوتے تھے نوجوان شعراء میں سراج، قدیر، منظر، گوہر، سحر اور آشفتہ تیزی سے ابھرے تھے۔ اساتذہ میں صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی، آرزو لکھنوی، آفتاب عالم لکھنوی، عبدالباری عاصی۔ افخر موہانی، حسرت موہانی اور اثر لکھنوی کے ڈنکے بج رہے تھے۔ ان مشاعروں میں شرکت کے لئے ضروری تھا کہ فن عروض سے واقفیت حاصل کی جائے۔ چنانچہ انہیں ایک عدد استاد کی ضرورت پڑی۔ استاد ذاکر لکھنوی آسانی سے ہاتھ لگ گئے۔ یہ مرثیے اور نوحے کہا کرتے تھے۔ بہزاد نے ان سے اصلاح لینا شروع کردی۔

بہزاد نے اساتذہ کے کلام کا مطالعہ نہیں کیا۔ عجیب بات ہے کہ یہی بات استاد

قمر جلالوی نے بھی کہی تھی۔ بہزاد صاحب کا کہنا تھا کہ اساتذہ کے کلام کا مطالعہ کرنے سے توارد کا اندیشہ رہتا ہے۔

بہزاد لکھنوی بڑے پرگو شاعر تھے۔ پہلا مجموعہ "نغمۂ نور" ۱۹۳۶ء میں ساقی بک ڈپو نے دلی سے شائع کیا تھا۔ ۱۹۶۷ء تک ۳۴ مجموعے شائع ہو چکے تھے۔ تین نعتیہ دیوان "نغمۂ روح"، "کرم بالائے کرم"، "قربان مدینہ" اور "نعتِ رسول" کراچی میں شائع ہوئے ہیں۔

بہزاد صاحب خانقاہ نیازیہ بریلی کے سجادہ نشین حضرت عزیز میاں کے مرید ہوئے۔ اس کے بعد سے وہ ہوش میں رہنے لگے اور اضطراب میں کمی ہو گئی۔ ۱۹۶۳ء میں حالت اس قابل ہو گئی کہ روزمرہ کاموں میں حصہ لے سکیں۔ ان کی شادی لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ چار لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ انور بہزاد ریڈیو کراچی میں نیوز ریڈر ہیں۔ افسر بہزاد کوئٹہ میں اناؤنسر تھے۔ سکندر بہزاد آزاد کشمیر ریڈیو پر نیوز پڑھتے تھے۔ سرور بہزاد بھی پہلے ریڈیو میں ملازم تھے مگر پھر بزنس کرنے لگے۔

بہزاد صاحب کے دادا حاجی محمد حسین خاں، عاشق رامپوری داغ کے شاگرد تھے اور اچھے شاعروں میں شمار کئے جاتے تھے۔

۱۹۴۵ء میں بہزاد صاحب نے بمبئی میں فلموں کے لئے گانے لکھنا شروع کئے۔ کچھ فلمی کہانیاں اور مکالمے بھی لکھے۔ ان کی مشہور فلموں میں روٹی، زمیندار، آگ، گجرے، لاڈلی اور جگنو شامل ہیں۔ لیکن جب مذہبی رنگ غالب آگیا تو فلموں کے لئے لکھنا چھوڑ دیا۔ پھر تو یہ حال ہوا کہ

اوروں کی جفا یاد نہ اپنوں کی وفا یاد
اب کچھ بھی نہیں مجھ کو مدینے کے سوا یاد

مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے جب انہوں نے یہ شعر پڑھا تو ان کے آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے تھے۔

۱۹۵۲ء میں بہزاد ریڈیو پاکستان کراچی سے وابستہ ہوئے تھے اور ۱۹۶۳ء تک رہے۔ روز صبح نعت پڑھتے تھے۔ لیکن بارہ برس کی خدمات کے بعد سبکدوش کر دیا گیا حالانکہ ان کے

ساتھ خصوصی سلوک ہونا چاہیئے تھا۔ اور کم سے کم وظیفہ ہی جاری کر دیا جاتا۔ البتہ ۱۹۶۵ء میں صدر پاکستان نے دو سو روپے ماہوار وظیفہ جاری کر دیا۔ اس کے سوا کوئی مستقل آمدنی نہیں تھی۔ قرض لے کر دستگیر سوسائٹی میں ایک مکان بنوایا جس کی قسطیں ادا کرنا بھی ایک بڑا بوجھ تھا۔

بہزاد صاحب نے بتایا کہ لکھنؤ کے پرانے مشاعرے ایک اسکول ہی ہوتے تھے۔ جہاں نہ صرف فن کی بلکہ آدابِ محفل کی بھی تربیت دی جاتی تھی۔ بیٹھتے وقت اپنے اور دوسروں کے مرتبے کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ داد دیتے وقت بڑی احتیاط برتی جاتی تھی۔ اساتذہ کسی شعر پر داد دیتے تھے تو اس شعر کی خوبی کا ذکر کر کے داد دیتے تھے۔ جس سے شاگردوں کا علم بڑھتا تھا۔ جس شعر میں خامی ہوتی تھی، بندش کمزور یا مضمون پھسپھسا ہوتا تھا۔ اساتذہ خاموش رہتے تھے اور شاگرد سمجھ جاتے تھے کہ شعر کمزور ہے۔ گو بہزاد روایتی غزل کے شاعر تھے۔ لیکن انہوں نے کہا تھا کہ میں نے اپنی شاعری میں ہمیشہ زمانے کا ساتھ دیا ہے اور بدلتے ہوئے رنگ کے ساتھ اپنے کو تبدیل کیا ہے۔ ثبوت میں انہوں نے اپنی تازہ غزل سنائی تھی جو انہی دنوں کہی گئی تھی۔

غم میں آنسو نہ بہنا بڑی بات ہے
دل کا قابو میں رہنا بڑی بات ہے
زندگی کاٹ لینا غمِ ہجر میں
کچھ نہ کہنا نہ سننا بڑی بات ہے
ہجر کے غم سے بڑھ کر کوئی غم نہیں
اس مصیبت کو سہنا بڑی بات ہے
وقت کا ساتھ دیتے ہیں مردانِ حق
اس کی موجوں میں بہنا بڑی بات ہے
دوستوں کا کرم دشمنوں کی عطا
چوٹ پر چوٹ سہنا بڑی بات ہے

اس بڑھاپے میں بہزاد یہ سوزِ عشق
ایسے اشعار کہنا بڑی بات ہے

جب میں نے ستمبر ۶۷ء میں بہزاد صاحب سے ملاقات کی تھی اور ان سے انٹرویو لیا تھا۔ تب بھی چھیاسٹھ سال کی عمر میں ان کے دم خم میں کمی نہیں آئی تھی۔ ویسا ہی بانکپن موجود تھا۔ شعر بھی جوان تھے اور آواز بھی۔ ترنم اتنا اچھا تھا اور مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ مشاعرے کی صفیں الٹ دیتے تھے امتداد زمانہ اور مالی پریشانیوں نے نہ ستایا ہوتا تو شاید یہ دیکھنے میں بھی اتنے بوڑھے نظر نہ آتے۔ ۵۷ء اور ۵۸ء میں مسلسل دو حج کر چکے تھے۔ تیسرے کی آرزو تھی۔

بہزاد صاحب کو زمانے سے بہت شکایت تھی۔ ادب میں گروپ بندیوں نے انہیں بھی بہت نقصان پہنچایا تھا۔ کچھ لوگوں نے جو اپنی ٹھیکیداریاں قائم کر رکھی تھیں ان کے وہ بڑے شاکی تھے۔ رائٹرز گلڈ سے وہ بھی مطمئن نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ادیبوں اور شاعروں کو جن کی ساری عمر شعر و ادب کی خدمت میں گزر جائے، کم سے کم بڑھاپے میں گزر بسر کے لئے اتنی امداد ضرور ملنا چاہیئے کہ وہ کسی پریشانی کے بغیر زندہ رہ سکیں لیکن گلڈ کو ان چیزوں سے غرض نہیں تھی۔ باہر کے مشاعروں سے کچھ آمدنی ہو سکتی تھی لیکن گروپ بندیوں میں معروف لوگ اکثر انہیں بھول جاتے تھے اور بیرونی مشاعروں کے دعوت نامے ۱۳۱/۱۲ عزیز آباد کراچی نمبر ۳۸ کے پتہ پر کم ہی وصول ہوتے تھے۔

بہزاد صاحب نے ایک طویل عمر (۷۳ سال) پائی۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو مغرب کے وقت کراچی میں انتقال ہوا۔ قمری تاریخ ۲۳ رمضان المبارک تھی۔ اور جمعرات کا دن۔ آج کل ان کے صاحبزادے انور بہزاد ان کے کلام کا مجموعہ "فیضانِ حرم" بہزاد ادبی ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام شائع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ ٹرسٹ انور بہزاد نے قائم کیا ہے۔ حکومت نے بہزاد ٹرسٹ کے لئے نارتھ ناظم آباد میں ایک ایکڑ زمین دی ہوئی ہے وہاں مسجدِ بہزاد، سیرت لائبریری اور دینی درسگاہ قائم کی جائے گی۔

بہزاد جو اپنی زندگی ہی میں عاشقِ رسول کہلاتے تھے نارتھ ناظم آباد کے بلاک جے کی آخری چورنگی کے قریب ابدی نیند سو رہے ہیں۔

بہزاد لکھنوی

عکسِ فن

کھلتے ہی چلے جاتے ہیں اسرارِ محبت
بہزاد عجب چیز ہے ارمانِ مدینہ

جبیں تو ہر جگہ کرتی ہے سجدے
دلوں کو وقتِ سجدہ دیکھ آئیں

یاد مٹ جائے سارے عالم کی
پر نہ جائے کبھی مدینے کی

جاؤ گے تو دیکھو گے عجب عشق کا عالم
پاؤ گے دو عالم کو جبیں سائے مدینہ

کامرانِ چشم شوق ہے بہزاد
گو بظاہر نظر کو دوری ہے

جہاں کا عشق ہے بہزاد فانی
فقط عشقِ نبی ہی جاوداں ہے

جہاں سے کہ گذرے تھے شاہِ دو عالم
میں بہزاد ان رہگذاروں میں گم ہوں

چاہے تو دو عالم کو بدل دے
آپ کا اک ادنیٰ سا اشارہ

تابش دہلوی



نیمروز

پیدائش ۱۹۱۰ء

کوئی تمنا پاس نہیں ہے کوئی تصور ساتھ نہیں
کیسے کٹے گی یہ شب ہجراں آج اکیلا تابش ہیں

درد دل میں چھپا سا پاتا ہوں
آپ دل کے قریب ہیں شاید

تابش دہلوی
۹ دسمبر ۱۹۶۷ء

تابش دہلوی

"یہ ریڈیو پاکستان ہے ۔ اب آپ مسعود تابش سے خبریں سنئے ۔"
ایک ٹھہری ہوئی جاری بھرکم آواز میں جس ایک ایک لفظ صاف اور ایک ایک حرف اپنے صحیح مخرج سے ادا ہو۔ برسوں ریڈیو پاکستان سے سنی جاتی رہی اس سے پہلے آل انڈیا ریڈیو سننے والے بھی اس آواز سے اچھی طرح آشنا تھے ۔

مسعود تابش جن کا اصل نام مسعود الحسن ہے ادبی حلقوں میں تابش دہلوی کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں ۔ نومبر ۱۹۱۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے ۔ تابش کے پردادا نظام الدین نظامی فارسی کے مشہور شاعر تھے تو دوسری طرف ان کے پرنانا مولوی مولوی ذکا اللہ جیسی شخصیت تھے ننھیال اور ددھیال دونوں طرف سے تابش کو مستند ٹکسالی زبان ورثے میں ملی اور اگر انہیں اپنی زباندانی پر فخر ہے تو کچھ بے جا نہیں گیارہ سال کی عمر میں انہوں نے شعر موزوں کرنا شروع کر دیئے تھے زانوئے ادب کسی کے آگے اس لئے تہہ نہیں کیا کہ گھر کے بزرگ جو کچھ انہیں سکھاتے رہتے تھے استاد بھی اس سے زیادہ کیا سکھاتے ۔ مولوی عنایت اللہ دہلوی تابش کے نانا تھے۔ حیدر آباد دکن میں دارالترجمہ کے ناظم کی حیثیت سے انہوں نے جو گرانقدر خدمات انجام دیں وہ سب پر روشن ہیں ۔ تابش دہلوی نے انہی کے سائے میں پرورش پائی اور چھوٹی سی عمر میں اتنا کچھ علم حاصل کر لیا کہ بہت سے لوگ ایک عمر صرف کر کے بھی نہیں سیکھ پاتے ۔

دہلی سے انہوں نے میٹرک کا امتحان دیا اس کے بعد عارضی طور پہ تعلیم ترک کر دی (بعد میں بی اے انہوں نے [illegible]ء میں کراچی سے کیا) ۱۹۳۰ء میں دہلی سے "ساقی" کا اجراء ہوا۔ تابش دہلوی کا کلام اس میں شائع ہونے لگا اور اس وقت کے دوسرے بھاری بھرکم پرچوں مثلاً نیرنگ خیال، ادبی دنیا، ہمایوں وغیرہ میں بھی وہ چھپتے رہے

پہلی بیوی کے انتقال کے بعد دہلی میں دوسری شادی کی پہلی بیوی سے ایک لڑکی اور دوسری سے تین لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے۔ موجودہ بیوی رشتے میں مرزا غالبؔ کی بھانجی ہوتی ہیں ان کے نانا ہی کے مکان میں غالبؔ رہا کرتے تھے اتفاق سے وہ غالبؔ کے ہم نام تھے۔ یعنی مرزا نوشہ ہی کہلاتے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت کرتے ہوئے ۴۷ء میں تابشؔ لاہور آ گئے اور ۴۹ء میں کراچی آ گئے اس سے پہلے وہ دلی، حیدرآباد وغیرہ میں متعدد بڑے مشاعرے پڑھ چکے تھے اور فانی بدایونی، مرزا ہادی رسوا، نظم طباطبائی کی صحبتوں سے فیض حاصل کیا۔ ۱۹۴۷ء تک انہوں نے جو کچھ کہا تھا اس کا بہت بڑا حصہ ہجرت کے ہنگامے میں تلف ہو گیا۔ ان کے کلام کا پہلا مجموعہ "نیم روز" ۶۳ء میں اردو اکیڈمی سندھ نے شائع کیا اور نیشنل بک سنٹر نے اسے پہلا انعام دیا۔

تابشؔ نے اساتذہ کا مطالعہ بنظر غائر کیا ہے اور خاص کر مرزا مظہر جان جاناں، میرؔ غالبؔ اور مومنؔ سے متاثر ہیں ان کے علاوہ فانیؔ، اصغرؔ اور اقبالؔ ان کے محبوب شاعر ہیں۔ وہ وجدان کے قائل ہیں اور اپنے جذبات کی عکاسی کو ہی اصل شاعری سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ شاعر کو اسی موضوع پہ قدم اٹھانا چاہیئے جس کے بارے میں اسے یقین ہو کہ وہ اس کے ساتھ پورا انصاف کر سکے۔

ان کے خیال میں شاعری کی موجودہ روش بڑی گھٹیا ہے لوگ شعر کہتے ہیں لیکن انہوں نے نہ مطالعہ کیا ہے نہ فن پہ ان کی گرفت ہے۔ حد یہ کہ شاعری کے اصولوں تک سے واقف نہیں ہوتے۔ خود انہوں نے اپنا شعور پختہ ہونے کے بعد دو ہزار غزلوں میں کانٹ چھانٹ کر کے صرف چار سو باقی رکھی ہیں ان میں سے دو سو پہلے مجموعے میں شامل ہیں۔

تابش دہلوی

تابش دہلوی کی شعر گوئی کے لئے زمان و مکان کی کوئی قید نہیں البتہ اندرونی طور پر تحریک ضروری ہے جب طبیعت سوز و گداز کی جانب مائل ہو تو شعر ڈھلنا شروع ہو جاتے ہیں آج کل کے مشاعروں سے وہ بہت خفا ہیں اور کہتے ہیں کہ سرکاری طور پر انہیں ممنوع قرار دے دینا چاہیئے کیونکہ اب مشاعرے محض تماشہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ تابش دہلوی نے وہ مشاعرے دیکھے ہیں جن میں شعرا اور سامعین دونوں کو اپنے فرائض کا احساس ہوتا تھا تہذیبی قدریں زندہ تھیں اور ادابِ محفل کا بڑا لحاظ رکھا جاتا تھا ایسے مشاعروں میں پڑھ کر فخر محسوس ہوتا تھا۔ انہوں نے ۱۹۳۳ء کے ایک مشاعرے کا ذکر کیا جو خواجہ حسن نظامی مرحوم نے دہلی میں کرایا تھا۔ یہ مشاعرہ "بزم غالب" کی جانب سے منعقد ہوا تھا۔ اور صفی لکھنوی بیخود دہلوی، سائل دہلوی، جگر مراد آبادی، فراق گورکھپوری اور دوسرے اساتذہ نے شرکت کی تھی۔ ان مشاعروں کی خصوصیت یہ ہوتی تھی کہ اگر کسی شاعر نے کوئی غیر معمولی اور اچھی غزل پڑھ دی تو اساتذہ بڑی وسیع القلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی غزلیں پھاڑ ڈالتے تھے کہ اس غزل کے بعد پڑھنا بے کار ہے۔ اگر کسی بچے کا بھی شعر حاصل مشاعرہ ہوتا تھا تو سب دل کھول کر داد دیتے تھے۔

تابش دہلوی کا کہنا ہے کہ ہمارے بزرگوں نے ادب کو جس منزل تک پہنچا کر ہمارے سپرد کر دیا ہے، نئی نسل کا فرض ہے کہ وہ اسے آگے لے جائے اور اس کے لئے بڑے وسیع مطالعے اور انتھک محنت کی ضرورت ہے۔ افسوس ہے کہ آج بیشتر لوگ محض سستی شہرت حاصل کرنے کے لئے شعر کہتے ہیں۔

تابش زندگی میں بڑے سلیقے کے آدمی ہیں۔ لباس میں شیروانی پسند ہے اور اپنی خوش پوشی کے لئے مشہور ہیں۔ سوٹ محض مجبوری سے ہی پہنتے ہیں۔ پہلے وہ ریڈیو پاکستان کے اسکول براڈکاسٹ کے شعبے میں اسکرپٹ رائٹر تھے۔ تاریخ ان کا محبوب مضمون ہے اور ادب کے علاوہ اسی کا مطالعہ کرتے ہیں۔

سال ۱۹۷۹ء میں تابش دہلوی کا دوسرا مجموعہ کلام شائع ہو رہا ہے۔ ان دنوں وہ ریڈیو پاکستان کراچی میں ڈیوٹی افسر ہیں۔

تابش دہلوی

عکسِ فن

جیسے سر پھوڑ کے مل جائے گی زنداں سے نجات
کیا جنوں نے کوئی دیوار میں در دیکھ لیا!

جنوں اور اہلِ جنوں کا وہ قحط ہے تابش
اٹھا نہ دشت سے پھر کوئی نعرۂ "یا ہُو"

عشق بھی تابش نہیں وجہِ نشاط
اب یہ رسم درد بھی دل سے اٹھی

مے و مستی نہیں ہے اس پہ حرام
میکدے میں جو ہوش مند رہے

عجب نہیں کہ حیاتِ دوام بھی بخشے
وہ ایک لمحۂ فرقت جو اک برس گذرا

رات دن دھوپ چھاؤں کا عالم
کیا تماشا نظر میں رکھا ہے

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

جھولنے

انجمن

حکمت قرآن

جاہ و جلال

مسلمانوں کا

علم جعفر

علم جغرافیہ

اور شوقِ سیاحت



پیدائش ۱۸۹۹ء

وفات ۱۹۷۸ء

دردمندوں کو کسی نے تو پکارا ہوگا

اس بھری بزم میں کوئی تو ہمارا ہوگا

صوفی تبسم

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

کیا آپ نے کبھی سنا ہے کہ کوئی شخص کچھ پانے کے لئے کوشش کرے مقابلے میں شریک ہو اور اول آنے کے بعد جب مطلوبہ انعام اس کی خدمت میں پیش کیا جائے تو قبول کرنے سے انکار کر دے ۔!

بے نیازی اور تیاگ کا یہ درجہ صرف سادھوؤں یا قلندروں کو حاصل ہے اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم بچپن سے ہی سادھو یا قلندر واقع ہوئے تھے پھر صوفی نام کا اثر بھی ہونا ضروری تھا ۔ چنانچہ جب یہ چرچ مشن اسکول امرتسر میں نویں کے طالب علم تھے شہر میں ایک بڑا مشاعرہ ہوا ۔ جس کی صدارت جلیانوالہ باغ کے ہیرو ڈاکٹر سیف الدین کچلو کر رہے تھے ۔

پورے شہر میں مشاعرے کی دھوم تھی ۔ صوفی غلام مصطفیٰ بھی جانا چاہتے تھے ۔ لیکن داخلہ کارڈ سے تھا اور ان کے پاس کارڈ موجود نہ تھا ۔

ان کے اسکول کے ماسٹروں میں ایک شاعر مولوی محمد دین غریب بھی تھے ۔ ان کے شاگردوں نے ان سے درخواست کی کہ وہ مشاعرے میں شرکت کے لئے کارڈ دلوا دیں ۔ مولوی محمد دین نے سب شاگردوں کو ایک مصرعہ دیا اور کہا کہ جو سب سے پہلے اس طرح میں شعر کہے گا ، اسے مشاعرے میں شرکت کا کارڈ ملے گا ۔

اس مقابلے میں صوفی غلام مصطفیٰ اول آئے ۔ مولوی صاحب نے بڑی تعریف کی اور کارڈ بھی دیا ۔ لیکن اس کے بعد ان کا دل بجھ گیا یعنی مشاعرہ ہوا اور وہ نہیں گئے ۔

تبسمؔ اکثر کہا کرتے تھے۔ کہ میں بیسویں صدی سے ایک سال بڑا ہوں۔ یعنی بیسویں صدی میں جو سنہ چل رہا ہے۔ اس میں ایک سال جوڑ لیجئے۔ اور میری عمر معلوم کر لیجئے۔ وہ ۱۸۹۹ء میں پیدا ہوئے تھے۔

حفیظؔ جالندھری صاحب نے اپنی شاعری کی طلائی جوبلی منائی تو ایک مقطع میں اپنے آغازِ شاعری کو ان الفاظ میں یاد کیا کہ

"نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں"

صوفی صاحب کو یہ مصرعہ ان سے دو چار برس پہلے کہہ لینا چاہئے تھا۔ مگر یہاں بھی ان کا صوفی ہونا آڑے آگیا۔

صوفی صاحب نے ابتداء میں اصغرؔ تخلص رکھا لیکن چونکہ بچپن میں یہ ہنسوڑ بہت واقع ہوئے تھے اس لئے ان کے استاد حکیم فیروز الدین نے تبسمؔ تخلص تجویز کیا اور اسی دن سے یہ مسکراہٹ صوفی کے نام کا جز بن گئی۔

چرچ مشن اسکول سے میٹرک کر کے انہوں نے خالصہ کالج امرتسر میں داخلہ لے لیا۔ وہاں ایک پروفیسر ارجن ناتھ تھے۔ جو بڑے عالم تھے اور اردو فارسی دونوں زبانوں شعر کہتے تھے نوشہ تخلص تھا۔ صوفی صاحب نے کالج کے ایک مشاعرے میں غزل پڑھی تو پروفیسر ارجن ناتھ نوشہ نے بڑی حوصلہ افزائی کی بعد میں صوفی نے ان سے بہت فیض حاصل کیا۔

تبسمؔ نے نظمیں بھی کہیں لیکن غزلیں زیادہ کہیں۔ فارسی میں بھی شعر کہے۔ نثر بھی لکھی۔ دسویں جماعت کے زمانے میں ان کا پہلا مضمون کشمیر میگزین میں چھپا۔ اس کے بعد کالج کے میگزین میں بھی متعدد مضامین شائع ہوئے۔

صوفی صاحب کا ابتدائی زمانہ اگرچہ مشرقی پنجاب میں گزرا لیکن ۱۹۰۲ء میں ہی وہ اس علاقے میں منتقل ہو گئے تھے۔ جو پاکستان میں شامل ہے۔ ان کی شادی چودہ سال کی عمر میں کر دی گئی تھی۔ اس زمانے میں یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ ۱۹۲۶ء میں انہوں نے محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کی اور پہلے ٹیچر اور بعد میں انسپکٹر ہو گئے۔ اس کے بعد وہ لاہور آکر سنٹرل ٹریننگ کالج میں ملازم ہو گئے۔ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۵۹ء تک وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں لیکچرار ہو گئے۔ کچھ عرصے

یونیورسٹی میں بھی پڑھایا۔ ۱۹۶۲ء میں لیل و نہار کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ لیکن جب اس پرچے کے لیل و نہار بگڑ گئے اور یہ بند ہوگیا تو انہوں نے ریڈیو پاکستان میں ملازمت اختیار کرلی۔

صوفی تبسم کا بچوں کی نظموں جھولنے، فارسی، اردو اور پنجابی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ انجمن، شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ انہوں نے ایک کتاب مسلمانوں کے علم جغرافیہ اور شوق سیاحت پر لکھی۔ ایک کتاب علامہ اقبال پر اور ایک کتاب 'حکمت قرآن' لکھ چکے ہیں۔ جاہ و جلال دوٹانک اور یہ خطرناک لوگ" کے نام سے وہ انگریزی ڈرامے بھی اردو اور پنجابی میں ترجمہ کر چکے ہیں۔

صوفی تبسم بچپن سے مذہبی ماحول میں رہے اور آپ پر اہل حدیث کا اثر رہا۔ اسی لئے وابستگی بھی مذہبی تحریکوں کے ساتھ زیادہ رہی۔ مثلاً احرار اسلام پارٹی۔ یوں آپ نے پروگریسو رائٹرز مجلس کے ساتھ بھی کام کیا۔ اگرچہ سرکاری ملازم تھے اور کھل کر سامنے نہ آسکتے تھے اس کے باوجود تحریک آزادی کے دوران ان کی قومی نظمیں زمیندار، انقلاب اور" پارس" وغیرہ میں شائع ہوتی رہیں۔ لیکن افسوس کہ اب ان نظموں کی نقلیں تک موجود نہیں ہیں۔

انہیں اردو کے مستقبل سے کوئی مایوسی نہیں تھی۔ حکومت مغربی پاکستان نے اردو اصطلاحات کو معیاری بنانے کے لئے جو کمیٹی بنائی تھی۔ صوفی صاحب اس کے صدر تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اردو میں درسی کتابوں کی کمی کی وجہ سے اردو کی ترویج صحیح طور پر نہ ہوسکی۔ انگریزی کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ اس کی مخالفت کرنے سے اردو کو نقصان پہنچتا ہے۔ انگریزی کی بین الاقوامی اہمیت کی بناء پر اس کا سیکھنا لازمی ہے۔ کیونکہ غلامانہ ذہنیت انگریزی زبان سے نہیں بلکہ انگریزی معاشرت سے پیدا ہوتی ہے۔

صوفی صاحب کی رائے تھی کہ مقامی زبانوں کی ترقی سے ہی اردو ترقی کرے گی۔ اس لئے ادیبوں اور شعراء کو اپنی مقامی زبانوں میں بھی لکھنا چاہیئے۔

بچوں کے ادب کے بارے میں ان کی رائے تھی کہ ہمارے ادیب و شاعر بچوں کے لئے لکھنا کسر شان سمجھتے ہیں اور اسے بہت چھوٹا کام تصور کرتے ہیں۔ دراصل بچوں کے لئے لکھنا پڑھنا بڑا مشکل کام ہے۔ اس کے لئے بچوں کی طرح سوچنا پڑتا ہے اور بچوں کی نفسیات کا گہرا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ صوفی صاحب کا کہنا تھا کہ نوجوان شعراء نئے استعارے اور تشبیہیں تلاش کر کے اردو کا دامن وسیع کر رہے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہمیں ماضی سے رشتہ نہیں توڑنا چاہیئے

صوفی تبسم کو اس دور کے مشاعروں سے اور خاص کر بڑے مشاعروں سے بڑی شکایت تھی۔ وہ کہتے تھے کہ مشاعرے ٹکٹ سے ہوتے ہیں اور جو لوگ کسی مصلحت، دباؤ یا فیشن کے طور پہ ٹکٹ خرید کر ان میں آتے ہیں ان میں شعر سمجھنے کا سلیقہ نہیں ہوتا جب کہ باذوق اور ادب نواز لوگ بچارے ٹکٹ نہیں خرید سکتے۔ اس طرح شعراء اور سامعین کے درمیان ایک دیوار کھڑی رہتی ہے۔ مشاعرہ دراصل لوگوں کو ایک مرکز پہ جمع کرنے کا ذریعہ ہے۔ مذہب کے بعد مشاعرہ ہی مختلف سطحوں کے لوگوں کو ایک سطح پہ لے آتا ہے۔ لیکن اب یہ بات نہیں رہی۔

صوفی تبسم کی دیگر تصانیف کے نام ہیں جاہ جلال (ڈرامہ) حکمت قرآن (دینی) دونا ٹک (پنجابی ڈرامے) سرایہ رہ سر افلاک، مسلمان کا علم جغرافیہ اور شوقِ سیاحت اور جھولنے جو بچوں کے لیے لکھی گئی نظمیں ہیں اور ان پہ انعام بھی مل چکا ہے۔

فروری ۱۹۷۸ء میں صوفی تبسم نے اس دنیا سے منہ موڑ لیا۔ اور ایک اچھا انسان ایک اچھا شاعر ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔

صوفی تبسم کی سات آٹھ کتابیں جن میں ڈرامے، مضامین، فیچرز، افسانے اور تنقیدی مضامین ہیں تیار پڑی ہیں۔ لیکن انہیں طباعت کا موقع نہیں ملا۔ ہمارے ملک میں کتابوں کی اشاعت کے مزید اداروں کی ضرورت ہے۔ تاکہ ہمارا ادب ہمارے ادیب کی طرح افلاس کا شکار نہ ہو سکے۔

صوفی غلام مصطفےٰ تبسمؔ

عکسِ فن

لگے ہیں دل سے اُبھرنے وفا کے افسانے
کہ اپنے حال پہ پھر کوئی مہرباں سا ہے

چھن نہ جائے ترا تبسّمِ لب
میرے درد و الم کی بات نہ کر

تیرے ہونٹوں کی خفی سی لرزش
اک حسیں شعر ہوا ہو جیسے

یہ کیا بہار کا جوبن، یہ کیا نشاط کا رنگ
فسردہ میکدے والے، اداس میخانے

یوں تری یاد سے جی گھبرایا
تُو مجھے بھول گیا ہو جیسے

اِس طرح تجھ سے گئے ہیں ٹکرے
مجھ کو اپنے سے گِلا ہو جیسے

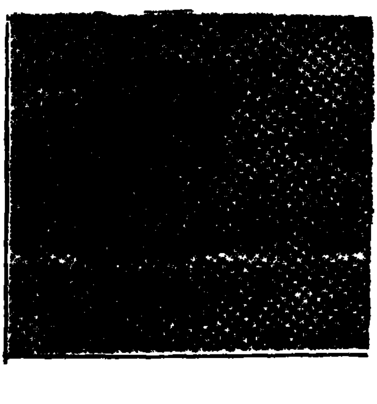
اللہ کرے جہاں کو مری یاد بھول جائے
اللہ کرے تم کبھی ایسا نہ کر سکو

تمکین سروری



معراج العاشقین
پری خانہ
قادر نامہ غالب

پیدائش ۱۹۲۳ء
وفات ۱۹۷۶ء



تحسین سروری

محترمہ سلطانہ مہر صاحبہ۔ تسلیم!

اخبار جنگ میں "آج کا شاعر" کے عنوان سے آپ نے جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ میں دلچسپی سے پڑھتا رہا ہوں۔ اب تک آپ نے جن جن پر لکھا ہے۔ ان میں بعض میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔ صحافت اور ادب کے امتزاج سے آپ نے بڑی عمدہ صنف نکالی ہے میرے علاوہ کئی احباب ہیں جو اس سلسلے کو پسند کرتے ہیں۔

میرے خیال میں آپ کی اس سلسلے میں صرف وہی شعراء آسکتے ہیں جو شعر جیسے نازک فن کے اہل بھی ہیں۔ اب تک آپ نے جن شعرائے گرامی کے تعارف پیش کئے ہیں بیشک وہ سب کے سب بلند پایہ شاعر ہیں۔ لیکن ۲۶ اگست کے سنڈے ایڈیشن میں یہ اعلان دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ ۲۳ ستمبر کا "آج کا شاعر" تحسین سروری ہوگا۔ اعلان سے قبل اگر آپ مجھ سے پوچھ لیتیں تو میں آپ کو اس کارِ ثواب سے باز رکھتا اور عرض کرتا کہ تحسین سروری میں جو شاعر تھا اس کے انتقال کو تقریباً ۲۰ سال ہو چکے ہیں۔ اب جو کبھی کبھی مشاعروں یا نشستوں میں کلام سناتا دکھائی دیتا ہے یا چند خاص رسالوں میں جس کا کلام چھپ جاتا ہے وہ کوئی مستحق لیکن گورکن تحسین سروری ہے۔

پاکستان آنے سے قبل بے شک میں محض شاعر تھا۔ اور میرا تعلق ترقی پسند گروپ سے تھا۔ چنانچہ میری بعض نظموں اور غزلوں کے اشعار سے میرے اس ادبی نظریے کی وضاحت

ہوتی ہے۔

۱۹۴۲ء میں جبکہ دکن ریڈیو کے پروپیگنڈہ سیکشن میں کام کرتا تھا۔ یکایک مجھے کلاسیک لٹریچر سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ میرے مذاق کی تبدیلی میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کے مقدمات کو زبردست دخل ہے جو مطبوعات انجمن ترقی اردو میں شامل ہیں ابھی میں ان کی اس چاشنی سے لطف اندوز ہونے بھی نہ پایا تھا کہ حیدر آباد انقلاب کی زد میں آ گیا اور میں ۱۲ جنوری ۱۹۴۹ء کی صبح کراچی میں سمندر کے راستے داخل ہوا۔

اپریل ۱۹۵۱ء میں انجمن ترقی اردو کی ملازمت نے مجھے بابائے اردو اور دیگر اہلِ علم بزرگوں سے قربت کا موقع دیا اور میں اوقاتِ دفتر کے بعد فاضل گرامی قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی مرحوم کے گھر جانے لگا۔ قاضی صاحب انجمن کے نائب معتمد اور رسالہ "اردو" کے مدیر تھے۔ اکثر رات کے دس گیارہ بجے تک جناب ممتاز حسن۔ جناب پیر حسام الدین راشدی اور جناب حفیظ ہوشیارپوری جیسے علمائے علم و فن بھی قاضی صاحب کے ہاں بیٹھے مذاکرے اور مباحثے کرتے اور ان "اکابر رالعبہ" کی مجلسِ علمی میں میری حیثیت ایک حقیر سے طالب علم کی ہوتی۔ اسی طرح انجمن کے شریک معتمد جناب سید ہاشمی فرید آبادی مرحوم کا فیضان علم بھی میرے شامل حال رہا۔

اس علمی ماحول کا یہ اثر ہوا کہ مجھے حیدر آباد میں کلاسیکی ادب کا جو شوق ہوا تھا وہ مشغلہ بن گیا اور میں خود تحقیقی مضامین لکھنے لگا۔ اتفاق سے میرے مضامین پہلے پہل انجمن کے رسالے "اردو" میں چھپے۔ اس کے بعد سے پاک و ہند کے مختلف علمی مجلوں میں میرے ناچیز مضامین نکلنے لگے۔ اسی دوران میں میری چار تصانیف اور ایک فارسی کا ترجمہ شائع ہوا۔

جب تحقیق کے بوجھل مشغلے سے اکتا جاتا ہوں تو شعر کہتا ہوں۔ یا پھر ہلکے پھلکے تاثراتی اور معلوماتی مضامین لکھتا ہوں۔ یہاں تک کہ ڈاک ٹکٹ پر بھی چند مضامین لکھ چکا ہوں جن میں ڈاک ٹکٹ کی تاریخی اور سماجی اہمیت اور ڈاک ٹکٹ جمع کرنے کے مقاصد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کسی زمانے میں ڈاک ٹکٹ کا اتنا شوق تھا کہ میں نے اس مشغلے کی انگریزی اصطلاحات

کے اردو مترادفات وضع کر لئے تھے چنانچہ STAMP COLLECTING کا میں نے "ٹکٹ شناسی" ترجمہ کیا تھا۔

ایک ادارے کو اپنے متعلق معلومات فراہم کرنے کے سلسلے میں میں نے اپنے مطبوعہ مضامین کا شمار کیا تو ایک سو پچاس کے قریب ہوئے۔ ان میں وہ غنائیے۔ فیچر اور تقریریں شامل نہیں ہیں جو میں نے ریڈیو کے لئے لکھیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جو اصحاب مجھے شاعر کی حیثیت سے جانتے تھے انہیں اس کا مطلق علم نہیں کہ میں نثر نگاری کرنے لگا ہوں۔ اسی طرح بعض پروفیسر قسم کے ادیب کہتے ہیں۔ "سنا ہے آپ کچھ شعر بھی کہتے ہیں"۔ لیکن میری شرافت دیکھئے کہ میں صاف انکار کر جاتا ہوں عام طور پر محقق جدید ادب کو کوئی روایت شکن چیز سمجھ کر خاطر میں نہیں لاتے اور اسی طرح بعض نئے ادیب و شاعر کلاسیکی ادب کو روایت پرستی اور روایت شکنی دونوں کا مخالف ہوں۔

میں نے اپنی عمر کا حساب کیا تو اس وقت اڑتالیس کے پیٹے میں ہوں۔ لوگوں کا بیان ہے کہ صورت سے ۵۰ کے کچھ اوپر ہی دکھائی دیتا ہوں۔ اس کا سبب غالباً وہ افکار و حوادث ہیں جن کے جھیلنے کے بعد لوگ کم جانبر ہوتے ہیں۔

میں حیدرآباد کے ایک زمیندار طبقے مقطعہ داران میں پیدا ہوا۔ نام خاندانی طریقے پر میر کاظم علی رکھا گیا۔ جب میں نے چوتھی جماعت سے شعر کہنا شروع کیا تو تحسین تخلص اختیار کیا۔ جنوری ۱۹۳۶ء کے ماہنامہ "حشر" (جالندھر) میں پہلی غزل اسی نام اور اسی تخلص سے شائع ہوئی بلکہ اس کے ساتھ حیدرآبادی بھی چھپا تھا) لیکن جب ذرا ہوش آیا تو تخلص کے ساتھ دم چھلّا لگانے کا خیال آیا۔ والد صاحب کا نام میر سرور علی تھا۔ میں نے اسی مناسبت سے تحسین سروری نام رکھ لیا۔

ابتدائی تعلیم کا آغاز اپنی جاگیر کے مضافاتی گاؤں قطب اللہ پور کے پرائیوٹ اسکول میں تلگو ابجد سے ہوا۔ اس کے بعد چوتھی جماعت تک اسی مضافاتی گاؤں میں میری تعلیم ہوئی پانچویں سے میٹرک تک شہر کے اسکول میں تعلیم پائی۔ لیکن والد صاحب کے اچانک انتقال کی وجہ سے تعلیم رک گئی اور ہمارا پورا خاندان آبائی جائداد کی مقدمہ بازی میں مصروف ہو گیا۔

جب فراغت نصیب ہوئی تو میں نے ادیب فاضل اور منشی کے مدارج طے کئے۔ ذاتی شوق کی بناء پر نظام شوگر فیکٹری اور دکن نیوز سروس میں کام کیا۔ ہفت روزہ آزاد حیدرآباد اور دورِ جدید کی ادارت بھی کی۔ آخر میں دکن کے ریڈیو کے پروپیگنڈا اسکیشن میں مسودہ نگار کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ حیدرآباد کی تحریک آزادی کے زمانے میں دکن ریڈیو سے ہمارا نعرہ کے نام سے جو منظوم پروگرام نشر ہوتا تھا۔ اس کے لئے ہر روز ایک نئی نظم مجھے لکھنی پڑتی تھی۔ ایک نعرے کے ٹیپ کا مصرع تھا۔

"آزاد تھے، آزاد ہیں، آزاد رہیں گے"۔

پھر یہ مصرعہ حیدرآباد کی آزادی پسند حکومت کا "سرکاری نعرہ" بن گیا۔ اسی دوران میں حیدرآباد کا سقوط عمل میں آیا۔ جس کے دو تین ماہ بعد میں کراچی آ گیا۔ کراچی میں پہلے ریڈیو پاکستان میں مسودہ نگاری اور گانے والوں کی صحت تلفظ کی خدمت پہ مامور رہا۔ اس کے بعد ۱۹۵۱ء میں انجمن ترقی اردو سے وابستہ ہوا۔ پھر انجمن چھوڑ کر ادارہ کاروانِ ادب میں بحیثیت اکاؤنٹنٹ کام کیا۔ ایک سال بعد پھر انجمن میں آگیا۔

۱۹۵۴ء میں اپنے سابق وطن حیدرآباد کے سفر کا شوق ہوا۔ پانچ ماہ بعد واپس جو آیا تو انجمن کے حالات دگرگوں تھے۔ لہٰذا میں اپنی ملازمت پر بحال نہ ہو سکا۔ ۵۵ء میں کراچی کے ایک ماہنامہ "تجلی" کا مدیر ہوا۔ چند روز ادارہ مشرب میں بھی کام کیا۔

۱۳ر جنوری ۵۹ء کو اہل و عیال سمیت پھر حیدرآباد روانہ ہوا لیکن جا کر ایسا پھنسا کہ ڈھائی سال تک واپسی کی کوئی صورت نہ نکلی۔ آندھرا پردیش کی وزارت داخلہ میرے ویزا میں توسیع کرتی رہی، لیکن آخر میں مرکز کے چیف سیکریٹری کے حکم نے مداخلت کر کے مجھ پر مقدمہ چلایا اور چار ماہ تک مجھے جیل میں رکھا۔ اس زمانہ کا اپنا ایک شعر یاد آ رہا ہے ؎

مسائل کچھ عجب پیدا ہوئے ہیں
ہم اپنے شہر میں رسوا ہوئے ہیں

خدا خدا کر کے ۱۶ر اگست ۶۱ء کو میں کراچی واپس ہو سکا۔ یہاں آنے کے بعد کامل ایک سال تک ملازمت نہ ملی۔ لیکن ترقیٔ اردو بورڈ سے مجھے کام ملنے لگا۔ نیز رسالوں میں مضامین

ملنے کا بھی کچھ معاوضہ مل جاتا تھا۔

یکم ستمبر ۱۹۶۲ء سے پاکستان رائٹرز گلڈ کے ترجمان "ہم قلم" میں معاون مدیر کی جگہ گئی۔ ساتھ ہی انجمن ترقی اردو میں جز وقتی کام کرنے کا بھی چانس ملا۔ لیکن چند ماہ بعد ین کے کل وقتی کارکنوں میں شامل کر لیا گیا۔ اس طرح الحمد للہ چھ سال سے انجمن کے ہبۂ مطبوعات میں معاون کی حیثیت سے کارگزار ہوں۔

حیدر آباد میں جب تک رہا۔ اس وقت کے چند مشہور نوجوان شاعروں میں میرا بھی مار تھا۔ مخدوم محی الدین سکندر علی وجد، صمد رضوی ساز، صاحبزادہ میکش وغیرہ کے د شاعروں کی جو نسل منظر عام پہ آئی تھی۔ ان میں ہم چار شاعر زیادہ مشہور تھے۔ ر حیدر آبادی (مرحوم) سلیمان ادیب، لطیف ساجد (مرحوم) اور تحسین سروری۔ ہم چاروں ، دوستی بھی مثالی تھی۔ چنانچہ ابراہیم جلیس کے بڑے بھائی محبوب حسین جگر نے ہم چاروں انام "چار مصرعے" رکھا تھا۔ ہم چار دوستوں میں نظر سب سے زیادہ مقبول شاعر تھے۔

میرے خاندان میں اور بھی کئی شاعر تھے، لیکن سید علی اختر اور ان کے نامور فرزند ظر حیدر آبادی کی طرح کوئی مشہور نہ تھا۔

میرے ادبی ذوق کی رہنمائی میں میرے والد مغفور کی ذات اور کتب خانۂ آصفیہ کی ، شاندار عمارت ہے۔ جہاں میں کئی برس تک چھ چھ گھنٹے تک روزانہ بیٹھا مطالعۂ کتب رتا تھا۔ میرے والد تھے تو زمیندار لیکن ان کا پیشہ وکالت تھا۔ اور مدرسہ دارالعلوم کے ارغ التحصیل ہونے کے سبب ان کا میلان ادب کی طرف زیادہ تھا۔

مجھے کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق ہے۔ کسی زمانے میں میرے پاس نایاب لتابیں مخطوطات اور نادر مطبوعات کا خاصا ذخیرہ تھا۔ اب زیادہ تر حوالے کی لتابیں ہیں۔ جن میں زیادہ تعداد تذکروں اور تاریخوں کی ہے۔ مثنویات اور دواوین ھی تعداد میں موجود ہیں۔ پرانے اخبار اور پرانے رسائل بھی جمع کرتا ہوں۔

شخصیات میں غالب میرا خاص موضوع ہے۔ اب تک دو درجن مضامین غالبیات پہ لکھ چکا ہوں۔

آنکھوں دیکھی شخصیات میں مولانا حسرت موہانی، حضرت جگر مراد آبادی، مسز سروجنی نائیڈو، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، نواب بہادر یار جنگ، مہاراجہ سرکشن پرشاد اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور سے بہت متاثر ہوا ہوں۔

۱۹۴۶ء میں میری شادی ہوئی، تین لڑکیوں ایک لڑکے کا باپ اور نواسے کا نانا ہوں۔ اتنی ساری سمع خراشی کے بعد یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں آپ کے عنوان "آج کا شاعر" پر کہاں پورا اترتا ہوں؟ لیکن اس پر بھی آپ مصر ہیں تو میں۔" آج کا شاعر نہیں۔ بلکہ کل کا شاعر تھا۔ (پرزوں کا نہیں)۔

میری چند کتابیں:۔

۱۔ مسدس رنگین و ترتیب و مقدمہ کے ساتھ

۲۔ چند ہم عصر و تصنیف بابائے اردو کا چوتھا ایڈیشن ترتیب و مقدمہ کے ساتھ۔

۳۔ قادر نامہ غالب

۴۔ معراج العاشقین

۵۔ پری خانہ (ترجمہ)

تحسین سروری نے بے شمار مضامین تحقیقی مقالے مضامین جو عام معلومات شخصیات تنقید، تبصرے اور دیگر موضوعات پر لکھے ہیں۔ ان کا انتقال ۲ دسمبر ۱۹۷۹ء کو کراچی میں ہوا۔ پس ماندگان میں ان کی بیوہ، تین بیٹیاں اور ایک بیٹا علی فیضان ہے۔ اب بھی مرحوم تحسین کی بے شمار غیر مطبوعہ تخلیقات ان کی بیگم نے اس آس میں محفوظ رکھی ہیں کہ شاید پاکستان کا کوئی اشاعتی ادارہ اس طرف نظر کرم کرے۔ اور اپنے آپ کو گذشتہ کل کا شاعر کہنے والے شاعر کا مقام آنے والے کل کے شاعر کی حیثیت سے تاریخ ادب میں متعین ہو جائے۔

تحسین سروری

عکسِ فن

زمانہ ہو گیا ہے شب کو گزرے
مگر، سورج ابھی نکلا نہیں ہے

مجھ سے اب ملتے ہیں سب یوں تحسین
جیسے میں خاک بسر کچھ بھی نہ تھا

کچھ یہ بھی ہے کہ موسم عشق اب نہیں رہا
کچھ ہم بھی تھک گئے ترے در پر کھڑے کھڑے

محال ہے ترے اس شہر سے نکلنا بھی
تمام راستے اب ہیں تری گلی جیسے

آفتابِ زندگی ایسا ہوں میں
شام ابھی آئی نہ تھی ڈوبا ہوں میں

جیسے برسات میں سوکھے ہوئے پیڑوں کا سماں
ہم تری بزم میں ہیں تشنۂ فریاد ایسے

ہمارے گھر میں یوں تو کیا نہیں ہے
بس اتنا ہے کوئی رہتا نہیں ہے

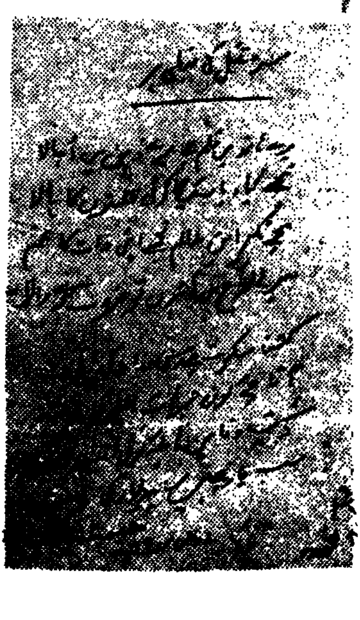
خوگرِ غم ہے مگر غم کے معانی مانگے
دل وہ پیاسا ہے جو دریا میں بھی پانی مانگے

حبیب جالبؔ



برگِ آوارہ
سرِ مقتل
عہدِ ستم





پیدائش سنہ ۱۹۲۹ء

حبیب جالب

پچھلے کئی سال کے عرصے میں وہ کئی مرتبہ گرفتار ہوئے۔ کتنی دفعہ گھر بار لوٹا گیا اس کے باوجود نہ ان کی زبان بند ہوئی نہ لہجے میں کوئی تبدیلی ہوئی۔

یہ حبیب جالب ہیں

اصل نام حبیب احمد، ۱۹۲۹ء میں مشرقی پنجاب میں ضلع ہوشیار پور کے ایک گاؤں میانی افغانان میں پیدا ہوئے۔ بچپن دہلی میں گذرا۔ ساتویں جماعت سے شعر کہنے لگے تھے۔ اسی سال امتحان میں، 'وقت سحر' جملے میں استعمال کرنے کو کہا گیا۔ انہوں نے جملے کے بجائے شعر لکھا۔

؎ وعدہ کیا تھا آئیں گے امشب ضرور ہم
وعدہ شکن کو دیکھئے وقت سحر ہوا

انہیں اپنا شعر یہی یاد ہے۔ استاد نے حوصلہ افزائی کی اور بہت سراہا۔ اس زمانے میں انہوں نے مضطر لدھیانوی سے اصلاح لینا شروع کر دی تھی۔ حبیب احمد نے نویں جماعت تک اینگلو عربک اسکول دہلی میں پڑھا۔ ٹھیک ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو جس روز پاکستان قائم ہوا۔ یہ کراچی پہنچے اور جیکب لائنز ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا۔ اسکول کے سامنے مسجد تھی۔ نماز اس میں پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن بہت دل لگا کر نماز پڑھی اور دعا مانگنے لگے تو بے اختیار زبان پہ یہ مطلع آگیا۔

؎ مدتیں ہو گئیں خطا کرتے
شرم آتی ہے اب دعا کرتے

اس کے بعد ان میں خود اعتمادی پیدا ہو گئی اور یقین ہو گیا کہ میں شعر کہہ سکتا ہوں۔ ابتدا غزل سے ہوئی۔ جن جذبات کا زبان سے اظہار نہیں ہو سکتا تھا انہیں ظاہر کرنے کے لئے غزل کا سہارا لیتے تھے۔ ان کے بڑے بھائی مشتاق مبارک بھی اس وقت بڑے زور شور سے شاعری کر رہے تھے۔ والد صوفی عنایت اللہ پنجابی کے مشہور شاعر تھے۔ اس خاندانی پس منظر نے ان کے شوق کی آگ پر تیل کا کام کیا اور شعر کہنے کی کیفیت جنون کی کیفیت کو پہنچ گئی۔ حد یہ کہ اس کے پیچھے تعلیم بھی مکمل نہ کر سکے۔

حبیب جالب نے جنگ اور امروز کراچی میں ملازمت کی اور اس زمانے میں ممتاز حسین اور ظہور نظر وغیرہ سے متاثر ہو کر ترقی پسندی کی طرف راغب ہو گئے، پھر مشہور کسان رہنما حیدر بخش جتوئی کی رہنمائی میں سندھ ہاری کمیٹی میں کام کیا۔ اس دوران انہیں ملک کی سب سے بڑی آبادی یعنی کسانوں کے مسائل کا علم ہوا۔

کراچی میں حکیم راغب مراد آبادی سے ملاقات ہونے پر ان سے متاثر ہوئے اور اپنی غزلیں کبھی کبھی انہیں دکھانے لگے۔ ان کا ایک شعر تھا

؎ ان کے ناپائیدار وعدوں پر
آ ہی جاتا ہے اعتبار مجھے

استاد نے اصلاح دی:۔

؎ ان کے ناپائیدار وعدوں پر
حسب سابق ہے اعتبار مجھے

ان کے بیان کے مطابق اکثر اساتذہ اپنے بعض شاگردوں کو خود کہہ کر دیتے تھے اور یہ بات بڑی مشہور تھی۔

حبیب جالب نے بتایا کہ راغب مراد آبادی۔ رئیس امروہوی اور استاد قمر جلالوی مرحوم کے ساتھ جس نوجوان شاعر کو دیکھا جاتا یہی کہا جاتا کہ وہ خود نہیں کہتا۔ اس لئے

حبیب جالب نے شاگردی ترک کردی اگرچہ راغب صاحب کے لئے ان کے دل میں آج بھی بڑا احترام ہے۔

کراچی میں زیڈ۔ اے۔ بخاری کے ہاں باقاعدہ طرحی مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ حبیب جالب ان میں پابندی سے شریک ہوتے۔ ان ہی مشاعروں کی ایک طرحی غزل کا مطلع ہے:-

ے طلاطم میں ہو جائیں پیدا کنارے
اگر کوئی ساحل سے مجھ کو پکارے

۱۹۴۸ء میں یوم اقبال کے سلسلے میں ایک انڈو پاک مشاعرہ ہوا جس میں رضا علی وحشت رگھوپتی سہائے فراق، جگر مراد آبادی وغیرہ شریک تھے۔ بخاری صاحب نے حبیب جالب کو بھی اس مشاعرے میں پڑھوایا جو ان کے لئے بہت بڑا اعزاز تھا۔ اس کے بعد وہ شہر شہر گھومتے رہے۔ وطن چھوڑنے کا دکھ غریبی، مفلسی، سرمایہ دارانہ نظام کے مظالم وغیرہ ان کی شاعری کے موضوع بن گئے۔ اس دور کا ایک شعر ہے۔

ے آج اس شہر میں کل نئے شہر میں بس اسی لہر میں
اڑتے پتوں کے پیچھے اڑاتا رہا شوقِ آوارگی

شروع میں بات استعاروں میں کہتے تھے لیکن جب گلبرگ (لاہور) میں گانے والیاں ان کا کلام گانے لگیں اور وہی سرمایہ دار اور نوکر شاہی کے ستون جن کے خلاف یہ شعر کہتے تھے۔ ان کے کلام کو بطور عیاشی سن کر لطف لینے لگے تو انہوں نے استعاروں کی زبان ترک کر دی اور ایسی زبان استعمال کرنے لگے جسے مزدور اور دوسرے عام لوگ اچھی طرح سمجھ سکیں۔

۱۹۵۸ء کے مارشل لاء سے پہلے غزلوں کا ایک مجموعہ "برگِ آوارہ" شائع ہوا۔ اس میں ان کا لہجہ نرم ہے لیکن مارشل لاء کے بعد 'سرِ مقتل' کے نام سے جو دوسرا مجموعہ شائع ہوا جس میں کھل کر بات کہی گئی تھی، ضبط کر لیا گیا۔

حبیب جالب نے فلموں کے لئے گیت بھی لکھے ہیں۔ یہ ذریعہ معاش بھی رہا ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کی شاعری میں عام لوگوں کی ترجمانی ہوتی ہے اسے عام لوگوں کی زبان بھی لکھنی چاہئے۔ اشاروں اور استعاروں میں بات کہنے سے آدمی محض ڈرائنگ روم کا شاعر بن کر رہ جاتا ہے۔ جدید شاعری میں ابہام کی زیادتی ان کے خیال میں سامراجی طاقتوں کی کوشش سے آیا ہے۔ اب ذریعہ ہے تعلیم کا اور سامراجی طاقتیں اور ان کے پٹھو سرمایہ دار نہیں چاہتے کہ عام لوگوں کا شعور بڑھے۔ انہیں اپنی حالت کا احساس ہو اور اسے بدلنے پر تل جائیں۔ اسی لئے ایک سامراجی سازش کے بطور ابہام کی شاعری کو مقبول بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ایک روز اپنی بیوی کے ساتھ انارکلی سے گزر رہے تھے تو دیکھا کہ راہگیر اکثر انہیں ادب سے سلام کرتے ہیں۔ انہوں نے سوچا کہ یہ مجھے اپنا شاعر سمجھتے ہیں اسی لئے اتنا احترام کرتے ہیں۔ اگر میں ڈرائنگ روم کی شاعری کرتا تو چند مٹھی بھر موقع پرستوں کو چھوڑ کر کوئی گھاس بھی نہیں ڈالتا۔

میکسم گورکی کی کتابیں انہوں نے اپنی بیگم کو پڑھوائیں اور وہ بھی ان کے سانچے میں ڈھل گئیں اور اب وہ ان سے پورا پورا تعاون کرتی ہیں۔

حبیب جالبؔ کا کہنا ہے کہ ہمارے لئے کلاسیکی ادب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ ولیؔ اور میرؔ سے لے کر پریم چند، کرشن چندر، اور منٹو تک نظم و نثر کا مطالعہ کئے بغیر ادبی شعور پیدا نہیں ہو سکتا۔

ان کی شروع کی شاعری پر مصحفیؔ، سوداؔ اور میرؔ کا اثر تھا۔ جدید شعراء میں فیضؔ اور فراقؔ ان کے پسندیدہ شاعر ہیں۔

ایک سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ شراب پی کر شاعری نہیں کی جا سکتی۔ شعوری طور پر شاعری کے لئے ضروری ہے کہ انسان پورے ہوش و حواس میں رہ کر لکھے۔ ویسے بطور فیشن پی کر شعر کہنا اور بات ہے۔

حبیب جالبؔ اپنے آپ کو عوامی جنگ کا ایک سپاہی تصور کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہماری جنگ کبھی ختم نہ ہوگی۔ ایک مورچے کے بعد دوسرے اور دوسرے

کے بعد تیسرے مورچے پر لڑائی جاری رہے گی۔ زندگی کا حسن نکھارنے کا کام مسلسل ہے اور یہی ایک باشعور انسان کا فرض ہے۔

ان کے مجموعے "سرِ مقتل" کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ تین ماہ میں اس کے تین ایڈیشن شائع ہوئے۔ گذشتہ چند برسوں میں ان کے دو مجموعے "عہدِ ستم" اور "گوشے میں قفس کے" شائع ہوکر مقبول ہوچکے ہیں۔

پچھلے چند برسوں میں انہوں نے سیاست میں عملی طور پر بھی حصہ لیا لیکن کامیاب نہ ہوسکے ہاں ان کی شاعری دھوم مچاتی رہی اور اب بھی یہ کسی مشاعرے میں چلے جائیں تو اسٹیج سے خود اٹھ جائیں لیکن عوام اٹھنے نہیں دیتے۔ شاعر بھی عوام کے ہیں۔ خواص کے اور امراء کے نہیں ...۔

ترنم سے پڑھتے ہیں اور ترنم بھی کیسا۔ گائیکی کا ایک منفرد انداز اس پہ ان کا کلام جو دلوں میں عزم و ہمت کے چراغ جلادیتا ہے۔ جیسے یہ نظم:

ختم ہوگا ستم کا اندھیرا
آنے والا زمانہ ہے تیرا
درد کی رات ہے کوئی دم کی
ٹوٹ جائے گی زنجیر غم کی
مسکرائے گی ہر آس تیری
لے کے آئے گا خوشیاں سویرا
سچ کی راہوں میں جو مرگئے ہیں
قافلے مختصر کرگئے ہیں
دکھ نہ جھیلیں گے ہم منہ چھپاکے
سکھ نہ لوٹے گا کوئی لٹیرا
آنے والا زمانہ ہے تیرا

٭

حبیب جالب

عکسِ فن

کہتے تھے جو اب کوئی نہیں جاں سے گذرتا
لو جاں سے گذر کر انہیں جھٹلا تو گئے ہم

دشمنوں نے جو دشمنی کی ہے
دوستوں نے بھی کیا کمی کی ہے

اب نظر میں نہیں ہے ایک بھی پھول
فکر ہم کو کلی کلی کی ہے

پل دو پل کے عیش کی خاطر کیا دبنا، کیا جھکنا
آخر سب کو ہے مرجانا، سچ ہی لکھتے جانا

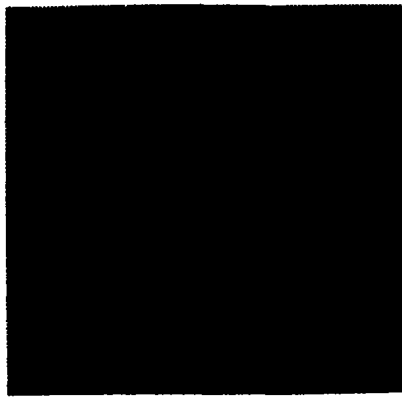
ہم ہی گذرے نہیں شامِ غم سے
ہم سے پہلے بھی بہت تھے ہم سے

وہ ایک چیخ تھا اک شور تھا ستم کے خلاف
وہ سوئے دار گیا اور بار بار گیا

تمہارا ساتھ کہو کب نہیں دیا لوگو!
گلے میں ہار نہ ڈالو تو گالیاں بھی نہ دو

سزا کے طور پہ ہم کو ملا قفس جالب
بہت تھا شوق ہمیں آشیاں بنانے کا

سیّد محمّد جعفری



پیدائش ۱۹۰۵ء
وفات ۱۹۷۶ء



سید محمد جعفری

بیوی نے کہا: "ہائے اللہ میں تو تم سے کہنا ہی بھول گئی۔ کل بتول کے بھائی کی شادی ہے اس نے سہرے کو کہا تھا۔ پانچ بجے آنے گی لینے۔" یہ حکم چار بج کر چالیس منٹ پر دیا گیا تھا۔ اور اب آپ اسے انتہائے مشق سمجھئے یا بیوی کا انتہائی ڈر بہر حال جب بیس منٹ بعد ان کی پیاری سہیلی تشریف لائیں تو سترہ شعر کا سہرا تیار تھا۔

یہ کام کسی مشین یا کمپیوٹر نے نہیں کیا بلکہ اس کے کرنے والے تھے آپ کے جانے پہچانے شاعر مرحوم سید محمد جعفری۔ بقول شخصے ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشند خدائے بخشندہ!

سید محمد جعفری بھرت پور میں پیدا ہوئے۔ والد ہیڈ ماسٹر تھے۔ بعد میں وہ لاہور اسلامیہ کالج کے پرنسپل بھی رہے۔ شبلی نعمانی اور علامہ اقبال کے ہم عصروں میں تھے۔ خود شاعر نہ تھے لیکن علم دوست تھے۔ ان کے دادا اور پردادا البتہ شاعر تھے۔ پردادا سید کرامت علی جعفری نے انتقال سے پہلے اپنے بیٹے یعنی ان کے دادا کو حکم دیا کہ میرا سارا کلام دریا برد کر دو۔ اور انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔

سید محمد جعفری نے لاہور میں تعلیم حاصل کی اور دوہرا فاصلہ طے کیا یعنی پہلے مولوی فاضل اور منشی فاضل کیا۔ پھر میٹرک پاس کر کے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی ایس سی آنرز کیا اس کے

بعد فارسی میں ایم اے کرکے فارسی ہی میں، ایم۔ او۔ ایل (ماسٹر آف اورینٹل لرننگ) کیا ۳۳ء میں تاریخ میں ایم اے کیا ۳۴ء میں بی ٹی بھی کرلیا ۳۷ء میں انگریزی ادب میں ایم اے کیا۔ شروع میں وہ لاہور اور لائلپور میں پڑھاتے رہے پھر مارچ ۴۲ء میں انفارمیشن آفیسر بن کر دلی چلے گئے۔ یہ سب پاکستان بننے سے پہلے کی بات ہے۔ پاکستان بنا تو بقول خود اس کے جہیز میں شامل ہوکر یہ بھی پاکستان آگئے۔ ۴۸ء میں ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن آفیسر ہوگئے ۶۴ء میں پاک سفارتخانے میں کنٹرول اتاشی کے طور پر ایران چلے گئے تین سال یہ خدمت انجام دی اس کے بعد ریٹائر ہوکر کراچی میں رہائش اختیار کی۔

شاعری کے آغاز کا قصہ یوں ہے کہ ۲۰ء میں انہیں آرٹ کا شوق ہوا دلی میں میو اسکول آف آرٹ میں پینٹنگ اور مٹی کے ماڈل بنانے سیکھنے لگے۔ والد صاحب کو پتہ چلا تو انہوں نے کہا کہ بیٹا یہ کام سیدوں کو زیب نہیں دیتا۔ انہوں نے اپنے ذوق کی تسکین کے لئے فیصلہ کیا کہ اب الفاظ سے تصویریں بنائیں گے اور صنم تراشیں گے، چنانچہ شاعری شروع کردی۔ اس کا آغاز ۲۲ء میں ہوا۔ شروع میں گھر والوں کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دی لیکن شہر میں شہرت ملنے لگی تھی۔ انجمن حمایت الاسلام کے مشاعرے میں ان کے والد بھی بیٹھے رہے، کچھ دیر بعد والد صاحب اٹھ کر چلے گئے۔ انہوں نے سمجھا کہ اب وہ نہیں آئیں گے اور میدان صاف ہوگیا ہے لہذا اپنا نام دوبارہ پکارنے کو کہا۔ یہ نظم پڑھ ہی رہے تھے کہ والد صاحب مع دونوں بھائیوں کے داخل ہوئے۔ انہیں دیکھ کر یہ مصرعہ بھول گئے۔ اور اٹک اٹک کر شعر پورا کیا اور پھر کسی نہ کسی طرح نظم ختم کرکے وہاں سے بھاگے سیدھے گھر آئے اور والدہ سے کہا کہ وہ والد سے سفارش کرکے یہ قصور (شعر پڑھنے کا) معاف کرادیں۔ اس کے دوسرے دن اسلامیہ کالج اولڈ بوائز کا ڈنر تھا۔ جس میں پنجاب کے متعدد وزراء بھی موجود تھے۔ سید محمد جعفری ہال میں داخل ہوئے تو تالیاں پٹنے لگیں۔ یہ سمجھے کسی اور کے لئے بج رہی ہیں لیکن سر سکندر حیات نے توجہ دلائی کہ یہ تمہارا ہی استقبال ہو رہا ہے۔ وہاں انہیں اپنے والد صاحب کے برابر جگہ ملی۔ سر سکندر نے ان سے شعر سنانے کی فرمائش کی تو انہوں نے ڈرتے ڈرتے والد کی طرف دیکھا۔ والد نے کہا۔

"میاں جب شعر کہتے ہی ہو تو پڑھ بھی دو۔ اب چھپانے سے کیا حاصل۔"
سید محمد جعفری شروع سے ہی مزاحیہ شعر کہتے تھے۔ والد صاحب سے اجازت مل گئی۔ تو اعلانیہ مشاعروں میں جانے لگے۔ اصلاح کسی سے نہیں لی لیکن ۱۹۱۷ء میں لکھنؤ جانا اور دو سال رہنا ہوا تو ظریف لکھنوی، عزیز لکھنوی اور دوسرے اساتذہ سے فیض ضرور حاصل کیا۔

ان کی شادی ۱۹۲۴ء میں بھرت پور میں ہوئی۔ بیوی مشہور شاعر ظریف جبلپوری کی بھانجی ہیں۔ شادی کا حاصل چھ اولادیں ہیں۔ پانچ لڑکے اور صرف ایک لڑکی۔

سید محمد جعفری اپنے سے پہلے گذرنے والے تمام اچھے شعراء کو اپنا استاد سمجھتے تھے، کیونکہ سب کے کلام سے فیض حاصل کیا۔ مزاح لکھنے والوں میں اکبر الہ آبادی کو اردو کا سب سے بہتر شاعر تصور کرتے تھے۔ ضمیر جعفری، نذیر احمد شیخ، مرزا محمود سرحدی، عظیم عباسی ظریف جبلپوری اور دلاور فگار کو بھی اچھا مزاح گو تسلیم کرتے تھے۔ محمود سرحدی کا یہ شعر انہیں بہت پسند تھا۔

؎ کوئی لیتا ہے جو رشوت تو مجھے کیا اس سے
میں تو سچ کہہ کے حوالات سے ہو آیا ہوں

اپنے اشعار میں سب سے زیادہ انہیں جو شعر پسند تھا وہ ان کی نظم لکا گانا کا یہ شعر ہے۔

؎ یا محمد مصطفےٰؐ تم پر ہزاروں ہوں سلام
اب ہوا معلوم یہ گانا ہوا ہے کیوں حرام

اسی طرح ان کی نظم ایبسٹریکٹ (تجریدی) آرٹ کا ایک شعر ہے۔

؎ آڑی ترچھی سی لکیریں تھیں وہاں جلوہ فگن
جیسے ٹوٹے ہوئے آئینے پہ سورج کی کرن

سید محمد جعفری کا کہنا تھا کہ مزاحیہ شاعری میں پاکیزگیٔ خیال کی بڑی اہمیت ہے شعر ایسا ہونا چاہیئے کہ آپ اہل خاندان کے درمیان بیٹھ کر سنا سکیں، دوسرے یہ کہ مزاح سے اگر کسی کی دل آزاری ہو تو وہ مزاح نہیں رہتا۔ انہوں نے نثر میں بھی بہت کچھ لکھا ہے

لیکن یا تو عطارد کے فرضی نام سے لکھا یا پھر بے نام انہوں نے کچھ غزلیں بھی کہی ہیں لیکن وہ سناتے نہیں تھے۔ مجموعہ ۱۹۶۸ء میں مرتب کر رہے تھے۔ دو ڈھائی سو نظمیں کہہ چکے تھے۔ اب تک اپنا کوئی مجموعہ شائع نہ کرنے کی وجہ یہ بتائی تھی کہ اس راہ میں پہلے کاتب، پھر پبلشر کی اور پھر قاری کی خوشامد کرنا پڑتی ہے۔ بہرحال ان کی بیشتر نظمیں روزنامہ جنگ اور ماہنامہ ساقی میں شائع ہو چکی ہیں۔

۱۹۶۸ء میں ہر پیر کو چار بجے شام نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ کی جانب سے ریڈیو پر وہ نئی نظم سناتے تھے۔ انہیں شکایت تھی کہ خواتین مزاحیہ شاعری کی طرف توجہ نہیں دیتیں اور خواہ مخواہ جھجکتی ہیں۔

سید محمد جعفری کا کہنا تھا۔ اگرچہ غزل کا روایتی انداز ہم نے فارسی سے لیا ہے لیکن معنی کے لحاظ سے ہماری غزل اب فارسی غزل سے بہت آگے۔ غزل گو شعراء نے نئے نئے تجربے کئے ہیں اور روایتی انداز کو باقی رکھتے ہوئے وہ کچھ کہہ دیا ہے جو آج سے بیس سال پہلے ناممکن نظر آتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہماری غزل جیسی شیرینی اور لطافت دنیا کی کسی زبان میں شاعری میں موجود نہیں ہے۔

سید محمد جعفری موجودہ تعلیمی نصاب سے مطمئن نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس میں تبدیلی کی جائے اور کلام پاک ابتدا سے ہی با معنی پڑھایا جائے۔ ساتھ ہی خط کی درستگی کے لئے تختی ضرور لکھوائی جائے۔ انہوں نے اپنے بچوں کی ان ہی خطوں پر تربیت کی وہ نماز کے پابند تھے اور کہتے تھے کہ پنجوقتہ نماز ہی انسان کو کامیاب بناتی ہے۔

سید محمد جعفری اپنے گھریلو سکون کو دنیا کی سب سے بڑی نعمت سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ اس کے بغیر کوئی اچھی تخلیق ممکن نہیں۔

سید محمد جعفری ۲۷ر دسمبر ۱۹۰۵ء کو پیدا ہوئے تھے۔ اور ۸ر جنوری ۱۹۷۶ء کو بوجہ عارضۂ قلب کراچی میں ان کا انتقال ہوا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

سیّد محمد جعفری

عکسِ فن

روانہ کردیں کرائے کی گر ضرورت ہے
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے

نقشِ محبوب مصوّر نے سجا رکھا تھا
مجھ سے پوچھو تو تپائی پہ کھڑا رکھا تھا

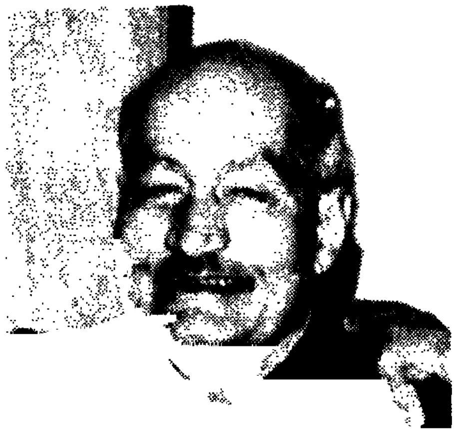
ہوُٹ کرنے کی جو دُھن بزم پہ چھا جاتی ہے
در و دیوار سے رونے کی صدا آتی ہے

ہم تو شاعر ہیں چھ نالے ہی کیا کرتے ہیں
بعض لوگ تو ایسے ہیں جو نالوں میں رہا کرتے ہیں

اونٹ گاڑی پہ سجا کے جلوس آتا ہے
جس طرح متّحد اقوام میں روس آتا ہے

کیا کہا تم نے کہ اردو کو لکھو رومن میں
اپنے ہاتھوں سے نہ دو آگ مرے خرمن میں

جوش ملیح آبادی



نقش و نگار
شعلہ و شبنم
فکر و نشاط
جنون و حکمت
حرف و حکایات
آیات و نغمات
سنبل و سلاسل
رامش و رنگ
سیف و سبو
سموم و صبا
طلوعِ فکر
اوراقِ سحر
یادوں کی بارات

پیدائش ۱۸۹۲ء

نیند اڑ چکی ہے تو بالش و بستر سے کیا غرض
ڈوبے ہوئے جہاز کو لنگر سے کیا غرض
سُن ہو چکا ہے ذہن کو تلخابۂ حیات
اب اہتمامِ شیشہ و ساغر سے کیا غرض

جوش
۲۸|۱۱|۶۳

جوشؔ ملیح آبادی

حسام الدولہ، تہور جنگ نواب فقیر محمد خاں نام کے ہی نہیں بلکہ واقعی نواب تھے۔ ان کے نام میں ہی

باادب، باملاحظہ، ہوشیار

جیسا صوتی تاثر شامل ہے۔ گویا تخلص تھا اور کسی زمانے میں پورے اودھ میں ان کے نام کا طوطی بولتا تھا۔ یہ جوشؔ کے پردادا تھے۔ دادا کا نام نواب محمد احمد خاں اور والد کا نام نواب بشیر احمد خاں تھا۔ خود ان کا نام نواب شبیر حسن خاں ہے۔ انیسویں صدی ختم ہونے میں دو چار سال باقی تھے کہ ملیح آباد میں پیدا ہوئے۔ گھر میں سب نواب تھے اور سب شاعر۔ نہ صرف ددھیال بلکہ ننھیال میں بھی یہی عالم تھا۔ مرد تو مرد ان کے خاندان میں عورتوں نے بھی شاعری کی۔ پھوپھی نواب بیگم اور بڑی بہن افسرؔ جہاں بیگم اچھی شاعرات تھیں۔ بھانجی صفیہ شمیمؔ بھی، جو اب راولپنڈی میں ہیں شاعرہ ہیں۔

جوشؔ نے نو سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا۔ ابتدا میں شبیرؔ تخلص تھا، سولہ سال کی عمر میں ایک عزیز دوست کے مشورے سے جوشؔ ہو گئے۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی جو کلکتے سے روز نامہ 'ہند' نکالتے تھے انہوں نے ۱۹۲۵ء یا ۱۹۲۶ء میں پہلی مرتبہ ان کے نام کے ساتھ 'شاعرِ انقلاب' لکھا جو اس نصف صدی میں ان کے نام کا جزو بن چکا ہے اگرچہ خود جوشؔ صاحب نے اسے کبھی قبول نہیں کیا۔

جوشؔ صاحب کو اس کا بڑا احساس ہے کہ ٹکسالی اور ستھرا ہند اردو کا حلیہ تیزی سے بگڑتا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں جل کر بولے :۔

"انشاء اللہ اور بگڑے گا۔ ہماری آنکھیں بند ہونے دیں۔ اس کے بعد ہماری اولاد اور اولاد کی اولاد مجھ کے بجائے میرے کو بولا کرے گی۔"

اُن کا کہنا ہے کہ پاکستان میں اردو تو رہے گی لیکن اردوئے معلیٰ ختم ہو جائے گی یہاں کی سرزمین میں یہ پودا جڑ نہ پکڑ سکے گا۔ اور نہ آب و ہوا اسے راس آئے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو یہاں کے کسی علاقے کی مادری زبان نہیں ہے بلکہ باہر سے آئی ہے۔"

میرے ایک سوال کے جواب میں جوشؔ صاحب نے بتایا کہ خود ہندوستان میں بھی جو اردو کی سرزمین ہے بڑے بوڑھوں کی زندگی تک ہی یہ زبان باقی رہے گی، اس سلسلے میں انہوں نے ایک واقعہ سنایا کہ پچھلے دنوں جب وہ ہندوستان گئے تھے تو ایک مسلمان دوست کے بچے سے پوچھا کہ تمہارا اسکول کہاں ہے؟ بچے نے بتایا کہ "یہ بھگوان کا دوارا ہے اس کے قریب ہے۔"

"بھگوان کے دوارے" سے بچے کی مراد مسجد تھی۔ اب مسلمانوں کی اولاد یہ زبان سیکھتی اور بولتی ہے۔ پھر ظاہر ہے اردو کا مستقبل کیا ہوگا؟"

جوشؔ صاحب نے پاکستان میں اردو کا معیار گرنے کی ذمہ داری نصابی کتابوں اور اساتذہ، دونوں کو ٹھہرایا۔ انہوں نے کہا کہ جب استاد ہی غلط بولیں گے تو شاگردوں کو اردو کہاں سے آئے گی۔"

اردو ادب میں جو ایک گھٹن کی سی کیفیت ہے جوشؔ صاحب کو اس کا بھی احساس ہے۔ انہوں نے کہا اس کی وجہ یہ عبوری دور ہے جبکہ پرانی قدریں ابھی کسی حد تک باقی ہیں اور نئی قدروں کا جنم مکمل نہیں ہوا۔ ویسے امید ہے کہ جب زمانے میں ٹھہراؤ پیدا ہوگا اور ذرا مہلت نصیب ہوگی تو یہ گھٹن بھی دور ہو جائے گی۔

جوشؔ صاحب پر ہمیشہ الزام لگایا جاتا رہا ہے کہ وہ عوام کے شاعر نہیں ہیں کیونکہ

عربی فارسی الفاظ سے بوجھل زبان وہ لکھتے ہیں اسے بہت کم لوگ سمجھتے ہیں۔ یہ خیال جب میں نے جوش صاحب پر ظاہر کیا تو کہنے لگے کہ حقیقی شاعری ہمیشہ خواص کی شاعری ہوتی ہے۔ عوام کی شاعری تو یہ ہے۔

"آنا میری جان سنڈے کے سنڈے"

اردو زبان کی ترقی کے سلسلے میں جوش صاحب کا خیال یہ ہے کہ اگر حکومت چاہے تب ہی ایسا ممکن ہے۔ انفرادی کوششوں سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے مثال دی کہ ریڈیو کی نہ صرف زبان غلط ہے بلکہ تلفظ کی بھی بہت غلطیاں ہوتی ہیں اور غیر مانوس الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔

یہاں میں نے انہیں بتایا کہ مجنوں گورکھپوری نے کراچی کی ایک ادبی نشست میں دوسری زبانوں کے الفاظ اردو میں شامل کرنے پر زور دیا تھا بلکہ مثال بھی دی تھی کہ اردو میں لفظ "گھبیر" تو استعمال ہوتا رہا ہے لیکن میں نے "گھبیرتا" بھی استعمال کیا ہے۔ جوش صاحب نے یہ سن کر کہا کہ دوسری زبانوں کے الفاظ ضرور شامل کرنے چاہئیں مگر شرط یہی ہے کہ وہ صوتی اعتبار سے اردو کے مزاج پر پورے اتریں۔ سماعت پر بار ثابت نہ ہوں۔"

زبان و ادب کو جغرافیائی حد بندیوں میں جکڑ دینا جوش صاحب کو پسند نہیں ان کا کہنا ہے کہ جب انگریزی اور بعض دوسری زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں کی عالمی تنظیمیں موجود ہیں تو کیا وجہ ہے کہ برصغیر کے اردو ادیبوں اور شاعروں کی ایک غیر سیاسی تنظیم نہ بنائی جائے اس سلسلے میں کچھ لوگوں کو بیٹھ کر ایک سوال نامہ مرتب کرنا چاہیئے جو برصغیر کے تمام اہم ادیبوں اور شاعروں کو بھیجا جائے اور پھر ان کے جواب کی روشنی میں اس تنظیم کا منشور مرتب کیا جائے۔

جوش صاحب کے بارے میں ایک بات میں نے یہ بھی سن رکھی تھی کہ انہیں کبھی غصہ نہیں آتا ہے۔ جوش صاحب سے اس کی تصدیق کی تو بولے۔

"پہلے میں بہت غصہ ور تھا۔ آتش مزاج آدمی تھا لیکن اب میں نے اپنے اندر کے پٹھان کو مار دیا ہے۔"

جوش صاحب جب یہ بات کہہ رہے تھے تو ان کے صاحبزادے بھی موجود تھے۔ انہوں

نے اپنی رائے ظاہر کی کہ:-

"مارا تو نہیں البتہ وہ خوابیدہ ضرور ہے۔"

جوش صاحب بولے "نہیں صاحب! میں نے اسے مار مار کر ادھ موا کر دیا ہے۔"

"اب بھی وہ کبھی کبھی بیدار ہو جاتا ہے" صاحبزادے نے اطلاع دی جس پر جوش صاحب نے گویا اس کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

"کبھی ایسا ہو بھی جاتا ہے تو بعد میں مجھے بڑی شرمندگی ہوتی ہے، غصہ بڑی بری صفت ہے۔ میں بہت ضبط کرتا ہوں۔ اور اگر مجھے صحیح دلیل نہ ملے تو مارے غصے کے پاگل ہو جاؤں۔ در اصل میرے اندر ایک سرکاری وکیل ہے جو دلائل دے کر مجھے قابو میں رکھتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ مدِ مقابل قابل معافی ہے۔ اگر میرے سر پہ اس کی کھوپڑی ہوتی تو میں بھی یہی کرتا۔"

جوش صاحب کا خیال ہے کہ چنگیز، نادر اور ہلاکو وغیرہ سب ذہنی طور پر بیمار تھے اسی ضمن میں انہوں نے ایک دلچسپ واقعہ بتایا کہنے لگے کہ ایک مرتبہ میں پنڈت نہرو سے ملنے گیا۔ مجھے دیکھتے ہی پنڈت نہرو فوراً اندر چلے گئے۔ مجھے یہ بات بری لگی اور میں واپس ہونے لگا تو دروازے پہ رفیع احمد قدوائی مل گئے۔ انہوں نے جو مجھے غصہ میں بھرا دیکھا۔ تو وجہ پوچھی میں نے کہا:

"جواہر لال سے کہہ دیجئے کہ لیڈری کو لیڈری رکھیں۔ بادشاہی نہ بنائیں۔"

قدوائی صاحب نے مجھے روکنا چاہا۔ لیکن میں چلے جانے پہ مصر تھا۔ اتنے میں جواہر لال آگئے۔ قدوائی صاحب نے ان سے کہا۔

"جوش صاحب کہتے ہیں کہ آپ لیڈری کو بادشاہی نہ بنائیں۔"

یہ سن کر جواہر لال نے بڑے تعجب کا اظہار کیا اور پوچھا کہ آخر میں نے کون سی بادشاہی دکھائی ہے؟ اس پہ میں نے بتایا کہ میرے آنے پہ بغیر صاحب سلامت آپ فوراً اندر چلے گئے۔ کیا یہ بادشاہی قسم کی رعونت نہیں ہے۔"

اس پہ جواہر لال نے میرے کان میں کہا:-

" جوش صاحب معاف کیجئے مجھے باتھ روم جانا تھا اور اگر ایک لمحے اور دیر کرتا تو ذلیل ہو جاتا "

ان کی یہ بات سنتے ہی میرا سارا غصہ کافور ہو گیا۔

پنڈت نہرو کا ایک اور واقعہ انہوں نے سنایا کہ ایک مرتبہ دہلی کے کسی سرکاری دفتر میں جوش صاحب کی اچھی طرح آؤ بھگت نہ ہوئی تو جوش صاحب نے پنڈت نہرو کو بڑا غصے بھرا خط لکھ ڈالا اور ناراض ہو گئے۔

دوسرے دن اندرا گاندھی نے فون کیا کہ چاچا جی آج آپ ہمارے ساتھ چائے پیجیے۔ جوش صاحب نے پوچھا۔

" وہاں جواہر لال تو نہیں ہوگا "

اندرا جی نے اطمینان دلا دیا کہ وہ نہیں ہوں گے۔ لہٰذا جوش صاحب وہاں چلے گئے۔ لیکن پنڈت نہرو وہاں موجود تھے انہوں نے معافی مانگ کر جوش صاحب کا سارا غصہ ٹھنڈا کر دیا۔ حالانکہ جوش صاحب کے آباء اجداد غصہ دلانے والے کو ٹھنڈا کر دینا مناسب سمجھتے تھے۔

جوش صاحب کو اس کا علم ہے کہ عام لوگ ان کا کلام نہیں سمجھتے لیکن وہ کہتے ہیں کہ میں اپنا شعار نہیں بدل سکتا۔ اعلیٰ شاعری سادہ زبان میں نہیں ہو سکتی نہ آسان الفاظ میں فلسفیانہ خیالات بیان کئے جا سکتے ہیں۔

اس موقع پر میں نے نظیر اکبر آبادی کی مثال دی تو جوش صاحب نے جواب دیا:۔

" نظیر کا مزاج ہی ایسا تھا اور زندگی بھی اسی قسم کی تھی۔ جس حالت میں وہ خود تھے اسی کی ترجمانی وہ اپنی شاعری میں بھی کرتے تھے۔

جوش اس وقت برصغیر کے بہت بڑے شاعر ہیں ان سے اختلاف رکھنے والے لوگ بھی ان کی عظمت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔ الفاظ کا جتنا بڑا ذخیرہ انہوں نے استعمال کیا ہے غالباً آج تک کسی اردو شاعر نے استعمال نہ کیا ہوگا۔ وہ تحت اللفظ میں پڑھتے ہیں مگر ماشاءاللہ آواز میں ایسی گرج ہے کہ اسّی کیاسی برس کی عمر میں بھی مشاعرے پر چھا جاتے

ہیں۔ یہ شرف بھی غالباً انہی کو حاصل ہے کہ اب تک ان کے بیس سے زیادہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور اب بھی ڈھیر سا غیر مطبوعہ کلام موجود ہے۔ نثر میں بھی انہوں نے کافی لکھا ہے۔ شعر و ادب کے علاوہ جس شے کا انہیں شوق ہے وہ موسیقی ہے۔ غالباً اسی لگاؤ نے ان کے کلام میں بلا کی موسیقیت بھر دی ہے۔ انہوں نے اپنی سوانح "یادوں کی برات" کے نام سے لکھی ہے جس میں برملا اپنی کہی ان کہی سب لکھ دی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے۔ جوش صاحب کو اتنا زیادہ 'سچ' نہیں بولنا چاہیئے۔

جوش جہاں اپنی ادق زبان کے لئے بدنام ہیں وہاں انہوں نے فلمی گانوں میں نہایت عام زبان استعمال کی ہے اس کے باوجود انہیں ادب کے معیار سے گرنے نہیں دیا ہے ان کے لکھے ہوئے بہت سے فلمی گانے زبردست ہٹ ثابت ہوتے ہیں شعر کے سلسلے میں ان کی رائے ہے کہ شعر خود اپنے آپ کو کہلواتا ہے جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں شعر کہتا ہوں وہ جھوٹ بولتا ہے۔

جوش صاحب کی شادی صرف نو سال کی عمر میں ان کی چچا کی لڑکی سے ہو گئی تھی، کہتے ہیں اگر اس وقت میں باشعور ہوتا تو ایسی غلطی نہ کرتا۔ کیونکہ یہ بیوی بچوں کی زنجیریں آسمان پر اڑنے والے کو زمین سے باندھ لیتی ہیں۔ یہاں جوش صاحب نے یہ شعر پڑھا۔

ہم بھی تمہیں دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکش غم ہستی سے گر ملے

۱۹۷۰ء میں جوش صاحب کی رفیق حیات کا انتقال ہو گیا۔ جب قربت کی یہ زنجیر کٹ گئی تو جوش بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ لیکن ان کے تازہ عشق نے انہیں پھر زندہ کر دیا۔

آج کل کے مشاعرے جوش صاحب کو بے حد ناپسند ہیں ان کا کہنا ہے کہ وہاں بڑی بے ادبی کے مظاہرے ہوتے ہیں۔ مشاعروں میں سامعین کچھ سیکھنے یا حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ محض تفریح کرنے کے لئے اور جی بہلانے کی خاطر آتے ہیں۔ اس رجحان کو بدلنے کے لئے ضروری ہے کہ ادیب اور شاعر ایسے مشاعروں میں شرکت سے انکار کر دیں جہاں

منتظمین سامعین کو قابو میں رکھنے کی ذمے داری نہ لے سکیں۔

جوش بچوں کی طرح بھولے، نوجوانوں کی طرح ضدی اور نو عمر لڑکیوں کی طرح ناز برداریوں کے عادی ہیں۔ انہیں اپنی شاعرانہ عظمت اور علم کا احساس ہے۔ وہ اس منزل سے بھی بہت آگے نکل چکے ہیں۔ جہاں پہنچ کر فردوسی نے کہا تھا کہ رستم تو سیستان کا محض ایک معمولی پہلوان تھا۔ یہ میرے قلم کی طاقت ہے جس نے اسے داستان کا ہیرو بنا دیا۔

میں نے جوش صاحب سے پوچھا کہ اگر آپ کی گراں قدر ادبی خدمات کے صلے میں آپ کو پانچ لاکھ روپے نذر کئے جائیں تو آپ انہیں کس طرح صرف کریں گے۔

جوش صاحب نے جواب دیا

"آدھی رقم اپنے صرف میں لاؤں گا اور بقیہ رقم عوام کی فلاح اور بہبودی کے لئے صرف کروں گا۔" یہ کہہ کر فوراً ہی انہوں نے اپنی صفائی بھی پیش کر دی کہ "نصف رقم بھی اپنے صرف میں محض اس لئے لاؤں گا کہ میرے شانوں پر ایک بہت بڑے کنبے کا بار ہے۔"

اور میں سوچنے لگی کہ کیا برِّ صغیر میں اردو بولنے اور اس سے محبت رکھنے کا دعویٰ کرنے والے کروڑوں لوگ یہ بھی نہیں کر سکتے کہ اردو کے عظیم شعراء اور ادیبوں کو مالی بحران سے نجات دلا دیں۔

جوش صاحب کا سن پیدائش صحیح طور پر کسی کو نہیں معلوم۔ ویسے وہ پلاٹینم جوبلی کے سال سے گزر چکے ہیں۔ سن پیدائش غالباً ۵ دسمبر ۱۸۹۸ء ہے اردو زبان و ادب کے لئے جوش کی جو خدمات ہیں انہیں پیش نظر رکھتے ہوئے ایک شاعر کو اس کی زندگی میں ہی خراج محبت پیش کرنا زندہ قوموں کی نشانی ہوتی ہے۔

ہاں اگر ہم خود کو زندہ قوموں میں شمار کریں تو۔۔۔!

جوش ملیح آبادی

عکسِ فن

آیاتِ صفات کی تلاوت نہ کرو
جوئندگیٔ ذات میں غفلت نہ کرو
لفظ اللہ پردہ ہے، جلوہ نہیں
اِس حرفِ غلافی پہ قناعت نہ کرو

اِس قدر کام نہ لے شدّتِ برنائی سے
رنگ اُڑتا ہے دھنک کا تری انگڑائی سے

گاہ دل اتنی لطافت میں ڈبوتا ہے مجھے
چاندنی کا وزن بھی محسوس ہوتا ہے مجھے

دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا
جب چلی سرد ہوائیں نے تجھے یاد کیا

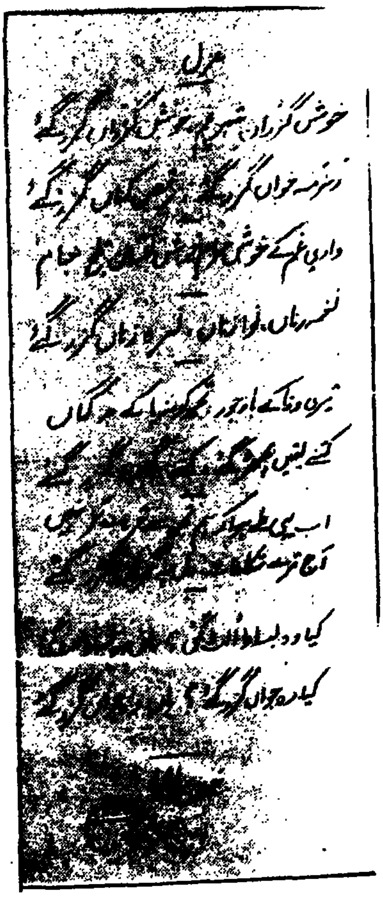
اتنا مانوس ہوں فطرت سے کلی جب چٹکی
جھک کے مَیں نے یہ کہا مجھ سے کچھ ارشاد کیا!

کوئی حد ہی نہیں اِس احترامِ آدمیت کی
بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں

جوؔن ایلیا



پیدائش ۱۹۳۵ء



غزل

خوش گزراں شہرِ غم، خوش گزراں گزر گئے
زمزمہ خواں گزر گئے، رقص کناں گزر گئے

وادیٔ غم کے خوش خرام [illegible] جام
نغمہ زناں، نوا کناں، نعرہ زناں گزر گئے

تیری وفا کے باوجود مجھ کو [illegible] گماں
کتنے یقیں [illegible] گزر گئے

اب یہی طے ہوا [illegible]
آج ترے [illegible]

کیا وہ دلبرانِ [illegible]
کیا وہ جواں گزر گئے [illegible] گزر گئے

؎ چاہ میں ان کی طمانچے کھائے ہیں
دیکھ لو سرخی مرے رخسار کی

ساٹ آٹھ سال کی عمر کے ایک بچے نے جب یہ شعر کہا تو سننے والوں کے دل سے ایک ہوک سی اٹھی اور کیسی تشنہ کامی تھی اور معصومیت کا کتنا بھرپور تاثر تھا۔ اس شعر میں۔

پھر دھیرے دھیرے جانے کس طرح اس کی شخصیت کے گرد جذباتی ناآسودگی کے تانے بانے بنتے چلے گئے۔ اور جب وہ جوان ہوا تو اس کے شعروں میں جہاں فنی طور پہ نکھار آیا وہاں مایوسی اور ویرانی کا تاثر بھی کچھ اور گہرا ہو گیا۔ خاموش خاموش سا، یہ کم سخن شاعر جب دوستوں کے جھگٹے میں ہنستے ہنستے یکایک چپ ہو جاتا ہے اور پھر اچانک متوجہ ہوتا ہے تو یوں لگتا ہے، جیسے اس کی زندگی میں ایک نامعلوم خلا ہے۔ ایک ایسا خلا جسے ایک عام سی شخصیت پر نہیں کر سکتی۔ ایک ایسی ہستی جو اس کی سی سوچ رکھتی ہو۔ جو اس کی لاابالی شخصیت پر اپنی شفقت اور محبت کی چادر تان کر زندگی سے روٹھ کر جانے والے اس شاعر کو نغمۂ حیات کی ابدی راہوں کی طرف لے جائے۔ اور یہ خوابیدہ خوابیدہ سی سوچ رکھنے والا شاعر جو آج ایک بچے کے سے سادہ لہجے میں کہتا ہے۔

؎ مجھ کو عادت ہے روٹھ جانے کی
آپ مجھ کو منا لیا کیجئے

گذشتہ کل کے ارسطو و افلاطون کی سوچ کو اپنانے والا یہ شاعر کون ہے ۔۔۔؟
یہ ان کی اپنی زبانی سنئے۔

جونؔ ایلیا

سخن ور (تذکرہ شعراء)

"میں اپنی ولادت کے تھوڑی دیر بعد چھت کو گھورتے ہوئے عجیب طرح ہنس پڑا تھا جب میری خالاؤں نے یہ دیکھا تو ڈر کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔ کہ آیا یہ انسان ہے یا جن اس بے محل ہنسی کے بعد سے میں آج تک کبھی کھل کر نہیں ہنس سکا"

یہ جونؔ ایلیا ہیں جو امروہہ میں پیدا ہوئے ایلیا ان کے والد مرحوم علامہ شفیق حسن کا تخلص تھا۔ جو انہوں نے اپنا لیا۔ والد مرحوم اردو، عربی، فارسی اور انگریزی کے علاوہ سنسکرت زبان پر بھی کافی دسترس رکھتے تھے۔ علم و ادب کا چرچا گھر میں شدت سے تھا۔ رئیسؔ امروہوی سید محمد تقی محمد عباس اور جونؔ ایلیا نے اس ماحول میں آنکھیں کھولیں۔ جونؔ اس رباعی کا چوتھا اور چہیتا مصرعہ ہیں۔ چنانچہ والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے سات آٹھ سال کی عمر سے ہی اردو زبان میں شاعری شروع کی اور سولہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے عربی اور فارسی زبان میں اتنی دسترس حاصل کر لی کہ گاہے گاہے ان زبانوں میں بھی شعر کہنے لگے یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

لاابالی پن کی شدت کے باوجود جونؔ نے گیارہ سال کی عمر سے لے کر اب تک کا اپنا کلام محفوظ رکھا ہے۔ اشعار سے بھری صرف تین بیاضیں ضائع ہوئی ہیں۔ اکیس سال کی عمر میں انہوں نے فلسفے کے موضوع پر تین حصوں پر مشتمل ایک کتاب لکھی تھی۔ جس کا ایک حصہ فارابی کے ایک رسالے کا ترجمہ تھا۔ دوسرا یونان کے سات فلسفیوں کے افکار و نظریات کی تشریح سے متعلق تھا اور آخری یعنی تیسرا حصہ فلسفے کی اہمیت کے موضوع پر تھا۔ اس کتاب کا نام تھا "سابقات"۔ بدقسمتی سے یہ ساری محنت رئیسؔ امروہوی صاحب کی شیروانی کی جیب میں اڑسی ہوئی دھوبی کے گھر گئی اور گھاٹ میں دھل کر تحلیل ہو گئی۔ ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۸ء تک اسمٰعیلیہ ایسوسی ایشن پاکستان کے شعبۂ تصنیف و تالیف کے نگراں بھی رہے۔ اس سلسلے میں قبل اسلام کے مشرق وسطیٰ کی تہذیبی اور سیاسی تاریخ مرتب کی۔ اور ساتھ ہی باطنی تحریک اور فلسفے پر انگریزی عربی اور فارسی کتابوں کے ترجمے کئے۔

جونؔ نے مجموعی طور پر ۳۵ کتابیں مرتب کی تھیں۔ ان میں فلسفی شاعر ناصر خسرو، دقیق باطنی مفکر حمید الدین کرمانی اور شیخ الرئیس بو علی سینا کے اجزاء اور رسائل کے ترجموں کے

علاوہ رسائل اخوان الصفامیں سے بیس رسالوں کا ترجمہ بھی شامل ہے۔ تصوف پر لکھی ہوئی کتاب "کتاب الطواسین" کا ترجمہ بھی انہوں نے کیا ہے جس کے مصنف منصور حلاج ہیں۔

جون نے اب تک بلا مبالغہ پچاس ہزار شعر کہے ہیں لیکن بقول خود ابھی تک طفلِ مکتب ہیں۔ انہوں نے کہا کہ "میں ایک متعلم ہوں اور میرا جی چاہتا ہے کہ ان لوگوں کا بار بار ذکر کروں جن سے میں نے کچھ سیکھا ہے۔" ان کے محبوب شاعر جمیل ابن معمر، ابوالعلا معری، ابن زیدون، ابن فارض اور عرفی ہیں۔ فلسفۂ فکر میں وہ ہیراکلیٹس، زینو، محمد ذکریا رازی، ہیوم، نطشے اور مارکس سے متاثر ہیں۔ کتابوں میں عہدنامہ عتیق اور حضرت علی کے خطبات کا مجموعہ "نہج البلاغہ" ان کی پسندیدہ ترین کتابیں ہیں۔

۱۹۶۸ء میں جون اردو ڈویلپمنٹ بورڈ سے وابستہ ہوئے۔ جہاں ایک عظیم اردو لغت کی ترتیب و تدوین کا سلسلہ جاری رہا۔ جون کا کہنا ہے کہ اس ادارے میں انہیں زبان و ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اپنے بزرگوں سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا اور علی قطب شاہ اور وجہی سے لے کر موجودہ دور تک کے اردو ادب کا مطالعہ ان کا روزانہ کا معمول بنا۔ اس سلسلے میں وہ ڈاکٹر سبزواری، مولانا نسیم امروہوی اور جناب شان الحق حقی کے بہت معترف ہیں جنہوں نے لغت نویسی کے فن میں ان کی رہنمائی کی۔ ان کا کہنا ہے کہ زند اور پہلوی زبانوں میں مجھے جو کچھ استطاعت نصیب ہے وہ اپنی ارتقائی صورت میں ادارے ہی کے ماحول کا فیضان ہے۔ یہ ماحول میری ادبی زندگی کے لئے میرے گھر کے ماحول ہی کی طرح سازگار ثابت ہوا ہے۔

میں نے پوچھا کہ کیا آپ بھی ہمارے بہت سے شعراء اور ادیبوں کی طرح مغربی ادب سے مرعوب ہیں۔ جواب میں وہ کچھ مسکرائے۔ چند لمحے خاموش رہے اور پھر بولے۔

"اگر کسی فکری و فنی مظہر سے مرعوب ہونا کوئی کارِ ثواب ہے تو پھر اصلی مظہر اور اصلی تخلیق سے متاثر ہونا چاہیئے۔ میں کسی ادعا کے ساتھ تو کچھ کہنے کی جرأت نہیں رکھتا لیکن میرے حقیر ترین مطالعے نے بتایا ہے کہ مغرب کا عظیم ادب مشرق کے سامی ادب کی خوشہ چینی ہے۔ آپ چاہیں تو میں اس سلسلے میں چند اسناد اور شواہد پیش کروں۔

سخن ور۔ (تذکرہ شعراء) جونؔ ایلیا

میں نے کہا۔ بسم اللہ فرمائیں۔

انہوں نے کہا۔

یورپ کو دانتے پر بڑا ناز ہے۔ جس کی ڈوائن کامیڈی (DIVINE COMEY) یوروپی ادب کی بائبل سمجھی جاتی ہے۔ ایسی کسی ماخوذ کتاب کی نسبت سے تخلیقی مصنف ہونے کا دعویٰ کرنا غیر معمولی جرأت چاہتا ہے اور اس جرأت کا ثبوت صرف دانتے ہی پیش کر سکا۔ حالانکہ یہ کتاب از اول تا آخر شیخ محی الدین ابن عربی کی کتاب "فتوحاتِ مکیہ" "کتاب الاسرار" اور نتیجۃ القرآن اور تفسیر کا چربہ ہے۔ یہاں مجھے ابو العلا معرّی کے رسالۃ الغفران کا بھی خیال آیا جو دانتے کا بڑی حد تک اسی طرح ماخذ ہے۔ جس طرح شیخ اکبر کی تصنیفات شیخ کی ترجمان الاشراق بھی' دانتے کی ایک اور تصنیف (CONVLITO) پر بے حد اثر انداز ہوئی ہے۔

دانتے کی نظم ڈوائن کامیڈی کی ہیئت بھی اندلس کے عرب شعراء سے ماخوذ ہے۔ میں ان عرب شعراء سے خاص طور پر مقدم بن معافر' عبادۃ القزاز اور ابن عمیر کا نام لوں گا۔ جنہوں نے موشح' زجل اور عروض البلد نامی اصناف ایجاد کیں۔ ڈوائن کامیڈی کی ہیئت کو بآسانی "عروض البلد" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ دانتے اندلس کے ان ادبی مضامین' خیالات اور اصناف سے پوری طرح واقف تھا اور کہا جاتا ہے کہ وہ عربی جانتا تھا۔ پھر یہ کہ "ابن عربی" ترجمے کے ذریعے اطالیہ پہنچ چکے تھے۔ اس موقع پر مجھے پہلوی زبان کی ایک کتاب یاد آئی' اس کا نام "ارداویراف نامہ" ہے۔ برگزیدۂ برگزیدگان "ارداویراف" برزخ جہنم اور جنت کا سفر کرتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دانتے کا پرگاتوریو (PURGATORIO) ارداویراف کے "ہمیستگان" سے کسی طرح بھی مختلف نہیں ہے۔ مغرب کے دوسرے اکابر شعرا بھی مشرق کے عظیم الشان سرمایۂ ادب "عہد نامہ عتیق" کی خوشہ چینی کے بغیر تیسرے درجے کی شاعری پر بھی قادر نہ ہوتے تھے۔ مشرق کے اس عظیم ادب کی خوشہ چینی کا یہ سلسلہ کم و بیش چھٹی صدی عیسوی سے آج تک جاری ہے"۔

میں نے پوچھا "آپ سماجی فلسفوں میں سے کس کے قائل ہیں؟"

جونؔ ایلیا

بولے "میں اشتراکیت کا قائل ہوں اور اس نظام فکر کا بنیادی شعور میں نے مزدک، غیلان دمشقی اور تحریک قرامطہ کے مفکر حمدانِ قرآمطہ کے افکار و اعمال سے حاصل کیا اور اسی کا درس مجھے اکابر تصوف سے بھی ملا۔

میں نے شعوری اور غیر شعوری طور پر اپنے تتلا کر بولنے کے عہد سے لے کر بکنے اور جھینکنے کے اس دور تک جن لوگوں سے سب سے زیادہ اکتساب فیض اور استفادہ کیا ہے وہ میرے بابا اور بھائی ہیں یعنی رئیسؔ امروہوی اور سید محمد تقیؔ ۔ ان میں سے ہر شخصیت اپنے اپنے شعبوں میں میرے لیے "معلم اول" کی حیثیت رکھتی ہے۔

جونؔ ایلیا ۱۴ دسمبر ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے تراجم کی تعداد دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ اتنی عمر میں جونؔ نے اس قدر کام کیا ہوگا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۷۵ء میں ترقی اردو بورڈ سے علیحدگی کے بعد جون نے خود کو مطالعے اور پھر لکھنے کے لئے وقف کر دیا ہے۔ فلسفے کے موضوع پر عربی سے ترجمہ کر کے مضامین لکھتے ہیں۔ اور تحقیقی کاموں کے پیچھے بے خوابی مول لے لی ہے۔

جونؔ ایلیا

عکسِ فن

جونؔ کرو گے کب تلک اپنا مثالیہ تلاش
اب کئی ہجر ہو چکے، اب کئی سال ہو گئے

کل دوپہر عجیب سی ایک بے دلی رہی
بس تیلیاں جلا کے بجھاتا رہا ہوں مَیں

چبالیں کیوں نہ خود ہی اپنا ڈھانچہ
تمھیں راتب مہیّا کیوں کریں ہم

آپ میں جونؔ ایلیا سوچیے اب دھرا ہے کیا
آپ بھی اب سدھاریئے، آپ کے چارہ گر گئے

میں اب ہر شخص سے اُکتا چکا ہوں
فقط کچھ دوست ہیں اور دوست بھی کیا؟

خود کو دنیا سے مختلف جانا
آ گیا تھا مرے گمان میں کیا

کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے
روز اک چیز ٹوٹ جاتی ہے

حفیظ جالندھری

تصویر کشمیر
شاہنامہ اسلام
تلخابہ شیریں
سوز و ساز
نغمہ زار



پیدائش سنہ ۱۹۰۱ء

تم تو خود ہی آنسو پی پی کر کھانا کھا کر جی تو رہا ہوں
جینا اور کسے کہتے ہیں اچھا خاصا جی تو رہا ہوں
یارو چھیڑے اپنا سینہ اپنے ہاتھوں چاک کیا ہے
سچ کہتے ہو لیکن دیکھو اپنے ہاتھوں سی تو رہا ہوں
خون جگر آنکھوں سے نہ ٹپکا، منہ سے شعلہ بن کر لپکا
سیم و زر سے کھیل رہا تو - شاید کوئی شے پا جاؤ
واگو ذرا میری بھی کرید - کیمیا گر میں بھی تو رہا ہوں

حفیظ

حفیظ جالندھری

۱۹۵۸ء میں حفیظ جالندھری ہندوستان گئے تو وہاں آپ نے ایک محفل میں کہا کہ
"میں سخن شناس لوگوں میں آگیا ہوں۔"

اس بات کا پاکستان میں ردِعمل کچھ اچھا نہیں ہوا۔ لوگ بہت خفا ہوئے۔ لیکن حفیظ کو اس کی کیا پرواہ۔ وہ کہتے ہیں۔ میں نے غلط تو نہیں کہا۔ اسی سوال کا جواب تفصیل سے دیتے ہوئے حفیظ جالندھری نے فرمایا کہ "اردو زبان کی جو شاعری ہندوستان میں ہو رہی ہے۔ وہ یہاں نہیں ہے۔ وہاں اب بھی لوگ محنت کرتے ہیں۔ اچھے شعر کہتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ سخن فہم بھی ہیں۔"

"لیکن ایسا کیوں حفیظ صاحب جی ...!"

وہ مسکرا کر بولے "یہ بھی میں بتاؤں ...؟ کس کو نہیں معلوم کہ ہمارے ہاں صرف سیاست ہے۔ فن نہیں۔ اگر شاعری میں سیاست ڈال دیں تو واہ واہ کے ڈونگرے برسنے لگتے ہیں۔ لیکن بھارت میں سخن کو لوگ سمجھتے ہیں اس لئے سخن ور کہلاتے ہیں۔ میں وہاں چودہ سال بعد گیا اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ جتنے بھی شعراء ہیں وہ ہمارے نوجوان شاعروں سے بہتر شعر کہتے ہیں۔"

"حفیظ جی اس میں قصور ہماری سوسائٹی کا بھی تو ہے۔ وہ ہمارے شعراء اور ادیب کو کیا مرتبہ دیتی ہے؟"

ہاں مجھے اس کا اعتراف ہے۔ حفیظ بولے۔ میرے ملک میں آج کل کیا ہمیشہ ہی، سیاست کا پلہ بھاری رہا ہے۔ جو شاعر اپنی شاعری میں سیاست کا ساتھ دیتا ہے تو اس کی قدر ارباب اقتدار کرتے ہیں اور جو شاعر فن کو پیش کرتا ہے۔ یعنی بلند خیالات کو حسین طریقے سے پیش کرنے والے کی یہاں واقعی کوئی قدر نہیں۔ اور میں نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میں نے کسی بھی حکومت کی کسی بھی دور میں خوشامد کی ہو یا میرے خلاف میری شاعری نے چاپلوسانہ انداز اختیار کیا ہو۔ میں نے تو کہا ہے کہ

”بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں“

اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ میں نے خود کو اپنے کلام کے زور سے منوایا ہے۔“

حفیظ جالندھری ۱۹۰۱ء میں جالندھر میں پیدا ہوئے۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ حفیظ نے اس رنگ کو شدت سے قبول کیا۔ لیکن اپنے جذبوں پہ قدغنیں نہیں لگائیں۔ اور شاعری کے تقاضوں کو بھرپور طریقے سے پورا کیا۔ ایک زمانے میں مشہور گلوکارائیں ان کے کلام کی شیدائی تھیں اور ملکہ پکھراج نے ان کی نظم ”ابھی تو میں جوان ہوں“ گا کر دھوم مچا دی تھی۔ یہی غزل ملکہ پکھراج کی گلوکارہ بیٹی طاہرہ سید نے گائی اور پچھلے چار سالوں میں یہ پاکستان ٹیلیویژن سے بارہا نشر ہوئی۔ لیکن حفیظ کی راہ پھر بھی جداگانہ رہی اسلام سے ان کی بے پناہ محبت کا ایک عکس ”شاہنامہ اسلام“ کے روپ میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ لیکن حفیظ ڈنڈے کے زور پہ اسلام کے نفاذ کے قائل نہیں۔ ”۱۹ء“ سے پاکستان میں نظام مصطفیٰ کی جو تحریک چلی تھی اور اب اس کے نفاذ کے لئے حکومت جو اقدامات کر رہی ہے۔ اس کے بارے میں حفیظ کا کہنا ہے کہ میں نے حکومت کو مشورہ دیا تھا کہ تعلیم کے ذریعے بچوں کے دلوں میں اسلام کی محبت پیدا کی جائے تاکہ یہ بات ان کے ذہن نشین ہو کہ اسلام پر عمل کرنے میں ہمارا فائدہ ہے نہ تو قومی ادب اور نہ ہی اسلامی ادب کے نعرے لگانے سے نہ اسلام کا فائدہ ہوگا نہ ادب کا۔ اسی طرح حفیظ ادب میں ابلاغ کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ حالی اور دیگر شعراء نے شعر کی تعریف

یوں کی ہے کہ اگر شاعر شعر سنائے تو کان کے راستے دل کے نہاں خانوں میں اتر جائے اور اگر شاعر کا شعر پڑھا جائے تو وہ آنکھ کے راستے دل کے نرم گوشوں کو چھولے لیکن اگر شاعری ایسی ہے کہ اس کے معانی اور مفاہیم سمجھنے کے لئے ہم بیٹھے لغت دیکھتے رہیں تو وہ شاعری نہیں دیوانے کی بڑ کہلائے گی۔

حفیظ کلاسیکی روایت کے شاعر ہیں۔ دورِ حاضر کی شاعری میں ٹیکنیک اور ہیئت کے جو نئے تجربے کئے گئے ہیں ان کے بارے میں انہوں نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "جن نئے لوگوں میں شعر کہنے کی صلاحیت موجود ہے وہ نئے زمانے سے متاثر ہو کر ہم سے آگے چل رہے ہیں۔ اب یہ بات کہ ان کا اسلوب فن اور زبان مکمل ہے یا نہیں اس سلسلے میں میں یہی کہوں گا کہ ان کا تاثر ہم سے زیادہ ہے۔ نئے شعراء جس ماحول میں رہتے ہیں وہ اس کی ترجمانی کر رہے ہیں لیکن شعر کہنے کے لئے جس محنت کی ضرورت ہوتی ہے وہ محنت ان سے نہیں ہوتی کیونکہ یہ تیز رفتاری کا زمانہ ہے۔ صنعتی دور ہے۔ سائنس کا دور ہے اور آج کے شاعر کے نزدیک روزگار کا حصول ایک اہم اور بنیادی مسئلہ بن کر رہ گیا ہے۔ پھر وہ شعر پر محنت کریں تو کیونکر۔ چنانچہ ان کے خیالات بہتر ہونے کے باوجود شاعری میں کچے رہ جاتے ہیں۔"

حفیظ جالندھری نے ایک زمانے میں نثر بھی لکھی اور ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ بھی شائع ہوا۔ لیکن نثر حفیظ کے اظہار کا میدان کبھی نہیں رہی۔ ایک زمانے میں رسالہ "ہزار داستان" کے مدیر تھے اس رسالے میں افسانے ہی شائع ہوتے تھے سو حفیظ نے تجرباتی طور پر افسانے لکھنے شروع کر دیئے لیکن ظاہر ہے میلانِ طبع اس راہ پر نہ تھی۔ اسی زمانے میں حفیظ نے نہ صرف اسلام بلکہ دنیا کے علوم کا مطالعہ کر کے بارہ ہزار اشعار پر مشتمل ایک ایسی نظم لکھی جو مسلمانوں کے قلوب میں غیرت پیدا کرے۔ یہ "شاہنامہ اسلام" تھی۔ اس زمانے میں اقبال، محمد علی جوہر اور دوسرے لوگوں نے بھی "اسلام ازم" کو اپنایا تھا۔ اب بھی اسّی سال کی عمر ہونے کے باوجود حفیظ جالندھری کے حوصلے جوان ہیں انہیں فخر ہے کہ انہوں نے کسی کی بھی کاسہ لیسی نہیں کی۔ ہمیشہ خود محنت کی اور اس

محنت کا پھل حاصل کیا۔ تقسیم کے وقت ان کے اٹھارہ عزیز ہندوستان میں قتل کر دیئے گئے تھے۔ باقیوں کو لے کر حفیظ پاکستان آ گئے اور قلم سے محنت کے علاوہ دوسرے کام بھی کئے اور خاندان کی کفالت کی اس محنت نے انہیں کئی جسمانی عذاب دیئے۔ کئی بار ہارٹ اٹیک ہوا۔ اور دوسری بیماریوں نے بھی آن گھیرا لیکن حفیظ نے حوصلہ نہ ہارا اب بھی ان کے پاس ۲۲ کتابیں مکمل ہیں لیکن حفیظ یہ پسند نہیں کرتے کہ ان کی اشاعت کے لئے وہ کسی ادارے یا حکومت کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔ انہیں دکھ ہے کہ آج کے بیشتر شعراء سیاست دانوں کے ہاتھوں تماشا بنے ہوئے ہیں۔ پھر بھی وہ وقت سے مایوس نہیں۔

نئے شعراء میں حفیظ کو امجد اسلام امجد اور منیر نیازی پسند ہیں۔ قاسمی صاحب کی شاعری کو بھی معتبر سمجھتے ہیں۔ فراز کے لئے ان کا کہنا ہے کہ اچھے شعر کہتے ہیں پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ شعر کو سمجھتے ہیں اور سلجھے ہوئے شعر کہتے ہیں لیکن محنت نہیں کرتے۔ نئی نسل کے بہت سے شعراء سے ان کی اچھی امیدیں وابستہ ہیں لیکن وہ اس سلسلے میں ناموں کی فہرست پیش کر کے باقیوں کو ناراض کرنا نہیں چاہتے۔

٭

حفیظؔ جالندھری

عکسِ فن

کوئی صفت نہیں مجھ میں تو پھر کیوں
نمائش گاہ میں لایا گیا ہوں

یارو میں نے اپنا سینہ اپنے ہاتھوں چاک کیا ہے
سچ کہتے ہو لیکن دیکھو، اپنے ہاتھوں سی تو رہا ہوں

مٹی کے پتلے کیا چاہتا ہے
تختِ سکندر یا تختِ دارا

حفیظؔ اہلِ زباں کب مانتے تھے
بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

ذاتِ باری کی قسم، شعر میں تحسینِ بتاں
مَیں جو کرتا ہوں، مری ذات نہیں ہوتی ہے

نہیں کانٹے بھی کیا اُجڑے چمن میں
کوئی روکے مجھے، مَیں جا رہا ہوں

سپردِ خاک ہی کرنا ہے مجھکو
تو پھر کاہے کو نہلایا گیا ہوں

حفیظ ہوشیارپوری



مقامِ غزل

پیدائش ۱۹۱۲ء
وفات ۱۹۷۳ء

حفیظ ہوشیارپوری

۳۱ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو آل انڈیا ریڈیو لاہور میں دو نئے لڑکے ملازم ہوئے ۔ عجیب اتفاق ہے کہ یہ دونوں لڑکے اردو ادب اور شاعری کے افق پر آفتاب اور ماہتاب بن کر چمکے ۔ ان میں ایک تھے مشہور افسانہ نگار مرحوم کرشن چندر اور دوسرے تھے مشہور شاعر اور نثار حفیظ ہوشیارپوری (جو آج ہمارے درمیان نہیں) ۔

پورا نام شیخ عبدالحفیظ سلیم تھا ۔ ۵ جنوری ۱۹۱۲ء کو دیوان پور ضلع جھنگ میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم ہوشیارپور میں حاصل کی ۔ بی ۔ اے اور فلسفے میں ایم ۔ اے لاہور سے کیا ۔ آپ کے نانا شیخ غلام محمد مرحوم عالم تھے اور اردو فارسی کے نہ صرف ہزارہا شعر بلکہ نثر کی کتابیں تک انہیں حفظ تھیں ۔ حفیظ کو ان سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا ۔ ان کے انتقال کے بعد حفیظ نے اپنے بڑے بھائی شیخ عبدالرشید راحل سے استفادہ کیا ۔ انہی کی معیت میں مولانا گرامی کی خدمت میں حاضر ہو کر مستفید ہوئے ۔ ۲۶ مئی ۱۹۲۷ء کو مولانا گرامی کا انتقال ہوا تو حفیظ نے ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ۔

؏ صبا بہ حضرتِ اقبال ایں پیامم دہ
برفتِ جانِ گرامی و تو ہنوز خموش

اس وقت حفیظ کی عمر صرف پندرہ سال تھی ۔ ویسے وہ دس گیارہ سال کی عمر سے اردو اور فارسی میں شعر کہہ رہے تھے ۔ گویا مذکورہ بالا شعر چار سال کی مشقِ سخن کا نتیجہ تھی

طالب علمی کے زمانہ میں وہ تحریکِ آزادی سے بے حد متاثر ہوئے اور اس وقت کے تمام ذہین باشعور اور دیانتدار نوجوانوں کی طرح انہوں نے بھی انگریز سامراج کے خلاف اپنے قلم سے جہاد کیا۔ لاہور کے مشہور مقدمہ سازش کے ملزم جتیندر ناتھ داس کے انتقال پر ایک نظم میں انہوں نے انہیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اور جب حفیظ انٹر میں تھے تو خود طلباء کے ایک جلوس کی رہنمائی کی اور ایک جوشیلی نظم پڑھی۔ جس پر ان کی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو گیا۔ لیکن بزرگوں کا اثر و رسوخ کام آیا اور معاملہ دبا دیا گیا۔ اس طرح برصغیر ایک بڑے انقلابی سے محروم رہ گیا۔

حفیظ جس زمانے میں کالج میں تھے۔ فیض احمد فیضؔ اور ن۔م راشد بھی اسی میں پڑھ رہے تھے۔ سید احمد شاہ بخاری پطرسؔ اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسمؔ ان کے استادوں میں تھے اور انہی استادوں کا فیض تھا جو ہونہار شاگردوں کا شمار پائے کے اہلِ قلم سے ہوا۔

طالب علمی کے زمانے میں حفیظؔ نے انگریزی نثر اور نظم پر بھی توجہ دی۔ یہ پروفیسر ڈکنسن کے فیضان محبت کا اثر تھا۔ ۱۹۴۷ء یعنی پاکستان بننے سے قبل تک حفیظ آل انڈیا ریڈیو لاہور اور بمبئی میں ذمہ دار عہدوں پر فائز رہے۔ تقسیم کے بعد ریڈیو پاکستان نے آپ کے تجربوں سے فائدہ اٹھایا۔ کراچی میں عرصے تک ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل رہ کر بالآخر ریٹائرڈ ہو گئے اور تصنیف و تالیف میں خود کو مصروف کر لیا۔ علم حاصل کرنے کی ان کے دل میں جو لگن تھی اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ قیام بمبئی کے دوران جب حفیظؔ نے قدیم اردو کا مطالعہ کیا اور پتہ چلا کہ ولی دکنی کا تعلق احمد آباد گجرات سے تھا تو انہوں نے گجراتی زبان کا مطالعہ کیا۔ پھر کراچی آکر سندھ زبان، ادب، تاریخ اور ثقافت کا مطالعہ کیا۔ آپ نے مثنویات "ہیر رانجھا" مرتب کی جسے سندھی ادبی بورڈ نے ۱۹۵۷ء میں شائع کیا۔ اسی طرح آپ نے پنجابی ادب کو اردو قالب میں ڈھالنے کا کام بھی کیا۔

حفیظؔ ۱۹۵۳ء میں حکومتِ پاکستان کے ثقافتی وفد کے رکن کی حیثیت سے ایران گئے۔ ۱۹۵۶ء میں بی بی سی لندن کے سمندر پار کے کورس میں شرکت کے لئے انگلستان گئے۔ ۱۹۶۲ء میں کاپی رائٹ آرڈی ننس کا مسودہ تیار کرنے کے لئے جو کمیٹی بنائی گئی ،

حفیظ اس کے رکن تھے۔ اسی طرح ۱۹۶۴ء میں انہوں نے ایران میں آر سی ڈی کلچرل ورکنگ گروپ کے اجلاس میں اور ۱۹۶۵ء میں ترکی میں آر سی ڈی کی نشریات واطلاعات کے اجلاس میں شرکت کی۔

حفیظ کا ابتدائی کلام ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں تلف ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد کا ذخیرہ بھی کافی ہے۔ حفیظ ۱۹۶۵ء میں اسے مرتب کر رہے تھے۔ انہوں نے تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن غزل میں ان کا اسلوب نیا اور مخصوص ہے۔ یہ مشورہ انہیں پروفیسر ڈکنسن نے دیا تھا کہ تم روایتی ترکیبوں سے احتراز کرنا۔ چنانچہ ان کے کلام میں کسی فرسودگی کا احساس نہیں ہوتا۔

اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر محمد باقر نے اپنے قلمی نام نسیم رضوان سے ۱۹۳۷ء میں شعرائے پنجاب کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کی جس میں مولانا غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، ڈاکٹر محمد اقبال، تلوک چند محروم، ظفر علی خاں اور چراغ حسن حسرت وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔ اس میں حفیظ کے بارے میں انہوں نے پیش گوئی کی تھی کہ "حفیظ کا کلام بتا رہا ہے کہ ان کا ذوقِ سلیم کسی نہ کسی دن انہیں صفِ اول کے شعراء میں لا کھڑا کرے گا۔" انہوں نے یہ بھی تبصرہ کیا تھا کہ حفیظ اپنے کلام میں گاہے گاہے ہندی الفاظ استعمال کرنے میں یہ امتزاج بہت پر لطف ہے۔ کیونکہ اشعار کی یہ صورت ہمارے جذبات اور ادراک کو فارسی اور عربی ترکیبوں کی نسبت زیادہ متاثر کرتی ہے۔

تاریخ گوئی میں حفیظ کو ایک منفرد مقام حاصل تھا۔ اس سلسلے میں ان کا نام ناسخ کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ ناسخ بھی اٹھتے بیٹھتے تاریخ کہا کرتے تھے۔ مثلاً گر پڑے یا چوٹ لگ گئی تو علاج بعد میں کیا، پہلے تاریخ کہی

"دست و بازو بشکست"

"ایک مرتبہ چار خط چوری ہو گئے تو انہوں نے فوراً تاریخ نکالی

"صد حیف تلف چہار نامہ"

حفیظ بھی تاریخ اسی آسانی سے نکالتے تھے۔

قائدِ ملت لیاقت علی خاں مرحوم کی تاریخِ وفات اقبالؔ اس مصرعے سے نکالی تھی۔

ع　　ملّا شہید کیا ہے تب و تابِ جاودانہ

ان کا قرآن کا مطالعہ بھی بہت وسیع تھا۔ اس کے لئے انہوں نے قرآن شریف کے مختلف تراجم اکٹھے کئے تھے۔ ان کے ذاتی کتب خانے میں نادر اور کمیاب کتابیں تھیں۔ انہیں دواوین جمع کرنے کا بھی بے حد شوق تھا۔ اپنی آمدنی کا بڑا حصہ کتابوں ا خریداری پر صرف کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دوسرے شعراء کی طرح (جو انگلیوں پر نہیں گنے جا سکتے) نہ ان کے پاس ذاتی مکان تھا نہ اپنی کار۔

حفیظؔ مرحوم ترقیٔ اردو بورڈ کی مجلسِ انتظامیہ کے کئی سال تک رکن رہے۔ لغت ا مجلس ادارت کے رکن کی حیثیت سے اردو لغت کے مسودے کی نظر ثانی کئی سال تک ن رہے۔ لغت کی مجلس ادارت کے رکن کی حیثیت سے اردو لغت کے مسودے کی ظر ثانی کئی سال تک کی۔ ان کا انتقال ۱۰ جنوری ۱۹۷۳ء کو کراچی میں ہوا۔ اس بے حس شہر ں۔ جہاں لوگ زندہ فن کاروں کو بھی نہیں پوچھتے۔ ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۹ء مسلسل سات ل کی خاموشی کے بعد چند پرخلوص اور سرگرمِ عمل نوجوانوں کی کوششوں سے ایک کل پاکستان اعرہ کا اہتمام کیا گیا چنانچہ حفیظ یادگاری کمیٹی کا قیام عمل میں آیا اور آرٹس کونسل آف ستان کے تعاون سے پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد کی صدارت میں یکم فروری ۱۹۷۹ء کی ت ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ لیکن کیا اس طرح ہم نے ایک فن کار کے فن کا حق ادا دیا؟

حفیظؔ صاحب کی روح کو اس کا گلہ نہ ہو کیونکہ انہوں نے زندگی میں بھی کسی سے ا شکوہ نہ کیا اور کہا تو یہ کہ

؎ محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے
تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے

اب وہ نہیں... لیکن ان سے محبت کرنے والے اگر ہیں تو کہاں ہیں؟

حفیظ ہوشیار پوری

عکسِ فن

نہ پوچھ، کیوں مری آنکھوں میں آ گئے آنسو
جو تیرے دل میں ہے، اس بات پر نہیں آئے

دل ڈوبتا جا رہا ہے پیہم
لب ہیں کہ تبسم آشنا ہیں

○

کام آیا نہ خونِ صد منصور
دار کا نخل بے ثمر ہی رہا

خدا دراز کرے عمرِ اہلِ شوق حفیظ
کہ جی رہے ہیں کسی دورِ منتظر کے لئے

کہیں یہ ترکِ محبت کی ابتدا تو نہیں
وہ مجھ کو یاد کبھی اس قدر نہیں آئے

خلش انگیز ہے وہ عالمِ جذب و گریز اب تک
تری اچھی بری ہر بات یوں تو مجھ کو یاد آئی

شان الحق حقی



تارِ پیراہن

پیدائش ۱۹۱۷ء

محبت خارِ دامن بن کے رسوا ہو گئی آخر
یہ اقلیمِ عزیزاں بے زلیخا ہو گئی آخر

شان الحق حقی
۲۶/۱/۱۹۷۹ء

شان الحق حقی

پہلی جنگ عظیم جس سال ختم ہونے کو تھی اسی سال دلی میں شان الحق پیدا ہوئے۔ یعنی ستمبر ۱۹۱۷ء میں۔ ۱۹۳۸ء میں علی گڈھ سے بی۔ اے اور ۱۹۴۰ء میں دلی سے ایم اے کیا شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ ابتدا تک بندی سے ہوئی۔ میٹرک میں پہنچے تو دلی کے مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ باقاعدہ زانوئے ادب کسی کے سامنے تہہ نہیں کیا لیکن محض اس لئے کہ لوگ بے استاد نہ کہیں دلی میں ایک بار علامہ بیخود سے اور ایک مرتبہ علی گڈھ میں احسن مارہروی سے اصلاح لی تھی تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔ دلی کے مشاعروں کا ماحول قدیم اور روایتی تھا۔ اس زمانے میں داغ کے رنگ کا طوطی بولتا تھا۔ علی گڈھ میں شان صاحب کو جو یہ ماحول مہیا تو چار سال وہاں رہے جاں نثار اختر، مجاز، شور علیگ (اس وقت منظور حسین شور علیگ ہوا کرتے تھے) اور علی سردار جعفری وہاں موجود تھے۔ ان کی محفلوں اور صحبتوں میں شریک ہوئے۔ اس طرح روایتی اور جدید شاعری دونوں کا وجدان اور شعور انہیں حاصل ہو گیا۔

شان الحق حقی ڈرامائی شاعری بہت پسند کرتے ہیں۔ جو ان کے خیال میں ہمارے ہاں کم ہے۔ انہوں نے شیکسپیر کی انطونی قلو پطرہ کا منظوم ترجمہ بھی کیا تھا جو ریڈیو سے متعدد بار نشر ہوا اور جستہ جستہ شائع بھی ہوا۔ شان الحق شاعری میں داخلیت کو ضروری سمجھتے ہیں لیکن خارجی شاعری کے مخالف بھی نہیں۔ وسعت نظر کے قائل ہیں اور نہیں

چاہتے کہ شعراء یا ادیب ادبی تعصب خود میں پیدا کریں۔

میں نے انہیں بتایا کہ ایک بار احمد ندیم قاسمی صاحب نے مجھ سے انٹرویو کے دوران ایک سوال کے جواب میں کہا تھا کہ " ترقی پسند تحریک زندہ ہے لیکن تنظیم ختم ہو چکی ہے۔ اس سلسلہ میں آپ کیا فرماتے ہیں۔ حقی صاحب نے جواب میں کہا کہ ۱۹۳۶ء میں جب یہ تحریک چلی تھی تو میں بھی خاصا متاثر ہوا تھا۔ ادب سے دلچسپی رکھنے والے سب لوگوں نے کسی نہ کسی طرح اس کا اثر قبول کیا۔ البتہ بعض لوگوں نے ادب کو محض سیاسی پرچار کا ذریعہ بنایا۔ جدید لکھنے والوں میں سے کوئی ایسا نہیں جو یہ کہہ سکے کہ میں نے ترقی پسند تحریک سے کوئی تاثر نہیں لیا۔ تحریک اب ادبی تاریخ کا ایک باب نہیں بلکہ جزو ادب بن گئی ہے۔ ادب برائے زندگی اس تحریک کا نعرہ تھا۔ جواب اصول بن گیا ہے۔ کوئی ادیب زندگی سے نظریں نہیں چرا سکتا۔ بلکہ ہمارے بہت سے ادیب تو غلو کی حد تک سیاسی شعور کا اظہار کرتے ہیں"۔

اردو کے ادبی پرچوں کی زبوں حالی پر گفتگو ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ انگریزی زبان اس معاملے میں خوش نصیب ہے کہ اسے بین الاقوامی مقبولیت حاصل ہے۔ ہمارے ہاں تعلیم کا تناسب کم ہونے کی وجہ سے رسائل کی اشاعت بھی بہت کم ہے پھر لوگوں کی مالی حالت جتنی بہتر ہوگی رسالوں کی فروخت اسی قدر ہوگی۔ ابھی ہمارے ہاں لوگ کتابیں اور رسالے خرید کر پڑھنے کے عادی نہیں ہوئے۔ تعلیم عام ہونے اور معاشی حالات بدلنے کے بعد یہ عادت پیدا ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ ساری دنیا میں جدید صحافت کا اصول یہ ہے کہ پرچہ سستے داموں بیچا جائے تاکہ اشاعت بڑھے اور کسر اشتہارات سے پوری کی جائے۔ ہمارے ہاں صنعت بھی پسماندہ اور اشتہارات بھی کم ہیں"۔

حقی صاحب دور حاضر کے ادب سے مایوس نہیں کیونکہ اس کساد بازاری میں بھی اچھی چیزیں پڑھنے کو مل جاتی ہیں۔ ویسے ہر ہفتے یا ہر ماہ تو ایک شاہکار تخلیق نہیں ہو سکتا۔ گو پرانے لکھنے والوں کا قلم سست ہو گیا ہے۔ گو نئے لکھنے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ لیکن یہ بھی ایک امر مسلمہ ہے کہ کسی بھی دور اور کسی بھی زبان میں اچھا ادب اتنی فراوانی

سے پیدا نہیں ہوتا جتنی کہ بعض لوگ توقع رکھتے ہیں۔ نئے ادیبوں اور شعراء کی رہنما
سلسلے میں انہوں نے کہا کہ "اچھے ذہن، صنعت اور کاروبار نے اپنی طرف کھینچ لئے
کالجوں اور یونیورسٹیوں کا وہ ماحول نہیں رہا نہ ہی وہ فضا ہے جو علی گڑھ یا دوسر
علمی اداروں میں تھی۔ پہلے عظیم شخصیتوں کے گرد اکتساب علم کی خاطر عقیدت مند و
جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ وہ نہ صرف اپنے محدود حلقے کو متاثر کرتے تھے۔ بلکہ دور دور
ان کی شخصیت کا تاثر تھا۔ آج نظر دوڑایئے تو شاذ ہی کوئی شخصیت ایسی نظر آئے
کے پاس اکتساب علم کے لئے حاضری دی جائے۔ حالانکہ چراغ سے چراغ جلتا ہے
شخصیت سے شخصیتیں بنتی ہیں کیونکہ بڑی شخصیتیں قوم کا سب سے بڑا سرمایہ ہوتی ہیں
قومی نگارخانے میں عظیم شخصیتیں جم ہی جم نظر آتی ہیں"۔ شان الحق ماضی کا ماتم کرنے و
یا مستقبل سے مایوس ہونے والوں میں نہیں۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ "جس تیزی سے دنیا
بڑھ رہی ہے ہم نہیں بڑھ رہے۔ تقسیم کے بعد سے گو غزل نے ترقی کی اور ا
زندگی کی نئی لہر پیدا ہوئی۔ لیکن مجموعی طور پر شاعری نے کوئی بڑی منزل طے نہیں
شان زبان کے ارتقاء میں رکاوٹوں کو شدت سے کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ا
کو ایسے مواقع نہیں دیئے گئے کہ اس کے اسالیب کشادہ ہوتے ہیں۔ اور اعلیٰ
کے ساتھ ساتھ اعلیٰ ادب بھی پیدا ہوتا حالانکہ زبان میں جدید ضروریات ساتھ د
کی پوری صلاحیت موجود تھی۔ اگر قوم کو ترقی کرنا ہے تو۔ ایک ترقی یافتہ زبان
لازمی طور پر پیدا کرنا ہوگی۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ موجودہ اردو سے کتنی مش
یا مختلف ہوگی۔ لیکن غالباً وہ اردو ہی کی ایک شکل ہوگی اور جو شکل بھی ہ
اسے ایک ارتقائی شکل ہی کہا جائے گا۔ یعنی وہ موجودہ زبان سے پسپا نہ ہوگی
وسیع اور جامع ہوگی"۔

شان الحق حقی کا مجموعہ "تار پیراہن" ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ اس پر مجموعہ پر
تبصرے ہند اور پاکستان میں شائع ہوئے غالباً کسی معاصر مجموعے پر نہیں ہوئے۔
رائیں سلمیٰ حقی کے مرتب کردہ "گلدستہ نگارش" میں موجود ہیں جو اپریل ۱۹۶۲ء

شائع کیا گیا تھا۔
شان الحق نے اپنی زندگی کا سب سے قیمتی وقت ترقی اردو بورڈ کو دیا جہاں اردو زبان کی ایک تیرہ ضخیم جلدوں پر مشتمل کلاں لغت تیار کرنے کے لئے کام حقی کی نگرانی میں تیزی سے انجام پایا۔ ۱۹۵۸ء میں اس بورڈ سے وابستہ ہوئے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بنیادی ممبروں میں سے تھے۔ دوسرے ممبروں میں مولوی عبدالحق مرحوم جوش ممتاز حسن مرحوم، ڈاکٹر سید عبداللہ، پیر حسام الدین راشدی، عندلیب شادانی مرحوم تھے۔ ۱۹۵۹ء سے حقی اس بورڈ کے باقاعدہ سکریٹری ہو گئے۔ لیکن اعزازی ایک پیسہ تنخواہ یا معاوضہ کے نام پر انہوں نے کبھی نہیں لیا۔ رجسٹری کی مشقت یعنی ملازمت کی بجا آوری کے بعد جو وقت ان کے پاس ہوتا وہ اسے لغت کی تیاری میں صرف کر دیتے۔ لغت کی تدوین کوئی معمولی کام نہیں۔ کیونکہ یہ تاریخی اصول پر مرتب کی جا رہی ہے مثال کے طور پر لفظ کے لئے اس کے ماخذ کے علاوہ ہر دور سے ایک مثال پیش کرنی ہے۔ تاکہ لفظ کی تاریخ کا تعین ہو جائے کہ یہ لفظ کب کس زبان سے اور کس طرح اردو زبان میں آیا۔ یہ لغت گریٹر آکسفورڈ ڈکشنری کے نمونے پر تیار ہو رہی ہے۔ حقی نے کام کی نوعیت محسوس کر کے اسے قومی سطح پر پھیلایا۔ ملک کے ہر حصے سے لوگوں کو کتابیں پڑھنے پر مامور کیا کوئی ۴ لاکھ کارڈ اسناد اور مثالوں کے تیار کئے۔ اس طرح پنشن یافتہ ادیبوں اور پڑھے لکھے لوگوں کو روزگار کا ایک ذریعہ فراہم ہو گیا۔ حقی اس بورڈ سے ۱۹۷۶ء یعنی سترہ سال تک وابستہ رہے۔ اس وقت تک لغت کی تدوین مکمل ہو چکی تھی۔ جلدیں مرتب تھیں اور طباعت شروع ہو گئی تھی۔ حقی کی کوششوں سے پریس بھی لگ چکا تھا۔ اب اس لغت کی پہلی جلد طبع ہو کر آئی ہے۔ حقی کی شب و روز کی محنت اور لگن سے کیا ہوا یہ ادبی کام تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ لیکن جہاں ایک طرف حقی نے بلا معاوضہ اردو زبان کے لئے اتنی بڑی خدمت انجام دی اور خود کو اس کے لئے وقف کر دیا وہاں دوسری طرف انہوں نے ایک شاعر کے ساتھ بڑی ناانصافی کی۔ یعنی خود اپنے ساتھ۔ یہ نہیں

تھا کہ ۱۹۵۸ء میں تارِ پیراہن کی اشاعت کے بعد سے حقی نے شاعری کو خیرباد کہہ دیا ہو۔ بے شمار غزلیں موجود ہیں۔ ان کی شریکِ حیات سلمیٰ اس سرمائے کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ سلمیٰ آپا نے بڑی کوششیں کرڈالیں لیکن حقی صاحب کو فرصت ہوتی تو شان الحق حقی کا دوسرا مجموعہ تیار ہوتا۔ میں نے ان کی توجہ اس طرف دلاتے ہوئے کہا کہ آپ کے پہلے مجموعے کے بارے میں آپ کے فن کا احاطہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ، جعفر طاہر، ڈاکٹر جمیل جالبی، مشفق خواجہ، وفا راشدی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر صفدر آہ، جوش، ممتاز شیریں، محمد طفیل اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے ساتھ اور بھی بے شمار لوگوں نے اپنی معتبر آراء کا اظہار کیا اور محبتوں کا ثبوت دیا گیا یہ خلوص بھی آپ کو اپنے دوسرے مجموعے کی تیاری کے لئے مجبور نہ کر سکا۔" اس پر مسکراتے ہوئے بولے "میں ان سب سے شرمندہ ہوں لیکن اس میں میری کوتاہی کو کہیں دخل نہیں۔ دراصل میں اردو لغت کی تدوین میں اپنی ذات کو اتنا ملوث کر چکا ہوں کہ اسی ایک کام کی تکمیل کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیا۔ ایک کام کی موجودگی میں دوسرا کام شروع کیا جائے تو آپ خود ہی بتائیں کس کام کے ساتھ دیانتداری برتی جاتی؟ اور میں بددیانت نہیں ہوں۔ جب میں نے باقاعدگی سے بورڈ کا کام سنبھالا تو لغت کے لئے صرف ڈیڑھ کتاب پڑھی گئی تھی۔ یہ تو ایسے ہی ہوا کہ

"سوا من کا لکڑ، اس پہ بیٹھا مکڑ۔ رتی روز روز کھائے گا تو کتنے دنوں میں کھائے گا۔"

لہٰذا میں نے اس کام کو پھیلایا۔ نصف کتابیں خود میں نے پڑھیں اور نتیجے میں دوسرے بہت سے خسارے برداشت کئے۔ ملازمت میں ملنے والی ترقی کی پرواہ نہ کی۔ ایران میں تقرر کیا گیا، تو میں نہیں گیا۔ پہلے میں ڈی ایف پی میں ڈپٹی ڈائرکٹر تھا۔ پھر ٹیلیویژن کارپوریشن میں جنرل منیجر اور کنٹرولر آف سیلز رہا لیکن لغت کی تدوین کا کام میرا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اب میں اپنے افسانوی مجموعے کی اشاعت کی تیاری کر رہا ہوں۔"

آج کل شان الحق ایک اشتہاری ایجنسی سے وابستہ ہیں۔ خدا کرے کہ اب وہ اپنا دوسرا مجموعۂ کلام بھی جلد مرتب کریں۔

شان الحق حقی

عکسِ فن

شعار بن کے نہ رہ جائے بے کلی دل کی
اسی گھڑی میں قیامت کوئی اٹھا کے رہے

ہے وحشتوں کو کون سے موسم کا انتظار
دل جس میں چاک ہوں وہ زمانہ ابھی تو ہے

کسے دیتی ہے دنیا فرصتِ لطفِ نظر حقی
قیامت ہے یہاں دم بھر نظر کا یوں سے یوں ہونا

زہر ہو کر رہ گئی ترکِ محبّت کی قسم
اُس کا وہ کہنا کہ اچھا ہم اسی قابل سہی!

بھلا دو رنج کی باتوں میں کیا ہے!
اِدھر دیکھو مری آنکھوں میں کیا ہے!

پڑ گیا سوزِ سخن ہاتھ ہمارے کیونکر
خاک ہونے کو یہ اکسیر کہاں سے آئی

بہت تاریک دن ہیں پھر بھی دیکھو
اُجالا چاندنی راتوں میں کیا ہے

کچھ نشانِ سحر بھی اے شبِ غم
ہے کہاں تک یہ تنگ و تار گلی!

عبدالعزیز خالد



پیدائش ۱۹۲۷ء

زرداغ دل
کف دریا
برگ خزاں
دشت شام
دکان شیشہ گر
زنجیر رم آہو
سرود رفتہ
سلومی
غزل الغزلات
فارقلیط
کلکِ موج
گل نغمہ
لحن حریر
ماتم یک شہر آرزو
منحمنا
ورق ناخواندہ

عبدالعزیز خالد

۴۳-۱۹۴۲ء میں لاہور سے شائع ہونے والا رسالہ ہمایوں اپنے شباب پر تھا۔ یوسف ظفر ایڈیٹر تھے اس زمانے میں ہر لکھنے والے کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ ہمایوں میں شائع ہو۔ اس لئے اس کے مدیر یوسف ظفر صاحب کا کام بھی دوسرے ایڈیٹروں کے مقابلے میں بہت بڑھا ہوا تھا۔ ایک دن انہیں ایک لفافہ موصول ہوا جس پر جالندھر کی مہر تھی۔ تحریر اجنبی تھی۔ کھول کر دیکھا تو اندر ایک غزل تھی یہ غزل اس نوٹ کے ساتھ واپس کر دی گئی کہ ہمارا رسالہ اردو میں شائع ہوتا ہے۔

یہ لطیف طنز اس لئے کیا گیا تھا کہ غزل پچاس فیصد عربی، چالیس فیصد فارسی اور صرف دس فیصد اردو میں تھی۔ یہ شاعر تھے عبدالعزیز خالد جو ۱۵ جنوری ۱۹۲۷ء کو جالندھر ضلع کے گاؤں برجیاں کلاں میں پیدا ہوئے۔ قریبی قصبے کے ہائی اسکول سے ۱۹۴۴ء میں میٹرک کیا اور فوراً لاہور آ گئے۔ جہاں ۱۹۵۰ء میں معاشیات میں ایم۔ اے کر لیا۔ اسی سال کراچی آ کر انکم ٹیکس کے محکمے میں ملازم ہو گئے۔ اور پھر سنٹرل بورڈ آف ریونیو میں ڈائرکٹر ہو گئے۔

عبدالعزیز خالد پانچویں چھٹی جماعت میں ہی تھے کہ شاعری شروع کر دی تھی۔ اس زمانے کا ایک مصرعہ ہے۔

؎ گناہوں سے مبرا ہو جوانی ہو نہیں سکتا

لیکن اس کے فوراً ہی بعد ان کے کلام پر عربی کا اثر طاری ہوتا چلا گیا۔ اور مذکورہ بالا "ہمایوں" والا واقعہ ہوا۔ لاہور پہنچنے کے بعد البتہ ان کا کلام شائع ہونے لگا زیادہ تر آفاق میں شائع ہوا۔ ہمایوں میں بھی ایک طویل منظوم ڈرامہ شائع ہوا۔ یہ ڈرامہ اب ان کی کتاب "دکان شیشہ گر" میں شامل ہے۔

عبدالعزیز خالد بڑے پرگو ہیں۔ اب تک ۲۲ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۸ء میں "درد اغ دل اور" ماتم ایک شہر آرزو" کے نام سے جو مجموعے شائع ہوئے تھے وہ اب دستیاب نہیں ہیں۔ ان میں سے کچھ چیزیں مسترد کر کے باقی چیزیں دوسرے ترمیم و اضافے کے ساتھ نئے مجموعوں میں شامل کر دی گئی ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں ان کی کتاب "فارقلیط" شائع ہوئی جس پر ۱۹۶۵ء میں آدم جی انعام دیا گیا۔ ان کے مجموعے "مزمور میر مغنی" میں ایک ہی زمین میں بارہ سو تیس اشعار ہیں۔ جن کا مطلع حسب ذیل ہے۔

؎ یہ دَو، یہ تگ و دَو، یہ لَو، یہ جنوں
فما خطبکم ایہا المرسلون

ایک اور شعر ملاحظہ ہو۔

؎ جبیں غیر کے آگے جھکتی نہیں
ہے دنیا گواہ اِنّا مُسلمون

اس کے علاوہ ان کے کئی مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں۔

عبدالعزیز خالد صاحب کا کہنا ہے کہ میری شاعری پر عربی کا اثر اس وجہ سے ہے کہ قرآن اور حدیث ہمارا تہذیبی سرمایہ ہے اسے ہماری زبان میں ضرور شامل ہونا چاہیئے جب تک یہ نہیں کیا جائے گا۔ ہم خلاء میں چکر لگاتے رہیں گے۔ اور مستقبل کی تعمیر نہ کر سکیں گے۔ انہیں شکایت ہے کہ مذہب کو ہم نے صرف عبادات تک محدود کر دیا ہے اور اسے ایک خشک موضوع سمجھ لیا ہے۔ مغرب کے مفکروں کے مقولوں کے ہم آئے دن حوالے دیتے ہیں لیکن یہ سب حدیث میں موجود ہیں۔ اور ہم ان سے استفادہ نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمیں قرآنی تعلیمات کو محور بنا کر اس کے گرد زندگی

کا تانا بانا بننا چاہیئے۔ اصل زندگی تو یہی ہے باقی جو ہے وہ محض اس کا عکس ہے۔ انہیں ہمارے نظام تعلیم سے بڑی شکایت ہے۔ کیونکہ اس میں اگر طالب علم اسکول یا کالج سے ہٹ کر پڑھنا چاہے تو اس کا اسے وقت نہیں ملتا۔

عبدالعزیز خالد کو اپنی قوم سے ایک اور شکایت بھی ہے اور وہ یہ کہ ذوق کے معاملے میں ہم قدامت پسند ہیں۔ ہر نئی چیز کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس لئے شاعری میں جو نئی تشبیہات استعمال ہو رہی ہیں۔ انہیں ہمارے ذوق کا حصہ بننے میں ابھی وقت لگے گا۔ تنقیدی نشستوں کی افادیت کا انہیں احساس ہے کیونکہ اس طرح آدمی اپنی چیز کو دوسرے کی نگاہ سے دیکھ پاتا ہے۔ مگر کہ اپنی مصروفیت کی بناء پر کبھی تنقیدی نشستوں میں شرکت نہیں کرتے۔

عبدالعزیز خالد غزل کے مقابلے میں نظم کے قائل ہیں۔ کیونکہ بقول ان کے زندگی کی پنہائی اسی میں سما سکتی ہے۔ انھوں نے آئن اسٹائن کی کتاب بھی ترجمہ کی تھی۔ لیکن بعد میں یہ ترجمہ ضائع کر دیا۔ ایک زمانے میں انگریزی شاعری کا بھی شوق رہا اور کالج میگزین میں کچھ کلام شائع بھی ہوا۔ مگر پھر سوچا کہ پرائی زبان میں تخلیق کا حق پوری طرح ادا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے یہ خیال چھوڑ دیا۔

عبدالعزیز خالد ایک قابل رشک لائبریری کے مالک ہیں۔ ساری زندگی کتابیں خریدنے اور جمع کرنے کے سوا دوسرا شوق نہیں رہا۔ ۱۸ اپریل ۱۹۵۲ء میں ان کی شادی ہوئی۔ بقول خود گرفتار ہوئے۔

ان کے مطالعہ کا شوق چند گنے چنے موضوعات تک محدود نہیں۔ ہر موضوع پر کتابیں پڑھتے ہیں۔ ان کی کتابیں صرف لائبریری تک محدود نہیں بلکہ گھر کے دوسرے کمروں میں بھی علم کے چراغ روشن کر رہی ہیں۔ گھر کے چھوٹے بڑے سبھی اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ ان کا روز کا معمول ہے کہ دفتر سے کام ختم کرنے کے بعد جب واپسی ہوتی ہے اس کے بعد کھانا کھا کر تھوڑی دیر آرام فرماتے ہیں۔ اور پھر جو مطالعہ شروع ہوتا ہے تو رات گئے تک کتاب اور قلم ہاتھ سے نہیں چھٹتے۔ احباب اور ملاقاتیوں کی تعداد محدود ہے

اس لئے اب تک نہایت اطمینان سے '۲۲' مجموعے تخلیق کئے، جن میں سے دشتِ شام، کفِ دریا، نخلِ نغمہ، زنجیرِ رمِ آہو، بحرِ حریر، غزل الغزلات، فلکِ موج، ورقِ ناخواندہ، سلومی، سرودِ رفتہ، منحمنا، برگِ خزاں، وغیرہ ہیں۔ ان کے علاوہ جو ہیں ان کے ناموں کا اوپر ذکر آچکا ہے۔

ایک خاص بات یہ کہ مشاعرے کے ہنگاموں سے گھبراتے ہیں۔ چنانچہ سوائے چند مخصوص نشستوں یا ایک دو گنے چنے مشاعروں کے علاوہ کبھی شرکت نہیں کی۔ آج کل محکمۂ انکم ٹیکس میں کمشنر ہیں اور لاہور میں تعینات ہیں۔

عبدالعزیز خالد

عکسِ فن

وطنِ پاک میں رسوا ہے زبانِ اُردو
ہے یگانوں کا گلہ، شکوۂ اغیار نہیں

قربتِ حسن میں کم حوصلہ اربابِ ہوس
اپنی ہی سانس کی گرمی سے پگھل جاتے ہیں

قائل نہیں فن برائے فن کا ورنہ
تابع ہیں مرے جملہ انانینِ کلام

جو شاکی آلام ومتاعب ہے وہ شخص
محرم نہیں رازہائے آگاہی کا

عروسِ فن کے سوا اس نگارخانے میں
کسی صنم میں نہیں خصلتِ وفاداری

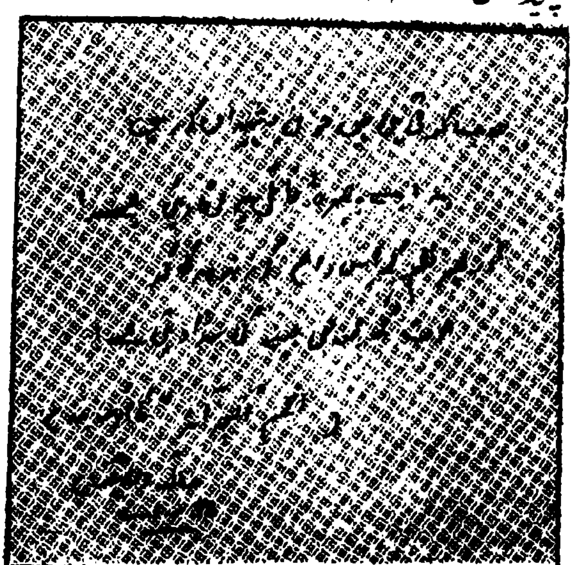
منہ سے نکلی تو ایسے، سیپی سے جیسے موتی
جمہور کی زبان بن، اے آرزوئے معلےٰ

انسان کی سرشت میں ہے الفتِ بت کی
اوجھل ہے نگاہوں سے مقامِ یزداں

خالد علیگ



پیدائش ۱۹۲۵ء



خالد علیگ

۴۰ء اور اس کے بعد ترقی پسند شاعری پر جو شباب آیا تھا اور ایک مخصوص رنگ میں کہنے والے لوگ ابھرے تھے ان میں سے پاکستان کے حصے میں چند ہی لوگ آئے اور وہ بھی تھک کر خاموش ہو گئے لیکن خالد علیگ آج بھی اسی رنگ میں کہہ رہے ہیں۔ ان کی شاعری میں وہی خلوص، شعور، جوش اور ولولہ ہے۔

خالد قائم گنج ضلع فرخ آباد (یوپی) میں ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے علیگڑھ میں تعلیم پائی، خاندان میں کوئی شاعر نہ تھا لیکن علیگڑھ میں انہیں کچھ ایسا ماحول میسر آیا کہ غزلیں کہنے لگے اور جب بنگال میں قحط پڑا اور سارے ترقی پسند شاعروں کو لکھنے کا ایک نیا موضوع ہاتھ آیا تو خالد نے بھی اس پر ایک نظم کہی۔ اس کے بعد انہیں احساس ہو گیا کہ ان کا اصل میدان غزل نہیں بلکہ نظم ہے، نظم کے تقاضوں کو وہ اچھی طرح پورا کر سکتے ہیں۔

۴۷ء میں خالد پاکستان آ گئے چند روز کراچی میں رہے پھر اوکاڑہ چلے گئے ۵۰ء میں سندھ آ گئے اور پی ڈبلیو ڈی کی ملازمت کے سلسلے میں میرپور اور سکھر میں رہے ۵۹ء سے کراچی میں ہیں۔

زمانہ طالب علمی میں وہ چودھری خلیق الزماں کے اخبار "تنویر لکھنؤ" میں خبریں اور مکتوب بھیجا کرتے تھے" امروز کراچی" میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس لئے جب کراچی آئے تو اپنے بارے میں ان پر ایک اور انکشاف ہوا اور وہ یہ کہ ان میں اخبار نویس بننے کی بڑی صلاحیتیں

ہیں، کچھ عرصے بعد فخر ماتری مرحوم نے اخبار نکالا تو یہ اس سے وابستہ ہو گئے اور ایک طویل عرصے تک روزنامہ "حریت" سے وابستہ رہے۔ صحافت کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ ہمارے معاشرے کی طرح ہماری صحافت بھی ایک عبوری دور سے گزر رہی ہے۔ آج ایک اوسط صحافی اتنی محنت نہیں کرتا جتنی وہ بیس سال پہلے کرتا تھا پہلے صحافت وہی اختیار کرتا تھا جس کے سامنے کوئی مقصد یا آدرش ہوتا تھا، جس میں قربانی دینے کا حوصلہ ہوتا تھا۔ آج تو لوگ محض اتفاق سے صحافی بن جاتے ہیں، بینک میں کلرکی نہ ملی اخبار میں سب ایڈیٹری مل گئی اور بس۔

خالد علیگ کا کہنا ہے کہ یہ المیہ محض صحافت کا نہیں ہے بلکہ معاشرے میں ہر جگہ یہی نظر آتا ہے۔ کسی کے سامنے کوئی مقصد نہیں ہے، اجتماعی مقصدیت کا تو سوال ہی نہیں انفرادی طور پر بھی دولت اور اقتدار حاصل کرنے کے سوا کسی کے سامنے کوئی آدرش نہیں ہوتا۔ اس سوال کے جواب میں کہ آپ چونکہ غزل اور نظم دونوں کہتے ہیں اس لئے بتایئے کہ آپ نے دونوں کو اظہار بیان کے ذریعہ کے طور پر کیسا پایا؟ انہوں نے جواب میں کہا کہ نظم لامحدود خیالات کے لامحدود اظہار کا ذریعہ ہے۔ جبکہ غزل ایک رچی بسی ٹھوس روایت کا مطالبہ کرتی ہے غزل میں زندگی کے مسائل کی جانب محض اشارہ کیا جاتا ہے نظم میں ایک موضوع پہ وضاحت سے کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے یہ زیادہ با اثر ہوتی ہے اور اس کا اثر بھی دیرپا ثابت ہوتا ہے خالد علیگ ادبی نشستوں کی افادیت کے قائل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اردو زبان کی ترویج و اشاعت اور شعر و ادب ترقی میں ان نشستوں کا بڑا ہاتھ رہا ہے اور سیاسی سماجی اور تہذیبی شعور پھیلانے میں ان سے بڑی مدد ملی ہے۔ ادب میں حلقہ بندیوں کو بھی وہ مفید سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر ان حلقوں کے ذمہ دار مسابقت کے صحت مند نظریئے اور جذبے کو مدنظر رکھیں تو ادب کو بہت فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔

پاکستان کی تاریخ میں ایک وقت ایسا آیا کہ ہونٹوں پہ پہرے لگ گئے، زبانوں میں قفل ڈال دیئے گئے۔ قلم پیروں میں بیڑیاں پڑ گئیں اس دہشتناک اور بھیانک سناٹے میں صرف ایک آواز گونج رہی تھی اور وہ خالد علیگ کی آواز تھی۔ وہ کہہ رہے تھے۔

کر سکتی نہیں رات اُجالے کو گرفتار
سورج ہے تو پھر صبح کا پیغام تو دے گا

اس کے بعد ان کی نظمیں آئیں "شب ۱۷ نومبر کی"، "گام گام مقتل ہے"، "تین مقتل" وغیرہ بھی بہت مقبول ہوئیں۔

خالد علیگ کو شدت کے ساتھ یہ احساس ہے کہ ہمارے معاشرے میں اچھے اور صحت مند ادب کی تخلیق کے راستے بند کر دیئے گئے ہیں۔ امریکہ سے جو ادب درآمد کیا جا رہا ہے۔ وہ ایک سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ ہے۔ یہ سازش عالمی سطح پر کی گئی ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ترقی پذیر ملکوں میں نئی نسل کے لوگ سنجیدگی کے ساتھ اپنے اور اپنے ملک کے حالات کے بارے میں سوچ بھی نہ سکیں۔ ادیبوں اور خاص کر شاعروں کی نئی نسل گہری داخلیت کا شکار ہو کر رہ گئی ہے اور المیہ یہ ہے کہ یہ داخلیت بھی ان کی اپنی نہیں بلکہ درآمد شدہ ہے۔

خالد علیگ نے اب تک کوئی سو سے زیادہ نظمیں اور دو ڈھائی ہزار قطعے کہے لیکن کوئی بیس نظموں اور دو تین سو قطعوں کے سوا کچھ محفوظ نہیں۔ ان کا کوئی مجموعہ آج تک شائع نہیں ہوا حالانکہ مزدوروں اور جمہوری سیاسی شعور رکھنے والے لوگ ان کی نظموں کی قلمی نقلیں ایک دوسرے کو تحفتاً بھیجتے ہیں۔ خالد علیگ کا کہنا ہے کہ آج تک نہ کسی پبلشر نے ان سے درخواست کی کہ وہ اپنا کلام چھپوانے کے لئے فروخت کر دیں اور نہ وہ خود اس سلسلہ میں کسی کے پاس گئے۔ خالد نثر بھی لکھتے ہیں آٹھ دس افسانے بھی ان کے قلم سے نکلے ہیں لیکن وہ سینت کر رکھ چھوڑے ہیں تاکہ موقع سے نگ لگائے جا سکیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارے معاشرے میں صرف ان ہی چیزوں کی قدر ہے جو سرمایہ دار کو منافع کمانے میں مدد دیں ادب اس سلسلہ میں ان کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا۔ اس لئے ادب کی کوئی قیمت نہیں۔

خالد علیگ دبلے پتلے انسان ہیں، چھوٹے سے مجمع میں بھی شامل ہوں تو ان پر کسی کی نظر نہ پڑے، لیکن جب وہ نظم پڑھنے کھڑے ہوتے ہیں تو بڑے سے بڑے مجمع پر چھا جاتے ہیں اور پڑھنے کے بعد یہ حال ہوتا ہے کہ اگر وہ کہیں تو پورا مجمع ان کے ساتھ ان کی بتائی ہوئی منزل کی طرف چل پڑے۔ خالد علیگ آج کل روزنامہ "مساوات کراچی" سے بحیثیت مدیر وابستہ ہیں۔

خالد علیگ

عکسِ فن

موتی تو نہیں تھے کوئی پلکوں سے جو چنتا
ہم آنکھ سے ٹپکے ہوئے آنسو کی طرح تھے

اک دردِ مشترک کو صدا دی ہے دوستو !
لو ہم نے پھر یہ رسم چلا دی ہے دوستو !

غبارِ راہ سے کہہ دو ہمارے بعد اُٹھے
غبارِ راہ، یہ سن لے کہ کارروان ہیں ہم

اپنے لہو سے پھول کھلانے کے واسطے
ہر مقتلِ وفا میں پکارا گیا ہوں میں

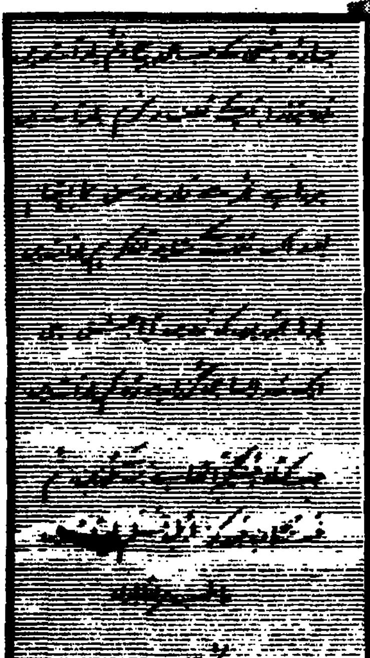
چراغِ راہ گذر بن کے جل رہا ہوں میں
مجھے خبر ہے کہ کارِ پیمبری کیا ہے

راغب مرادآبادی

گلِ صد رنگ
تحریک
ترغیب
مدحتِ خیر البشر



پیدائش ۱۹۲۱ء



راغبؔ مرادآبادی!

۴۹ء یا ۵۰ء کا ذکر ہے چند خواتین کتابوں کے ایک اسٹال پر پہنچیں اور سارد و ڈائجسٹ کا خاص نمبر خریدا۔ ان میں ایک خاتون نے اپنی سہیلیوں سے کہا۔ "اس میں حکیم راغبؔ مرادآبادی کی نظم بڑی اچھی ہے، اس کی وجہ سے یہ نمبر دوبارہ خرید رہی ہوں۔" کتب فروش نے قریب کھڑے ہوئے ایک سوٹیڈ بوٹیڈ نوجوان کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ "ان سے ملئے۔ یہی ہیں حکیم راغبؔ مرادآبادی" خواتین نے اوپر سے نیچے تک انہیں دیکھا اور پھر انہیں حکیم راغبؔ مرادآبادی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگیں۔ "حکیم صاحب کا تو ہمارے ذہن میں یہ حلیہ ہے کہ خوب بھری ہوئی داڑھی ہوگی۔ نیچی شیروانی اور ٹخنوں سے اونچا پائجامہ پہنے ہوں گے۔" ان خواتین کا بھلا کیا قصور؟ ایک تو نام کے ساتھ حکیم شامل اور پھر تخلص میں "غ" کی موجودگی ان کے بارے میں یہی تصور پیدا کرتی ہے۔ راغبؔ صاحب کا اس بارے میں یہ کہنا ہے کہ طبیہ کالج کے باقاعدہ سندیافتہ ہونے کی بنا پہ وہ اپنے نام کے ساتھ حکیم لکھتے تھے۔ بعد میں چھوڑ دیا لیکن احباب اب بھی نام میں اس سابقہ کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ رہ گیا سوٹ تو ایک ذمہ دار سرکاری عہدے پہ فائز ہونے کی بنا پہ اور کچھ اپنے ذوق کی بھی خاطر وہ زیادہ تر مغربی لباس استعمال کرتے ہیں۔

راغبؔ مرادآبادی کا نام سید اصغر حسین ہے ۲۷ر مارچ ۱۹۲۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی جماعتوں کے نصاب میں مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی نظمیں شامل تھیں۔ ان کا حافظہ ایسا بلا کا

تھا کہ دو تین بار پڑھنے کے بعد پوری نظم زبانی یاد ہو جاتی تھی۔ اسکول میں کوئی معائنہ کے لئے آتا تو ہیڈ ماسٹر اس بچے سے نظمیں سنوا کر اپنی کارکردگی کا سرٹیفکیٹ لیا کرتے تھے۔ بعد کی جماعتوں میں دیگر شعراء کا جتنا کلام پڑھا وہ سب بھی انہیں حفظ ہو گیا۔ چوتھی جماعت میں تھے کہ خود چند شعر کہے اور ڈرتے ڈرتے فارسی کے استاد حضرت سیفی نوگاوی کے پاس لے گئے۔ وہ حیران ہو گئے کہ چوتھی کا طالب علم ایسے اشعار کیونکر کہہ سکتا ہے جن کا ہر مصرعہ ناپ تول کا پورا ہو۔ سیفی صاحب نے آزمائش کی خاطر ایک مشکل سا مصرعہ دیا۔ انہوں نے وہیں بیٹھ کر تین چار شعر اس زمین میں کہہ ڈالے جس پر استاد نے پیٹھ ٹھونکی اور پیش گوئی کی کہ یہ بچہ سکہ بند شاعر نکلے گا۔

ان کی مشق سخن جاری رہی۔ گھر والوں کو علم نہ تھا۔ نویں جماعت کے امتحان کا زمانہ تھا۔ والد صاحب نے دیکھا کہ رات زیادہ ہو گئی ہے اور بے چارہ بچہ اب تک پڑھ رہا ہے تو یہ کہنے کے لئے ان کے کمرے میں گئے کہ بیٹا اب سو جاؤ۔ وہاں جا کر دیکھا کہ صاحبزادے نصاب کی کتاب پڑھنے کے بجائے واردات دل قلمبند کرنے میں مصروف ہیں۔ وہ سمجھ دار آدمی تھے ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے بجائے صرف نصیحت کی اور کہا کہ یہ شوق امتحان کے بعد پورا کرنا۔

راغب مراد آبادی صاحب باقاعدہ طور پر تو کسی کے شاگرد نہیں ہوئے لیکن علامہ صفی لکھنوی، مرزا یاس یگانہ چنگیزی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا سید علی اختر حیدرآبادی، ظفر علی خاں اور بعض دوسرے اکابر شعر و ادب سے علمی و فنی مسائل میں کافی استفادہ کیا اور بہت کچھ حاصل کیا۔ بعض دوسرے شعرا کی طرح وہ یہ بات چھپاتے نہیں بلکہ فخر سے کہتے ہیں کہ ان بزرگوں کی کشش بیداری نے ہی مجھے اس خار زار میں دامن بچا کر چلنا سکھایا ہے۔ حقیقۃً فنی تربیت انہوں نے مرزا خادم ہوشیار پوری سے حاصل کی۔ ۱۹۴۲ء میں کربلا کے موضوع پر ایک نظم لکھی اور مرزا یاس یگانہ کو بھیج دی۔ جن سے خط و کتابت کا سلسلہ پہلے ہی سے تھا۔ انہوں نے تین چار مصرعوں میں ترمیم کی اور حاشیہ میں اس کی توجیہات رقم کر کے ایک خط کے ساتھ واپس کیں یہ کاغذات بطور تبرک اب تک ان کے پاس موجود ہیں۔

راغب مراد آبادی اس لحاظ سے بڑے خوش قسمت ہیں کہ انہیں صفی لکھنوی، نوح ناروی

جوش ملیح آبادی، سیماب اکبر آبادی، پنڈت ترببھون ناتھ زار زتشی، بیخود دہلوی، ع
تاجور نجیب آبادی، پنڈت امرناتھ، حسرت موہانی، جگر مراد آبادی، مولانا ظفر علی خاں
سید علی اختر حیدر آبادی، سائل دہلوی، حیدر دہلوی، آثر لکھنوی اور غلام بھیک نیرنگ
جیسے اساتذہ کی صحبت میسر ہوئی۔ راغب مراد آبادی کی طبیعت کی موزونیت کا یہ عالم
کہ ہر وقت اور ہر لمحے شعر کہہ سکتے ہیں۔ ڈھول تاشے بج رہے ہوں۔ ریڈ گلا پھاڑ کر
رہا ہو۔ بچے ادھم مچا رہے ہوں لیکن وہ اس عالم میں بھی شعر کہہ لیتے ہیں اور خوب کہتے
خوبی یہ ہے کہ چلتے پھرتے جو اشعار کہتے ہیں۔ وہ ذہن میں محفوظ رہتے ہیں لیکن جہاں ا
مصرعہ بھی نقل کیا اور وہ ذہن سے یوں گم ہوا۔ جیسے کبھی پرچھائیں بھی نہ پڑی ہو یہی و
کہ انہیں اپنی دس غزلیں بھی بمشکل یاد ہیں۔ اصناف کلام میں رباعی ان کی محبوب ترین صن
ہے ہر چند ایک زمانہ میں بہت غزلیں کہی ہیں۔ وہ یہ مانتے ہیں کہ سیاسی اور سماجی تح
ادب پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ چنانچہ وہ خود بھی خاکسار تحریک اور پھر مسلم لیگ کی تحریک
متاثر ہوئے البتہ ان کے خیال میں پاکستان میں کوئی تحریک ایسی جان دار نہیں چلی جو ادب
متاثر کر سکتی۔

میرے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ فولاد کے کارخانوں اور مکئی
کھیتوں پر ہی کیا منحصر ہے شاعر کا موضوع تو کائنات کا ذرہ ذرہ ہے بقول غالب

"عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے"

ان کے خیال میں ہر موضوع پر کہنے کے لئے گہرے مطالعے اور برسوں کے ریاض کی ض
ہے آج کل کے مشاعروں کے بس میں یہ بات نہیں۔ موجودہ شعرا میں وہ جوش ملیح
سے بہت متاثر ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کاش جوش جرمنی یا برطانیہ میں پیدا ہوتے۔
میں تو مردہ پرستی کا رواج ہے۔ زندگی میں کوئی کسی کو نہیں پوچھتا۔

راغب مراد آبادی غزل، نظم اور دیگر تمام مروجہ اصناف پر قادر ہیں۔ پاکستان
کی موجودہ رفتار سے وہ مطمئن نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد
لکھنے والے اتنی بڑی تعداد میں عروج پر نہیں آئے جتنی تعداد میں آنا چاہئے تھا۔ مع

تصانیف کا فقدان ہے سطحی لٹریچر البتہ تھوک کے بھاؤ دستیاب ہے اور نئی نسل پر اس کے اچھے اثرات مرتب نہیں ہو رہے ہیں ۔ نئے شعراء میں گنتی کے چند لوگ ہیں ۔ جو محنت کرتے رہے تو پائدار شہرت پائیں گے ورنہ نہیں ۔ وہ ادبی، علمی اور مذہبی کتابوں کا مطالعہ باقاعدگی سے کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے ہیں ۔ ان کے شاگردوں میں بعض نے ان کی توجہ سے اچھا خاصہ مقام بنالیا ہے ان میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں ۔ مشہور ترقی پسند شاعر حبیب جالب ان کے بڑے بھائی مشتاق مبارک، بیگم سروری عرفان اللہ، جگدیش بھٹناگر حیات (صاحب دیوان ہیں) احمد فاخر ایم اے ۔ ڈاکٹر شاہد الوری، مشفق خواجہ ۔ بیگم نور الصباح ۔ صابر ظفر سید ظفر اقبال ظفر ۔ رعنا ظفر ۔ خضر دہلوی (جو پہلے حضرت سائل دہلوی کے شاگرد تھے) امجد قریشی، معین الدین حاوی (پہلے سیماب کے شاگرد تھے) عبداللطیف ۔ لطیف (نعتوں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے) نایاب ڈبائیوی (اسکاٹ لینڈ میں مقیم ہیں) علی حمزہ گوہر ۔ سیدہ عثمانی علاوہ ازیں بقاء

۱۹۴۲ء میں راغب کی غزلوں کے سو منتخب اشعار "گلِ صد رنگ" کے نام سے دہلی کے ایک پبلشر نے شائع کئے تھے ۔ ہمارا کشمیر کے نام سے سیاسی نظموں کا مجموعہ ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا ۔ نذر شہدائے کربلا سلام اور اردو فارسی رباعیات کا مجموعہ ہے ۔ "ترغیب" ان کے نثری مضامین پر مشتمل ہے تمام مضامین مسئلہ تحدید آبادی کے موضوع پر ہیں ۔ "تحریک" (تالیف ہے ۔ اس میں مسئلہ کثرتِ آبادی پر منظومات ہیں) "محنت کی ریت" (تالیف ہے ۔ محنت کش اور محنت کے موضوع پر منظومات ہیں) ۔ "مدحتِ خیر البشر" ان کی نعتوں کا مجموعہ ہے ۔ جس میں تمام نعتیں مرزا غالب کی مشہور اردو غزلیات کی زمینوں میں ہیں "مدحِ رسول" ان کی نعتیہ رباعیوں کا مجموعہ عنقریب منصۂ شہود پر آرہا ہے ۔ تمام رباعیاں صنعتِ غیر منقوط میں ہیں ۔ "ہفت آسماں" ان کی رباعیات پر مشتمل ہے یہ بھی جلد منظر عام پر آنے والا ہے ۔ راغب صاحب کی سرپرستی میں مسلسل آٹھ سال تک ایک ماہنامہ "سفینہ" شائع ہوتا رہا جو ہر لحاظ سے ایک معیاری ادبی مجلہ تھا ۔ چونکہ ادبی پرچے اکثر نقصان ہی میں رہتے ہیں ۔ اس لئے یہ سفینہ نذر طوفان ہو گیا ۔ ان کی غزلوں کا ایک انتخاب یگانہ چنگیزی نے اور دوسرا جگر مراد آبادی نے کیا تھا ۔ جگر نے تو تقریظ بھی کی تھی ۔

راغب مرادآبادی کی پہلی شادی ۴۲ء میں ہوئی ۵۸ء میں اہلیہ کا اچانک انتقال ہ
ان کے بطن سے دو صاحبزادے انیس راغب اور نفیس راغب ہیں۔ دوسری شادی ۱۹۶۶ء
ہوئی۔ بیوی کا تعلق دہلی کے ایک معزز گھرانے سے ہے۔ ان کے بطن سے ایک بیٹی آمنہ را
ہے۔ اپنے اشعار میں انہیں یہ مطلع بہت پسند ہے۔

بارہا ساتھ وہ جس راہ سے گزرے
جی بھر آیا کبھی تنہا جو ادھر سے گزرے

راغب حکومت کے محکمہ سماجی بہبود و صحت سے وابستہ ہیں۔

راغبؔ مراد آبادی

عکسِ فن

خلوصِ حد سے گذر کر کبھی کبھی راغبؔ
حریفِ ربطِ دلِ دوستاں بھی ہوتا ہے

جب کوئی چنگیز اُٹھا ہے بن کے طوفانِ ستم
خستگانِ جور کو، اہلِ قلم یاد آئے ہیں

بارہا ساتھ وہ جس راہ گذر سے گزرے
جی بھر آیا کبھی تنہا جو اُدھر سے گزرے

تازہ ہے زخم غریب الوطنی کا راغبؔ
چشمِ خوں بستہ میں ہے آج بھی گھر کی صورت

نذرِ تحصیلِ فن، جوانی کی ہے
برباد بہار زندگانی کی ہے

راغبؔ نظروں میں ہے نصابِ خدوخال
ہم نے اک عمر چہرہ خوانی کی ہے

سیّد آلِ رضا



تغزلِ معلّیٰ

پیدائش ۱۸۹۶ء
وفات ۱۹۷۸ء

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

آلِ رضا

واہ رے یادِ عہد تمنا دل کی سجاوٹ کیا کہیے
باسی پھول میں جیسے خوشبو پھول پہننے والے کی

اس شعر کو جتنی بار پڑھئے ایک نیا لطف حاصل ہوگا۔ پہننے والے کی خوشبو پھول میں بس جانا ایسی خوب صورت بات ہے، جیسے دنیا کی بہترین شاعری سے ملا کر رکھا جائے تو جوڑ معلوم نہیں ہوگا۔ یہ شعر ہے آلِ رضا کا۔ والد محترم جسٹس سید محمد رضا اودھ کے

چیف کورٹ کے پانچ اولین ججوں میں سے تھے۔

سید آلِ رضا۔ ۱۰ر جون ۱۸۹۶ء کو ضلع اناؤ (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ والد منصف تھے جو اس زمانے میں بڑا معزز عہدہ تھا۔ عہد کے دستور کے مطابق پانچویں تک گھر پر تعلیم پائی۔ سیتاپور میں چھٹی جماعت میں سکول میں داخل ہوئے ۱۰ء میں انٹرنس اور ۱۲ء میں انٹر کیا، ۱۶ء میں لکھنؤ سے بی اے کرنے کے بعد ۲۰ء میں وکالت کا امتحان بھی پاس کرلیا۔ اس کے بعد پرتاپ گڑھ میں وکالت شروع کی۔ تعلقہ پریاواں میں ایک طرحی مشاعرہ تھا۔ جس کا مصرعہ تھا۔

"گل ہوگیا چراغ ہمارے مزار کا"

مشاعرے کا انتظام انہوں نے کیا جو ساری خدائی پہ بھاری ٹھہریں۔ رشتے کی نزاکت کا احساس آلِ رضا صاحب کو بھی تھا۔ چنانچہ انہوں نے دو غزلہ کہا۔ مشاعرے میں تہلکہ مچ گیا۔ لیکن یہ خود سمجھتے تھے کہ "من آنم من دانم" ابھی کلام اس قابل نہیں کہ اتنی داد کا

مستحق قرار پائے۔

یہ پرتاپ گڑھ پہنچنے سے پہلے کا واقعہ ہے وہاں پہنچے تو ملنے جلنے والوں میں اکثر شاعر تھے چنانچہ انہیں بھی اسی رنگ میں رنگ جانا پڑا۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب لکھنؤ کا دبستان شاعری اگرچہ اپنے آخری دور میں تھا لیکن شعری ادب کا اس سے بڑا مرکز اس وقت تک ہندوستان میں نہ تھا۔ علامہ آرزو کا طوطی بول رہا تھا۔ آلِ رضا صاحب نے ان ہی کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا۔

عام طور سے جو لوگ فن عروض کے ماہر ہوتے ہیں ان کے کلام کو قبول عام حاصل نہیں ہوتا لیکن یہ اعزاز آرزو لکھنوی کو ہی حاصل تھا کہ وہ اس دور میں فن عروض کے سب سے بڑے ماہر تھے اور ان کا کلام بھی پورے ہندوستان کی ادبی منڈیوں میں ٹکسالی سکے کی طرح چلتا تھا علامہ آرزو کی تربیت نے ان کے فن کو جلا بخشی۔ صفی، عزیز، ثاقب اور بیخود کی صحبت میں رہے۔ ہندوستان کا کوئی مقام ایسا نہ تھا۔ جہاں سے مشاعروں کی دعوتیں وصول نہ ہوتی ہوں لیکن یہ چونکہ کرایہ تک نہ لیتے تھے اس سے بہت کم مشاعروں میں جانا ہوتا تھا۔

آلِ رضا صاحب ادب میں ترقی پسند تحریک کے ایک حد تک قائل تھے اور اسے اس عہد کا تقاضہ سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا۔ کہ مغربی ادب اور مغربی فکر نے لوگوں کے ذہن پر جو اثر ڈالا ہے وہ فطری ہے۔ اسے روکا نہیں جاسکتا۔ لیکن وہ آج بھی کہتے تھے کہ جب ادب برائے زندگی کو اصول مان لیا جائے تو زندگی میں تو قنوطیت اور رجائیت بھی موجود ہے۔ ظاہر ہے ادب میں بھی ان کی جھلک نظر آئے گی۔

شاعری میں ہیئت کے اعتبار سے جو نئے تجربے کئے گئے ہیں۔ ان سے انہیں اتفاق نہیں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ عروض اور زبان کی پابندیاں بڑی ضروری ہیں۔ اگر ان ہی سے دامن چھڑانا ہے تو پھر انسان نثر پہ کیوں نہ قناعت کرے۔

آلِ رضا صاحب کی غزلوں کا ایک مجموعہ "نوائے رضا" ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا تھا۔ جس پر صفی لکھنوی نے فارسی میں منظوم تبصرہ کیا اور لوگوں نے زبان کی سند سمجھ کر سینے سے لگایا۔ ۱۹۴۴ء میں دو تبلیغی مرثیے "شہادت سے پہلے" اور "شہادت کے بعد" شائع ہوئے

آلِ رضا صاحب میر کے بڑے معتقد تھے اور داغ کی زبان کے قائل۔ اس عہد کے شعراء میں عندلیب شادانی کو پسند کرتے تھے۔ ۱۹۶۰ء میں لاہور میں ان کا ایک مرثیہ "عظمتِ انسان" شائع ہوا جس میں بارہ تیرہ ممتاز لوگوں کے تبصرے شامل تھے۔ غزلوں کا دوسرا مجموعہ "غزلِ معلٰی" مکتبہ افکار سے ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔

آلِ رضا صاحب نے ۶۰ء سے غزل کہنا چھوڑ دی تھی۔ صرف مراثی کہہ رہے تھے۔ وجہ پوچھی تو کہنے لگے۔

"غزل کا اپنا ایک جذباتی مزاج ہوتا ہے۔ اس کی عکاسی کئے بغیر غزل کہنے میں مزا نہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ غزل کہہ دی تو خطاب کسے کروں ... سناؤں کسے؟ جوانوں کو سناؤں تو وہ بیٹیوں اور پوتیوں کی برابر ہیں۔ اپنی عمر کی بوڑھیوں کو سناؤں تو بات نہیں بنتی۔ اسی لئے غزل کہنا چھوڑ دی ہے۔" یہ اکتوبر ۶۷ء کی بات ہے۔

پھر کچھ رک کر بولے۔ "لیکن کبھی کبھی کوئی شعر سرزد ہو ہی جاتا ہے مثلاً پرسوں ہی ایک شعر کہا ہے۔ صرف سن لو۔ لکھنا مت۔"

یہ کہہ کر انہوں نے یہ شعر سنایا:

پھر دل میں چبھ رہی ہے بھولی ہوئی کہانی
تپتی ہوئی وہ راتیں، بھیگی ہوئی جوانی

(میں یہ شعر لکھ نہیں رہی ہوں۔ آپ لوگ گواہ رہیئے گا)

آلِ رضا صاحب کا باتیں کرنے کا انداز بہت دلچسپ ہے۔ میں نے پوچھا تھا۔ آج کل کیا شغل ہے تو کہنے لگے۔

"زیادہ جینے کی سزا بھگت رہا ہوں۔ نظر کچھ کمزور ہو گئی ہے۔ دانت نقلی لگائے ہوئے ہوں۔ سماعت البتہ ابھی صحیح ہے مرنے کو جی نہیں چاہتا لیکن مرنا ضرور ہے۔ عجیب بے بسی کا عالم ہے۔"

آلِ رضا صاحب ان دنوں ہائی کورٹ میں پریکٹس کرتے تھے اور قانون کی کتابیں اور ڈان اخبار پڑھتے تھے۔ کھانے کے سلسلے میں کہنے لگے۔

"لکھنؤ کی ڈشیں، مرغ، مچھلی، یاد آتی ہیں۔ پلاؤ بہت پسند ہے بشرطیکہ صحیح دم کیا ہوا ہو۔ بہت پتلی چپاتی اور ماش کی دھوئی دال بھی پسند ہے لیکن شرط یہ کہ دال کا ایک ایک دانہ الگ اور صحیح طور پہ گھی پئے ہو۔"

پھلوں میں آموں کے رسیا تھے اور آم سامنے ہوں تو نہ پرہیز کرتے نہ تکلف۔ پردے کے بارے میں ان کا نظریہ بڑا حقیقت پسندانہ تھا۔ کہتے تھے کہ اصل پردہ اپنی نظر کا ہے۔ نظر نیچی رہنا چاہئے۔ برقعہ ہو یا نہ ہو۔ اپنے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ میں نہ قدامت پسند ہوں نہ ترقی پسند۔ محض اعتدال پسند ہوں۔

یہ باتیں کرتے ہوئے انہوں نے اپنی چند تصویریں مجھے دکھائیں۔ ساری ہی تصویریں آتش کی جوانی کی تھیں۔ "بلا مبالغہ آلِ رضا صاحب شاندار آدمی رہے ہوں گے۔" میں نے دل میں سوچا اور ان کے چہرے پہ نظر ڈالی۔ نیکی، سچائی اور معصومیت تو اب بھی ان کے چہرے کا طواف کر رہی تھی۔ حالانکہ وہ اب زندگی کی ۸۱ ویں منزل میں قدم رکھے ہوئے تھے۔ لیکن زندہ دلی اور شگفتگی ان کے لفظ لفظ سے پھوٹی پڑتی تھی۔ ممکن ہے وہ عام زندگی میں سنجیدگی رہتے ہوں۔ اور ممکن ہے کہ شاید وہ اپنے دورِ گذشتہ کو یاد کرکے اپنے دکھ اور الم کچھ دیر کو بھلا بیٹھے ہوں۔ کیونکہ سید آلِ رضا کو جو مقام ان کے فن کے لحاظ سے ملنا چاہئے تھا وہ انہیں نہیں دیا گیا۔ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ ہم ایک بے حس قوم کے افراد اور مردہ پرست لوگ ہیں۔

اور آج یہ سطور لکھتے ہوئے میں سوچ رہی ہوں کہ اب سے بارہ سال قبل میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ میں نے آلِ رضا صاحب کا انٹرویو شائع کیا تھا اس کے بعد میں نے نظر سے تو کوئی تحریر ایسی نہیں گذری جو ان کی زندگی میں ان پہ لکھی گئی ہو۔ یکم مارچ ۱۹۷۸ء کو سید آلِ رضا اس مکدرہ دنیا سے ہمیشہ کے لئے منہ موڑ گئے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے چھوٹے بھائی سید ہاشم رضا صاحب نے دسمبر ۱۹۷۸ء میں ان پہ ایک مجلہ شائع کیا۔ جس میں ان کا کلام، قطعاتِ تاریخ وفات اور ان کے احباب کے مضامین ہیں۔ اسی کتاب میں سید اقبال عظیم نے اپنے تعارف میں آلِ رضا مرحوم کا ذکر کیا ہے۔ ۲۳ فروری ۱۹۷۹ء کے اخبار "حریت" میں

سید فضل احمد کریم فضلی نے ان پر مضمون لکھا ہے۔ حالانکہ آلِ رضا مرحوم کا صرف ایک مرثیہ" سلام آخر" ہی ناصر جہاں کی آواز میں ان کی شاعری کے تعارف کے لئے کافی ہے جو ہر سال عاشورہ کے دن مجلسِ شامِ غریباں" میں ریڈیو اور ٹی وی سے نشر ہوتا ہے۔ اسی پائے کا ان کا لکھا ہوا ایک اور سلام ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دل کی زینت دردِ حسینی، سر کی زینت ہائے حسینؑ
آنکھ کی زینت خالص آنسو، لب کی زینت ہائے حسینؑ

ضبطِ تشنہ لب کی قسم ہے، بہتے دریا سچ کہنا
اکثر تجھ کو دیکھا ہوگا، اشک کبھی بھر لائے حسینؑ

حکم فرشتے پاتے ہوں گے، دیکھو شان عبادت کی
تاج شہادت پہنا دینا، سجدے میں جب جائے حسینؑ

حق کی حمایت، دل کی طاقت، صبر، قناعت، استغنا
سب کچھ اس کو مل جاتا ہے جس کو رضا مل جائے حسینؑ

سید آل رضا مرحوم نے اپنے آخرت کے لئے کچھ اشعار اس دور میں کہے تھے جسے" دورِ بہاراں" کہتے ہیں۔ بقولِ فضلی صاحب کہ اس جانِ رعنا کی کیا آن بان تھی اس پہ درد بھری آواز اور دل کی گہرائیوں کو چھو لینے والے مترنم لہجہ میں جب یہ کہے کہ ؎

غم کا ہے کا یار و ماتم کیا، بدلو گے نظامِ عالم کیا
مرنا تھا رضا کو مرتا ہے یہ کا ہے کا رونا دھونا ہے

دم اگر آنکھوں میں بھر جائے تو اے شوقِ نگاہ
دیکھ لوں منظر میں اپنی آخری پوشاک کا

اندھیری قبر میں جب داغِ دل چمک اٹھے
ہے کس طرح کا اجالا میرے نئے گھر میں

اب آلِ رضا اس دنیا میں نہیں ہیں۔ لیکن ان کا کلام انہیں ہمیشہ زندہ جاوید رکھے گا۔

سید آلِ رضا

عکسِ فن

کبھی آدمی کی یہ آن تھی کبھی زندگی کی یہ جان تھی
کہ زباں سے جو بھی نکل گیا، نہ رہا وہ قول و قسم سے کم

قبول ہونے نہ ہونے کی کوفت سہتا کون
رضاؔ نے جان بھی کی نذر اک سلام کے ساتھ

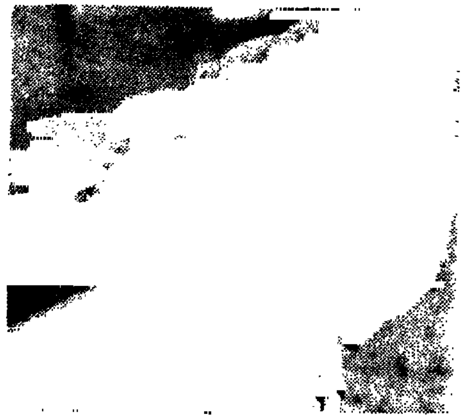
تم وہ تم ہی نہ رہو، بھول سکوں گر تم کو
مَیں وہ مَیں ہی نہ رہوں تم جو کرو یاد مجھے

جاں نثاروں کی ہے فہرست ذرا دیکھ تو لوں
تُو نے ترتیب سے لکھّا ہے مرا نام کہاں

چراغ کتنے نڈر تھے شبِ جوانی کے
ہوا کے رُخ پہ جلے اور رات بھر ٹھہرے!

کیسی بہار کس کے ستارے کہاں کے پھول
جب تم نہیں تو دیدۂ دل میں سمائے کون

رئیس امروہوی



قطعات
الف
حرفِ نے
پسِ غبار

پیدائش ۱۹۱۴ء

ہر سلسلہ کی شہریت سے محروم
ہر شہر میں بے وطن ہیں ہم لوگ

تخمینۂ حوادثہ طوفان کے ساتھ ساتھ
بطن صدف میں وزن گہر کر رہے ہیں ہم

تمہیں شگفتہ دلوں کا خیال ہی تو نہیں
خیال ہو تو کرم کے ہزار ہا پہلو

گردشِ وقت بھی تھک گئی ہے جا کر
تم جہاں چھوڑ گئے تھے میں وہیں ہوں اب تک

رئیس
ستمبر ۱۹۶۷

سنہ ۱۹۱۴ء دو اہم واقعات کے لیے مشہور ہے۔ ایک تو اس سال پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تھی اور دوسرے یوپی ضلع مراد آباد کے ایک قصبے امروہے میں اس ہستی نے جنم لیا تھا جو آج ہند و پاک کے پورے اردو داں حلقے میں رئیس امروہوی کے نام سے جانی اور پہچانی جاتی ہے۔

رئیس صاحب کا اصل نام سید محمد مہدی ہے۔ والد کا نام سید شفیق حسن ایلیا تھا سید نصیر حسن نصیر کے صاحبزادے تھے۔ آپ "داستان غم" دیوان نصیر اور دوسری کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ایسے علمی اور ادبی گھرانے میں آنکھ کھولنے کے بعد رئیس صاحب میں حصولِ علم کی لگن لازمی تھی۔ چنانچہ علوم شرقیہ اور انگریزی کی معقول تعلیم حاصل کی۔ یہ تو ممکن ہی نہ تھا کہ اس ماحول میں کوئی شاعر نہ بنتا۔ رئیس صاحب بھی بن گئے بارہ سال کی عمر میں ان کا شعر ہے کہا گیا ہے کہ

؎ یا تو کچھ میں ہی غلط سمجھا ہوں
یا نئے سر سے بہار آئی ہے

تیرہ چودہ سال کی عمر میں ایک مشاعرے میں غزل پڑھی تو اساتذہ نے ان کے والد کو مبارک باد دی اور بچے کے نہایت ہونہار ہونے کی پیشین گوئی کی۔ رئیس صاحب کو یہ بڑی سہولت ہوئی کہ جہاں بہت سے دوسرے شاعروں کو بچپن میں شعر کہتے

دیکھ کر بزرگوں نے ان کے کان کھینچے وہاں انہیں والد صاحب نے خود اصلاح دینا شروع کی گھر میں سات پشت کا ادبی اور شعری ورثہ موجود تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے چند ہی سال میں بچے کو شاعری کے سارے داؤ پیچ' مشاعرہ لوٹنے کے گر اور اپنا لوہا منوا لینے کے رموز و نکات سکھا کر طاق کر دیا۔

رئیس صاحب کے خاندان کے مزید تعارف کے سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سید سعادت علی جنہوں نے میر کو مشورہ دیا تھا کہ وہ فارسی چھوڑ کر اردو میں شاعری کریں آپ کے بزرگوں میں تھے۔ رئیس صاحب کے دادا کے استاد عبدالرسول نثار خود میر کے شاگرد تھے، نتیجہ یہ کہ آج رئیس صاحب کی قادر الکلامی پکار پکار کر کہتی ہے کہ ان کی مسند کے ڈانڈے خدائے سخن کی کرسی سے ملے ہوئے ہیں۔

رئیس امروہوی پایہ کے شاعر ہی نہیں معرکے کے صحافی بھی ہیں۔ وہ سترہ برس کی عمر میں رسالہ 'حیات' امروہہ کے ایڈیٹر ہو گئے تھے اور ۱۹۳۹ء میں مراد آباد کی صحافت میں چومکھی لڑنے لگے یعنی بیک وقت روزنامہ 'جدت' رسالہ 'مسافر' اور اخبار 'مخبر عالم' کے ایڈیٹر رہے۔ اس کے بعد سے ان کا پیشہ مستقل طور پر صحافت بن گیا۔ اس سے قبل وہ دہلی اور حیدر آباد دکن میں بھی رہ چکے تھے اور وہاں کے مشاعروں میں اپنے نام کے ڈنکے بجوا چکے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں جب ہندوستان کی جنگ آزادی اپنے شباب پر تھی۔ رئیس جیسے ذہین اور باشعور شخص کے لئے اس سے الگ رہنا ناممکن ہو گیا بزرگوں نے ۱۹۳۴ء میں ہی بیڑیاں پاؤں میں ڈال دی تھیں۔ یعنی چچا زاد بہن سے جو ٹھیکرے کی مانگ تھیں۔ ان کی شادی کر دی گئی لیکن یہ بیڑیاں انہیں رقص مستانہ سے باز نہ رکھ سکیں اور وہ ایک سرگرم' جوشیلے اور ممتاز کارکن کی حیثیت سے کانگریس میں شریک ہو گئے۔

۱۹۴۶ء میں رئیس صاحب مراد آباد سے دہلی آ گئے اور روزنامہ 'انصاری' ہفتہ وار 'کہکشاں' اور ماہنامہ 'مشہور' کے ایڈیٹر رہے۔ پاکستان بننے کے بعد کراچی آ گئے اور روزنامہ 'جنگ' کے ایڈیٹر ہو گئے۔ اس سے پہلے دہلی میں اس اخبار کے مدیر ان کے بھائی جناب

سید محمد تقی تھے۔ کراچی میں جنگ تین سال تک رئیس صاحب کی ادارت میں نکلتا رہا اور اب بھی آپ جنگ کے ایک ممتاز سپاہی ہیں۔ یعنی روزانہ باقاعدہ ایک قطعہ لکھتے ہیں اور ہفتہ وار نفسیاتی کالم بھی۔

اس وقت ہندوستان اور پاکستان میں کوئی ایسا شاعر نہیں ہے جس نے رئیس صاحب سے زیادہ شعر کہے ہوں جتنے شعر کہے ان میں سے بیس فی صدی دوسروں کو بخش دیئے کئی شاعروں نے رئیس صاحب کی دوستی کے بل پر خاصی شہرت حاصل کر لی اور صاحب دیوان کہلائے لیکن رئیس صاحب کی مروت آج بھی ان کی پردہ پوشی پر مصر ہے۔

رئیس امروہی کئی لاکھ شعر کہہ چکے ہیں اور اپنے ہم عصروں میں لکھ پتی شاعر کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ ان کے اشعار برصغیر کے تقریباً تمام ہی قابل ذکر اخباروں اور جرائد میں شائع ہوئے۔ ۱۹۶۲ء میں 'ادارۂ ذہن جدید' نے ان کا ایک مختصر مجموعہ 'الف' شائع کیا تھا۔ جس کے دو ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گئے ۱۹۶۹ء میں دوسرا مجموعہ "پس غبار" شائع ہوا۔

رئیس صاحب کا رجحان ہمیشہ ترقی پسند تحریک کی طرف مائل رہا۔ ان کا خیال ہے کہ ترقی پسند تنظیم ختم ہو چکی ہے لیکن تحریک باقی ہے اور خاص کر فکری تحریک موجود ہے۔ تنظیم ختم ہو جانے کا ذمہ دار آپ ان غلطیوں کو ٹھہراتے ہیں جو اس تنظیم کے کرتا دھرتا قسم کے لوگوں سے سرزد ہوئیں۔ آپ کو شکایت ہے کہ آج کے بہت سے بڑے شعراء کے ہاں فنی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ ویسے آپ جوش، فیض اور حفیظ کو آج کے تین بڑے شاعر مانتے ہیں۔ اس ضمن میں رئیس صاحب نے طرحی مشاعروں کی اہمیت پر زور دیا اور کہا یہ فن شاعری سیکھنے کا اسکول تھا جو اب ختم ہوتا جا رہا ہے۔

پچھلے کئی سال سے رئیس صاحب کو ہپناٹزم اور متعلقہ علوم سے دلچسپی پیدا ہوئی چنانچہ آپ نے ان کا تفصیلی مطالعہ کیا اور ان علوم میں ان کے بہت سے شاگرد بن گئے ہیں، آپ کا کہنا ہے کہ یہ عہد ہی ان علوم کا ہے۔ صنعتی تہذیب کے

نتیجے میں جو نفسیاتی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ انہیں انہی علوم کے ذریعہ دور کیا جاسکتا ہے اور نفسیاتی مطالعے سے نوجوانوں کی شخصیات کو بحال کیا جاسکتا ہے۔

اپنی بھاری بھرکم ادبی شخصیت کے باوجود رئیسؔ صاحب نہایت ہلکے پھلکے آدمی ہیں۔ گذشتہ ماہ انہوں نے وزن کرایا تھا اور اگر مشین نے جھوٹ نہ بولا ہو تو وہ صرف ۱۱۴ پونڈ کے ہیں (بہت سی لڑکیوں کا وزن اس سے زیادہ ہوتا ہے۔) کھانے میں رئیس صاحب کو مونگ کی دُھلی دال جس میں پالک کا ساگ ڈالا گیا ہو اور قیمہ پسند ہیں۔ ویسے کوئی اصرار کرے تو کوفتے اور دہی کے رائتے کے ساتھ پلاؤ بھی کھا لیتے ہیں۔

رئیس امروہی بڑے مرنجان مرنج قسم کے آدمی ہیں۔ ان کے سامنے کوئی غلط بات بھی کہے تو وہ اس کی تردید نہیں کرسکیں گے۔ البتہ گھما پھرا کر اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس میں کبھی کبھی کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ ان کا حافظہ بہت اچھا ہے۔ جس سے ایک بار ملاقات ہو جائے اسے برسوں بعد بھی پہچان لیتے ہیں۔ اس سے نقصان یہ ہوتا ہے کہ ایک صاحب آتے ہیں۔ سلام کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں۔

"یاد ہے ۱۹۵۴ء میں سکھر اسٹیشن پر آپ سے ملاقات ہوئی تھی اور ہم نے ساتھ چائے پی تھی؟"

رئیسؔ صاحب کو فوراً یاد آجاتا ہے اور پھر وہ صاحب ان قدیم تعلقات کی دھونس میں سترہ اشعار کا سہرا، اکیس اشعار کا مرثیہ یا ستائیس اشعار کا قصیدہ اسی وقت لکھوا کر لے جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ انکار کرنا رئیسؔ صاحب کی سرشت میں ہی نہیں ہے یہ بھی اچھا ہوا کہ خدا نے انہیں نام کا اور دولت دل دے کر رئیس بنایا۔ اگر صرف دولت کے رئیس ہوتے تو اپنی حاتم جیسی طبیعت کی بنا پہ تھوڑے ہی دنوں میں کنگال ہو کر بیٹھ جاتے۔

رئیس صاحب روزنامہ 'جنگ' میں روزانہ ایک قطعہ اور ہفتہ وار کالم باقاعدگی سے لکھتے ہیں۔

رئیس امروہوی

عکسِ فن

گردشِ وقت بھی آگے مجھے لے جا نہ سکی
تم جہاں چھوڑ گئے تھے میں وہیں ہوں اب تک

رہِ حیات میں کانٹے بکھیرنے والے
حیات بھی ترے در تک برہنہ پا آئی

رہ گئے اشک مری آنکھ میں موتی بن کر
اُن کے دامن میں چمکتے تو ستارے ہوتے

اندھیری رات میں جگنو چمکتے ہیں تو رہ رہ کر
دوپٹے کے ستاروں کا چراغاں یاد آتا ہے

نکھرے وہ زخم تھے جو ابھی تک دبے ہوئے
سلگے وہ داغ تھے جو بظاہر بجھے ہوئے

سنتا ہوں بے گھروں کی بحالی کے واسطے
کاغذ پہ کچھ مکان بنائے گئے تو ہیں

سحر انصاری

نمود



پیدائش ۱۹۳۹ء

ہم نے آدابِ غم کا پاس کیا
نقدِ جاں کو زیاں شناس کیا
عرضِ اظہار بھی ہے پیراہن
ذات کو کس نے بے لباس کیا
کیسے اک لفظ میں بیاں کر دوں
دل کو کس بات نے اداس کیا
کیوں سحر تم نے اپنے گھر آ کر
صبحِ دنیا سے روشناس کیا

سحر انصاری

سحر انصاری

" واہ واہ کیا زمانہ تھا بھئی ۔ سبحان اللہ" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔ سحر انصاری لمحے بھر کو چپ ہو گئے ۔ پھر بولے ۔

" واللہ ۔ اب غور کرتا ہوں تو بڑا عجیب سا لگتا ہے کہ ہمارے بچپن کے دور کی تہذیب اور معاشرت کے لوگ کیسے تھے ۔ یقین کیجئے کہ گھر کی مائیں اور نوکرانیاں مجھے جو کہانیاں زبانی سنایا کرتی تھیں۔ ان کے بارے میں بڑے ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ سب داستان امیر حمزہ اور آرائش محفل کی تھیں ۔ وہ ماحول مجھے یہاں تو کسی گھرانے، کسی شہر میں نظر نہیں آتا۔

بلاشبہ اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلے بچوں کی ابتدائی تعلیم و تربیت گھر ہی گھر میں اتنی پختہ اور صحیح خطوط پر ہوتی تھی کہ کمسنی ہی میں بچوں میں ادبی ذوق اور سخن فہمی کا شعور پیدا ہو جاتا تھا ۔ سحر انصاری بھی ایسے ہی ایک ادب دوست گھرانے میں ۲۷ دسمبر ۱۹۳۹ء کو اورنگ آباد میں پیدا ہوئے ۔ یہ وہی سرزمین ہے جس سے ولی دکنی اور سراج جیسے شعراء کو نسبت رہی ہے ۔ ویسے سحر کا آبائی وطن مراد آباد ہے ۔ بقول سحر ان کے والد صاحب کا فرمانا تھا کہ " شریف کا بچہ پڑھا بھلا یا مرا بھلا "۔ چنانچہ انہوں نے اپنے تمام بچوں کی تعلیم پہ خصوصی توجہ دی ۔ سحر کے بڑے بھائی اخلاق احمد انصاری صاحب کو کتابوں' اور ادبی رسالوں کا اس قدر شوق تھا کہ کوئی کتاب اگر کمیاب ہوتی اور ان کی دسترس سے باہر ہوتی تھی ۔ تو کہیں سے لا کر اسے راتوں رات نقل کر لیتے تھے ۔ ان کے پاس خوبصورت مجلّد

بیاضیں ہوتی تھیں، جن میں وہ اردو فارسی اور انگریزی کے بہترین اشعار مقولے اور نثر کے نمونے لکھا کرتے تھے۔

سحر نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے چاروں طرف کتابیں ہی کتابیں دیکھیں۔ گھر میں تعلیمی تاش کھیلے جاتے، بیت بازی ہوتی۔ الفاظ بنانے اور الفاظ کے معنی بتانے کے مقابلے ہوتے۔ اس طرح بہت بچپن ہی میں انہیں اچھے خاصے الفاظ، اشعار اور مقولے یاد ہو گئے۔

ایک واقعہ سناتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "میں بچپن سے شعر کہہ رہا ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ سقوط حیدر آباد کے بعد جب ہندوستانی فوج کے گورکھا سپاہی اورنگ آباد کی سڑکوں پر سے دندناتے ہوئے گذرے تو لوگ ان سے خوف زدہ ہو گئے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا رنج ہوا۔ پھر مکانوں کی تلاشی شروع ہوئی، کنوؤں اور حوضوں تک میں لوہے کے کانٹے ڈال کر اسلحہ اور رضاکاروں کی وردیاں تلاش کی گئیں اور شہر کی آبادی کا خاصا بڑا حصہ اس تلاش میں ان کا ہاتھ بٹاتا رہا۔ اس وقت پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ دشمنی صرف فرد اور فرد کے درمیان ہی نہیں ہوتی، بلکہ اس کا تعلق اقوام سے بھی ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایک ہی شہر کی آبادی اچانک دو حصوں میں تقسیم ہو کر ایک دوسرے کے خون کی پیاسی ہو سکتی ہے۔ اس صورتحال سے مجھے دلی صدمہ پہنچا اور ان واقعات نے پہلی بار مجھ سے ایک نظم کہلوائی، جو میں نے ڈرتے ڈرتے گھر میں اس وقت سنائی جب گھر کے بزرگ ایک کمرے میں بیٹھے اس وقت کے سیاسی موضوعات پر گفتگو کر رہے تھے۔ عام طور پر یہ گفتگو اس وقت ہوتی تھی، جب ہم اپنے مکان کے ایک انتہائی اندرونی کمرے میں بیٹھ کر بڑی نیچی آواز میں ریڈیو پاکستان سنا کرتے تھے۔ اس زمانے میں پاکستان کی خبریں یا پروگرام سننا قانوناً جرم تھا۔ جب میں نے وہ نظم سنائی تو سب حیران رہ گئے۔ میرے ایک بزرگ نے اسے پسند ضرور کیا لیکن یہ بھی کہا کہ تم بچے ہو باہر جا کر نہ جانے کس کس کو سنا دو لہٰذا اسے میرے پاس رکھوا دو۔ اس کے بعد سے میں اس بات کا عادی ہو گیا، کہ جب کوئی واقعہ مجھے متاثر کرتا تو میں اپنے احساسات اور جذبات کو اشعار کے سانچے میں ڈھال لیتا۔"

سخن ور (تذکرہ شعراء) سحر انصاری

"آپ نے نظم کے علاوہ نثر میں بھی کچھ لکھا؟" اس سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ ابتداء میں کچھ رپورتاژ اور افسانے بھی لکھے جو ہند و پاک کے ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن اب میں تنقید کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔ تنقیدی مضامین کا بھی کوئی نہ کوئی محرک ہوتا ہے نثر لکھنے کے بڑا اپتا مارنا پڑتا ہے اور میں نے خود کو اس جانکاہ مشق کا عادی بنا لیا ہے۔ نثر لکھنے کی عادت اس وقت پڑی جب میں ۱۹۶۱ء میں کراچی کے ایک ہفت روزہ جریدے کا ایڈیٹر تھا۔ گذشتہ دس سال سے میں نثر کی کتابوں کو مختلف اوقات میں لکھتا رہا ہوں۔ ایک کا تعلق غالب سے ہے۔ دوسری کا سرسید احمد خاں سے اور تیسری کا موضوع ہے۔ سائنس اور شاعری۔ لیکن کسی کتاب پر مسلسل کام کرنے کے لئے مسلسل فرصت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور مسلسل فرصت ہم ادیبوں کو کہاں میسر آتی ہے۔

"آپ عام طور پر کس قسم کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں؟"

"مختلف موضوعات کی۔ حسن اتفاق سے میں نے سائنس کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے۔ جس سے مجھے اس عہد کی بہت سی حقیقتوں اور پیچیدگیوں کو سمجھنے یا ان کا اظہار کرنے میں بڑی مدد ملی ہے۔ سائنس کے تمام شعبوں میں مجھے طبعیات سے زیادہ دلچسپی ہے۔ چنانچہ طبعیات، فلسفہ تاریخ کا میں نے خاص طور پر مطالعہ کیا۔ پھر انگریزی ادب میں ایم۔ اے کرنے کی وجہ سے مجھے انگریزی ادب کو تفصیل اور ترتیب سے پڑھنے کا موقع ملا اور خود انگریزی کے ترجموں کے ذریعے میں نے دنیا کی بیشتر زبانوں کا مطالعہ کیا۔ جن میں روسی، جرمن، فرانسیسی اور چینی ادب شامل ہے۔"

جدید شاعری کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے سحر انصاری نے فرمایا کہ شاعری اصل میں تہذیب کی ایک قسم ہے۔ جس کے مطالعے سے ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کوئی شاعر اپنے احساسات خیالات اور الفاظ کے معاملے میں کتنا مہذب ہے (بلاشبہ) موجودہ دور میں اس امر کی طرف کم توجہ دی جا رہی ہے۔ تجربے کی زندگی اور ادب میں بڑی اہمیت ہے۔ نئے تجربوں سے ہی اظہار کے نئے پیرائے اور نئے اسلوب سامنے آتے ہیں۔ لیکن تجربے کو صرف تجربہ بنا دینا اور فن و شاعری کی اعلیٰ سنجیدگی

کو ختم کر دینا کسی طرح مناسب نہیں، جدید شاعری میں ابہام کی حد تک تو معاملہ ٹھیک ہے۔ لیکن جہاں سے ابہام کی حدیں شروع ہوتی ہیں۔ وہاں ٹھہر کر فیصلہ کرنا پڑے گا کہ اب اس کے لئے شاعری کی اصطلاح استعمال کر کے آپ کسی گناہ یا جرم کے مرتکب تو نہیں ہو رہے۔؟

سحر انصاری کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ اگست ۱۹۷۶ء میں 'نمود' کے نام سے شائع ہوا ہے، اس مجموعہ میں سحر نے اپنے بارے میں دیباچہ نام جیسی کسی شے میں کچھ نہیں کہا البتہ اپنی سوچ جوں کی توں پیش کر دی ہے۔ لیکن اس مجموعے کے فلیپ پر فیض احمد فیض کہتے ہیں کہ "سحر کا موضوعِ سخن بیشتر وہ ہزار گونہ عذاب ہے جو ان دنوں جان مجنوں کو ہر لحظہ درپیش رہتا اور وہ ہزار گونہ مظالم جو ان دنوں ہر حساس اور با ضمیر ذات پہ توڑے جاتے ہیں ان سب کا مرکزی نقطہ میری سمجھ میں بیگانگی اور چپقلش کا وہ مرکب ہے جسے انگریزی زبان میں ALIENATION کہتے ہیں۔ یا وہ کرب اور نا آسودگی جو اس کیفیت سے پیدا ہوتے ہیں یہ خون خرابہ خود اپنی ذات سے بھی کیا جاتا ہے۔ عقائد اور روایات سے بھی اپنے معاشرے اور اس کے چلن سے بھی۔ اس موضوع کا کچھ نہ کچھ سطحی بیان تو قریب قریب آج کل کے سبھی شعراء میں ملتا ہے۔ لیکن جس سنجیدگی اور غور و فکر سے اس کا بیان سحر کے کلام میں ہوا ہے۔ اس سے ن۔ م۔ راشد اور مصطفیٰ زیدی کی یاد آتی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ سحر کے کلام میں ابہام یا ابہام کی کوئی آمیزش نہیں اور دوسرے زندگی کے روز مرہ مظاہر سے پل ہو یا سڑک شفاخانہ ہو یا تجربہ گاہ کسی ذہنی یا جذباتی تجربہ کی تجرید اور کشید کے بعد جس طرح سحر انہیں نظم کرتے ہیں وہ انہی سے مخصوص ہے۔ اب تو خیر نہیں ہے کہ "سحر صرف زندگی کے منفی پہلوؤں پہ نظر رکھتے ہیں۔ تاہم مجھے شکایت ہے کہ بت شکنی کے کرب کو شاید بت گری کی لذت پر اتنا غالب نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن یہ تو اپنے اپنے مزاج کی بات ہے"۔

سحر انصاری جامعہ کراچی میں شعبہ اردو سے وابستہ ہیں اور تدریس علم کے ساتھ تخلیق فن میں بھی بڑی سرگرمی سے مصروف عمل ہیں۔

سحر انصاری

عکسِ فن

کیا خبر تھی ترے انداز گریز   صرف ملنے کے بہانے ہوں گے

مرے لہو کو مری خاکِ ناگزیر کو دیکھ
یونہی سلیقۂ عرضِ ہنر نہیں آیا

گیا وہ دورِ غمِ انتظارِ یار سحر
اور اپنی ذات پہ دانستہ زحمتیں بھی گئیں

اب نہ ملے گا کسی بزم میں وہ جانِ بزم
راہ میں وہ شہسوار اب نہ کبھی آئے گا

تجھ کو معلوم ہے اس دور کے حسّاس وجود
دیکھتے دیکھتے بن جاتے ہیں کیسے پتھر

اے مہرِ تابناک تری روشنی کی خیر
کچھ لوگ زیرِ سایۂ دیوار جل گئے

سرور بارہ بنکوی



سنگِ آفتاب

پیدائش سنہ ۱۹۳۱ء

یہی نہیں کہ مرا دل ہی میرے بس میں نہ تھا
جو تو ملا تو میں خود اپنی دسترس میں نہ تھا

بہ نامِ عہدِ رفاقت بھی ہمقدم نہ ہوا
یہ حوصلہ مرے محرم ہمنفس میں نہ تھا

نہ جانے قافلۂ اہلِ دل پہ کیا گذری
یہ اضطراب کبھی نالۂ جرس میں نہ تھا

خبر تو ہوگی تجھے تیرے جاں نثاروں میں
کوئی تو تھا سرِ مقتل جو پیش و پس میں نہ تھا

سرور بارہ بنکوی

سرورؔ بارہ بنکوی

سرورؔ ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان میں کوئی شاعر نہ تھا۔ بلکہ دادا تو اس کے سخت خلاف تھے لیکن قدم قدم پہ بٹھائے گئے سارے پہروں کے باوجود سرورؔ شاعر ہو کر رہے۔ پہلی غزل پہ اپنے فارسی کے استاد سے اصلاح لی اور اسکول کے مشاعرے میں پڑھی۔ اس طرح بارہ بنکی کے اس زمیندار گھرانے میں پہلے شاعر نے ۱۹۳۱ء میں جنم لیا۔

سرورؔ نے لکھنؤ میں تعلیم پائی۔ خالہ کی لڑکی بچپن سے ہی مانگ تھی۔ اسی سے شادی ہو گئی۔ ہندوستان ہی میں تھے کہ ۱۹۵۱ء میں ایک مشاعرے کے سلسلے میں ڈھاکہ گئے (سابق مشرقی پاکستان حال بنگلہ دیش) ۱۹۵۴ء میں ۲۴؍ اگست کے مشاعرے میں دوبارہ ڈھاکہ گئے اور وہیں کے ہو رہے۔ انجمن ترقی اردو میں ملازمت بھی مل گئی۔ ۱۹۶۳ء تک یہ ملازمت جاری رہی۔ یوں تو فلموں کے لئے ۱۹۵۹ء سے ہی لکھنے لگے تھے لیکن ۱۹۶۳ء سے پورے طور پہ فلمی صنعت سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۶۵ء میں انہوں نے اپنی ذاتی فلم "آخری اسٹیشن" بنائی جس کی کہانی صف اول کی ادیبہ ہاجرہ مسرور نے لکھی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۶۷ء میں انہوں نے "تم میرے ہو" بنائی اس کے بعد "ندیا دصیرے بہو" بنائی۔ سرورؔ کو اس کی شکایت ہے کہ جس طرح ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں حکومت اچھی فلمیں بنانے والوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ اس طرح ہمارے ہاں کوئی روایت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں "ہیرا موتی" جیسی فلمیں بنانے کی کوئی جرأت نہیں کرتا۔ انہوں نے کہا معیاری فلموں کی حوصلہ افزائی نہ عوام

کرتے ہیں نہ حکومت۔ عوام کا مذاق کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ سنجیدہ فلموں کے بجائے ناچ گانے کی طرف زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ پاکستان میں فلموں کا معیار بلند کرنے کے سلسلے میں ان کی رائے ہے کہ جو معیاری فلمیں باکس آفس پر پوری نہ اتریں ان پر حکومت تفریحی ٹیکس معاف کر دے اور انعامی رقم دے کر نقصان پورا کر دے۔ صرف اسی طرح اچھی فلمیں بنانے کی ترغیب دلائی جا سکتی ہے۔

سرور کے خیال میں عوامی تحریکوں کے فقدان میں، قسم کے شعراء نوجوان کی ایک فوج پیدا کر دی ہے۔ یہ نوجوان شعراء اپنے آپ کو اس عہد کی نئی شاعری کا نقیب کہتے ہیں لیکن یہ نئی شاعری نام ہے اس پریشان خیالی کا۔ جو کم علمی کی پیداوار ہے' دنیا کے کسی ملک اور کسی زبان میں جدید شعر و ادب کی بنیاد قدیم اور کلاسیکل شعر و ادب پر ہی رکھی جاتی ہے اور جو لوگ اپنے شعر و ادب کے پورے ورثے سے واقف ہوتے ہیں اور اس کے سارے ارتقائی مدارج ان کی نظروں کے آگے ہوتے ہیں انہیں کو جدید شعر و ادب کے علمبردار ہونے کا حق پہنچتا ہے انہوں نے جدید آرٹ کی مثال دی اور کہا کہ آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کر کینوس پہ ایک چیستان ترتیب آسان سمجھ کر آج جسے دیکھئے وہ ماڈرن آرٹ کے پیچھے پڑا ہوا ہے لیکن پکاسو کا یہ قول فنون لطیفہ کی تاریخ میں آب زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ جدید آرٹ کا حق صرف ان مصوروں کو پہنچتا ہے جو روایتی آرٹ سے پوری طرح واقف ہوں۔

سرور شاعری میں قدیم علامتوں کے استعمال کو اس لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ موجودہ شاعری بھی روایت ہی کے سہارے آگے بڑھی ہے۔ البتہ انہیں اس کا اعتراف ہے کہ بعض موجودہ شعراء نے پرانی علامتوں کو نئے معنی بخشے ہیں۔ انہوں نے باقاعدہ اصلاح کسی سے نہیں لی البتہ بقول خود جگر سے فیض حاصل کیا ہے۔ سرور کے کلام کا ایک مجموعہ "سنگ آفتاب" جنوری ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ غزلوں کے علاوہ انہوں نے نظمیں بھی کہی ہیں۔ دوسرے شعراء کے برخلاف انہوں نے اپنا ایک ایک مصرعہ سنبھال کر رکھا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ زندگی میں وہ کسی بے ترتیبی یا بے قاعدگی کے قائل نہیں ہیں۔ انہیں قدیم اساتذہ میں غالب اور نظیر پسند ہیں اور موجودہ شعراء میں رگھوپتی سہائے فراق اور فیض احمد فیض کو سب سے بڑا مانتے ہیں۔ فلم کی ٹیکنک کے علاوہ

شعر و تنقید کی کتابیں ان کے مطالعے میں رہتی ہیں ۔

سرور ان چند جیالوں میں سے ہیں جنہوں نے یوپی اور بہار میں اردو کا چراغ روشن رکھا تھا ۔ لیکن لسانی منافرت نے لکھنے لکھانے کی امنگوں کو سرد کر رکھا تھا ۔ چنانچہ ۱۹۷۰ء ناسازگار حالات کی وجہ سے یہ کراچی منتقل ہو گئے ۔

شاعری کے متعلق سرور کا کہنا ہے کہ شاعر کو اپنی ذات کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی ترجمانی ایسے فنکارانہ انداز میں کرنی ہے جس سے آنے والی نسلوں کو جینے کا حوصلہ ملے جو انہیں ان کے مسائل اور دکھ درد کا مقابلہ کرنے، ان پر فتحیاب ہو کر زندگی کو حسین سے حسین تر بنانے کی ترغیب دے ۔ اس معیار پر جو بھی تحریک یا تجربہ پورا نہیں اترتا اسے زندگی سے فرار اور جمہوری نظریات کے فروغ میں سدِّ راہ تصور کرتے ہیں ۔

جس طرح خود سرور بیک وقت جگر، جوش اور فیض سے متاثر نظر آتے ہیں لیکن پھر بھی ان کے اثرات کا شائبہ سرور کی شاعری میں نہیں ملتا ۔ سرور کی اپنی آواز ہے، اپنا آہنگ ہے، اپنا رنگ اور اپنا لب و لہجہ ہے ۔ وہ پُرگو نہیں لیکن جو کچھ کہتے ہیں اس میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں دونوں جذبوں کو سمو دیتے ہیں ۔

سرور کا ترنم بھی منفرد ہے اور غضب کا ہے ۔ آپ مشاعرہ گاہ میں نہ ہوں لیکن سرور پڑھ رہے ہوں تو دور سے آواز پکارے گی کہ میں

" سرور ہوں جو اپنے کلام اور آواز
کے ساتھ سننے والے کے دل میں
اترتا چلا جاتا ہوں "

سرورؔ بارہ بنکوی

عکسِ فن

کٹ تو جائے گی ترے غم کے سہارے زندگی
اور اگر اے دوست تیرے غم سے جی گھبرا گیا

پھر کوئی نغمہ بعنوانِ سکونِ دل سرورؔ
روز و شب کے گریہ و ماتم سے جی گھبرا گیا

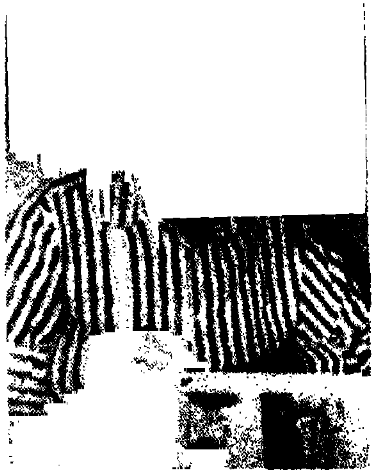
اک مقام ایسا بھی آیا ہے محبّت میں سرورؔ
ان حسیں ہاتھوں سے بھی دامن چھڑا لینا پڑا

یہ حیاتِ مختصر ہی کاٹنی دشوار ہے
کیا کروں گا لے کے عمرِ جاوداں تیرے بغیر

وہ مرے خونِ آرزو سے سہی
رنگ تو آ گیا زمانے میں

سرورؔ کوئی بھی اس کا ادا شناس نہ تھا
اب ایسی بزم میں ہم کس سے گفتگو کرتے

سعید رضا سعید



پیدائش ۱۹۲۹ء

کمرہ بند کئے بیٹھے تنہائی کا رونا روتے ہو
کھڑکی کھول کے نیچے دیکھو کتنے سارے اپنے لوگ



سعید رضا سعید
24/1/79

سعید رضا سعید

"اجمیر میں پیدا ہوا۔ مارواڑ میں بچپن گزارا۔ علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ بمبئی میں شعور حاصل کیا اور اب ... اب کراچی میں جھک مار رہا ہوں۔"

یہ الفاظ سعید رضا سعید نے خود اپنے بارے میں اپنے ایک ناول 'ایک کہانی' میں لکھے ہیں۔

علم دوست گھرانا نصیب ہوا تھا۔ سات آٹھ سال کی عمر میں جب پریوں کی کہانیاں پڑھنے والے بچے ذہین سمجھے جاتے ہیں، یہ 'آبِ حیات' پڑھا کرتے تھے۔ نگار نیرنگ خیال عالمگیر اور دوسرے پرچے گھر میں آتے تھے۔ یہ شروع سے آخر تک ہر رسالہ کئی کئی مرتبہ چاٹ جایا کرتے تھے۔ بہت سے شعر اس وقت انہیں یاد ہو چکے تھے۔ جب شعر کے معنی بھی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ اسی زمانے میں ان کی خالہ جو ان کی .. .. .. والدہ سے بہت بڑی تھیں نماز پڑھ رہی تھیں۔ سات برس کے بچے نے پیچھے کھڑے ہو کر ایک شعر پڑھ دیا۔ شعر میں چونکہ "نماز" کا لفظ آیا تھا۔ اس لئے معنی پر غور کئے بغیر چسپاں کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خالہ بی نے نیت توڑ کر مرمت کر دی۔ وہ شاد عظیم آبادی کا شعر تھا۔

پچھلے پہر اٹھ اٹھ کے نمازیں، ناک رگڑنی سجدے پہ سجدہ
جو نہیں جانتا اس کی دعائیں اف ری جوانی، ہائے زمانے

سعید رضا سعید نے زندگی میں جو پہلا شعر موزوں کیا وہ اقبال کے ایک شعر کی تضمین

تھی۔ اس کا واقعہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ ان کے چچا، شفاء الملک حکیم ہادی رضا لکھنؤ سے آئے ہوئے تھے۔ رات کو کھانے کے بعد صحن میں بچھے پلنگ پر لیٹے وہ بڑی ترنگ میں اقبال کی غزل گا رہے تھے، جب انہوں نے یہ شعر گایا:۔

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم ہائے سیاہ کو تیری عفوِ بندہ نواز میں

انہوں نے اسی ترنم میں یہ شعر فی البدیہہ پڑھ کر چچا سے داد وصول کی ؎

نہ کہیں جہاں میں چچا ملا جو چچا ملا تو کہاں ملا
مرے دادا جان کی کوٹھری میں دبا ہوا تھا پیاز میں

اس وقت عمر تقریباً نو سال تھی۔ دس ساڑھے دس سال کی عمر میں پہلی نظم کہی۔ سانبھر لیک راجپوتانے میں ان کے ماموں، خان بہادر محمد ابراہیم صاحب نمک کے جنرل مینجر تھے۔ جب ان کا تبادلہ ہوا تو محکمے کے افسروں کے ہاں صبح شام الوداعی دعوتیں ہونے لگیں ایک صاحب جو بے حد کنجوس مشہور تھے، ان کے ہاں بھی دعوت ہوئی۔ دوستوں کے کہنے پر اس دعوت کا حال نظم کیا۔ ایک شعر یاد رہ گیا ہے ؎

دہی پھلکی کی بابت متفقہ رائے تھی سب کی
کہ گوتم بدھ نے بنوائی تھیں یہ رکھی رہیں جب کی

گیارہ سال کی عمر میں اپنی بڑی بہن کے ایماء پر ان کی سہیلی کی بکری کا "مرثیہ" کہا جس کا ایک شعر ہے ؎

وہ بکری تھی مگر تھی اس طرح سے مختصر چوپایہ
کہ جیسے گدلے پانی کے گڑھے میں چاند کا سایہ

گھر والوں کی خواہش تھی کہ بچہ انجینئر بنے۔ فزکس، کیمسٹری اور میتھیمیٹکس پڑھوائی گئی۔ یہ علی گڈھ میں یہ مضامین پڑھتے اور باقی وقت میں ادب کا مطالعہ کرتے۔ سب سے پہلے افسانے لکھنا شروع کئے۔ پہلا افسانہ نگار لکھنؤ میں بھیجا جو چھپ گیا۔ دوسرا اور تیسرا بھی چھپ گیا۔ یہ افسانے پریتی علیگ کے نام سے شائع کرائے گئے تھے۔ یہ

بات ۱۹۴۵ء کی ہے۔ الیکٹریکل میکینیکل انجینیرنگ کے دو سال کر کے یہ اسی سال علیگڈھ سے اچانک بمبئی جا دھمکے۔ اس زمانے میں 'نگار' میں کسی کی تحریر چھپ جانا قابلیت کا بہت بڑا سرٹیفکیٹ تھا یہ روزنامہ "الہلال" کے مالک اور ایڈیٹر محمد احسن مرحوم کو نگار کے پرچے دکھا کر اس کے مینجر مقرر ہو گئے۔ مسلم لیگ کی تحریک کا زور تھا۔ یہ بھی اسی سیل میں بہہ گئے۔ ہر کام جلد سے جلد سیکھ کر مہارت حاصل کر لینے کی صلاحیت بچپن سے تھی۔ اخبار کے نیوز ایڈیٹر "ضیا الحسن برنی مرحوم" بیمار پڑے تو یہ ان کی سیٹ پر جا بیٹھے۔ تین ہفتے وہ بیمار رہے اور اس مختصر مدت میں انہوں نے ایسی مہارت پیدا کر لی کہ اسسٹنٹ ایڈیٹر ہو گئے۔ محمد احسن صاحب جو پہلے سہ روزہ مدینہ بجنور اور روزنامہ خلافت۔ بمبئی کے ایڈیٹر رہ چکے تھے، ان پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ جب رئیس احمد جعفری نے اس اخبار میں پارٹنر شپ کی تو سعید رضا سعید کا نام بطور ایڈیٹر شائع ہونے لگا۔

ان کے ترقی پسند بننے کا قصہ بھی دلچسپ ہے ۱۹۴۶ء کا الیکشن ہو رہا تھا۔ بمبئی میں مزدور علاقے سے پارلیمنٹ کی ایک سیٹ تھی۔ چونکہ مزدوروں میں مسلم لیگ کا کوئی اثر نہ تھا اس لئے مسلم لیگ وہاں اپنا امیدوار بھی کھڑا نہیں کر سکی تھی۔ کانگریس نے لیبر سیٹ کے لئے ایک مسلمان کو ٹکٹ دیا تھا۔ مسلم لیگ نے فیصلہ کیا کہ اس کے مقابلے میں کمیونسٹ امیدوار (کامریڈ ڈانگے) کو سپورٹ کیا جائے۔ انتخابی مہم کے نتیجے میں سیٹ تو ڈانگے نے جیتی اور کمیونسٹ پارٹی سعید رضا سعید کو جیت لے گئی۔

بمبئی میں سردار جعفری، کیفی اعظمی، نیاز حیدر وغیرہ کے ساتھ ادبی محاذ پر عملی کام کیا اور ان کی آواز میں آواز ملا کر سیاسی نظمیں کہنے لگے۔ وہاں کے ایک صبح اور ایک شام کے روزنامے میں ہر روز ان کی ایک مزاحیہ نظم اور ایک فکاہیہ کالم شائع ہوتا تھا جو وہ 'علامہ درپن' کے نام سے لکھتے تھے۔ بمبئی میں سولہ برس گزارے۔ ان میں گیارہ برس روزنامہ ہندوستان کے چیف ایڈیٹر رہے۔ احمد آباد میں یوم مئی کا

مشاعرہ جس میں دس پندرہ ہزار مزدور اکٹھے ہوتے تھے، ہر سال ان کی صدارت میں ہوا کرتا تھا۔

ایوب خان کے مارشل لاء کے تقریباً ایک سال بعد وہ کراچی آ گئے۔ یہاں پہلے روزنامہ انقلاب کے ایڈیٹر رہے پھر انگریزی روزنامہ 'کمنٹ' کی نیوز ایڈیٹری کے ساتھ ریڈیو پاکستان کے خبروں کے شعبے میں مترجم رہے پھر محکمہ تعلیم صحت کے پرچے "اچھی زندگی" سے منسلک ہو گئے۔ جب اسلام آباد جانے کا حکم ملا تو اسی وقت یہ لکھ کر دے دیا کہ "میں دوسری مرتبہ مہاجر بننے کے لئے تیار نہیں۔" استعفیٰ دے کر پھر ریڈیو میں پہنچے۔ اشتہاری کمپنیوں کے لئے بمبئی میں بھی لکھا کرتے تھے۔ یہاں بھی یہی کام شروع کر دیا۔ یہاں سے جست ماری تو روزنامہ انجام میں اسسٹنٹ ایڈیٹر ہوئے اور ادارتی صفحے کے انچارج بنے۔ اخبار بند ہوا تو ایک ممتاز ایڈورٹائزنگ کمپنی میں کاپی رائٹر بن گئے وہاں سے یکایک تہران جا پہنچے اور ایک انگریزی رسالے کی ادارت سنبھال لی۔ واپس آئے تو پھر اشتہاری کمپنیوں کا کام سنبھال لیا۔

سعید رضا سعید ادیب بھی ہیں، شاعر بھی، صحافی بھی اور کاپی رائیٹر بھی۔ ہر لائن میں ایک خاص مقام کے مالک ہیں۔ خود کہتے ہیں کہ جو کام ہاتھ میں لیتا ہوں، بھوت بن کر چمٹ جاتا ہوں اور یہی کوشش ہوتی ہے کہ کام کے معیار اور مقدار، دونوں اعتبار سے سب کو پیچھے چھوڑ جاؤں۔ ان کے بقول ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ اب تک ان کی ملاقات ایسی کسی ہستی سے نہیں ہو سکی جو ان سے زیادہ تیز رفتاری سے ترجمہ کر سکے۔

وہ ایک لاکھ سے اوپر شعر کہہ چکے ہیں مگر طبیعت میں لاپرواہی ایسی ہے کہ سارا کلام ضائع کر دیا۔ بس جو زبانی یاد رہ گیا سو رہ گیا۔ مسدس ان کی محبوب صنف ہے اس معاملے میں چکبست اور انیس کو اپنا استاد تصور کرتے ہیں کہ ان دو اساتذہ سے زیادہ اس صنف کا حق کسی اور سے ادا نہ ہو سکا۔

سعید رضا سعید نظم اسی وقت کہتے ہیں جب کوئی اہم واقعہ انہیں متاثر کرے، سوئنہ

کی پہلی جنگ کے موقع پہ مصر کی جانب سے انہوں نے سامراجیوں کو للکارا ۔

تمہیں بھی اندازہ ہوگا شاید جلالی تیور تو کم چھپے ہیں ہیں
ہر ایک جھاڑی کی یہ صدا ہے یہاں نہ آنا کہ ہم چھپے ہیں
لچکتی گیہوں کی پتیوں میں ہزار تیغوں کے خم چھپے ہیں
کپاس کے کھیت کہہ رہے ہیں یہاں بنولوں میں بم چھپے ہیں
ہوائے گلشن تمہارے سواگت کو زہر آلود بن گئی ہے
تمہاری خاطر یہ ریت صحرا کی تپ کے بارود بن گئی ہے

بہار کے شہر پٹنہ میں طلباء پہ گولی چلائی گئی تو انہوں نے بڑے دکھ کے ساتھ کہا ؎

لٹ گئی اکبر کے کنجِ نورتن کی ہر بہار
جھک گئی ٹیپو کی دھرتی کی جبینِ پُر وقار
نانا صاحب کی سمادھی سے نکلتے ہیں شرار
سسکیاں لینے لگا ہے چاند بی بی کا مزار
صبر کا دامن ایلورا سے چھٹا جاتا ہے آج
دم اجنتا کی گپھاؤں کا گھٹا جاتا ہے آج

اپنی نظم " ایشیائیں لکھتے ہیں ؎

بگڑ گئے ہم تو گردشِ روز و شب کا سارا حساب بگڑا
ہوئے جو برہم کبھی تو برہم نظامِ انجم کو کر دیا ہے
سلگتی سانسوں سے ہم نے جھلسا دیا کبھی برق کا کلیجہ
دمکتی نظروں سے ہم نے سورج کے دل کو چھالوں سے بھر دیا ہے

ان کی نظم ' افریقہ ' کا ایک بند ہے ؎

پیاس سے جو تلملاتے تھے لبِ جو بے پیئے
زندگی مہنگی تھی ارزاں موت تھی جن کے لئے

سامراجی نوک سوزن نے تھے لب جن کے سئے
خون سے جن کے جلا کرتے تھے یورپ میں دیئے
سر سے پا تک ہو کے اک شعلہ بھڑک اٹھے ہیں وہ
سینۂ گیتی میں دل بن کر دھڑک اٹھے ہیں وہ

۱۹۵۹ء میں وہ کراچی پہنچے تو ایوب خانی مارشل لاء کے سناٹے میں ان کی تنہا آواز گونجی:

ظلمت کے خداؤں سے کہہ دو یہ رات ہمیں منظور نہیں
جس صبح کے ہم پیغمبر ہیں وہ صبح زیادہ دور نہیں

۱۹۶۵ء کی جنگ میں جہاں انہوں نے پاکستانی عوام کو یہ کہہ کر خراج تحسین پیش کیا

کہیں غل کر پھونکوں سے سورج بجھائے کہیں شور تنکوں نے تلوار موڑی
پتنگوں نے شمعوں کی کاٹی زبانیں، مولوں نے بازوں کی گردن مروڑی
رگ گل نے کانٹوں کے دل چھید ڈالے، نہتوں نے ٹینکوں کی دیوار توڑی
قدم جیتے جی پیچھے ہٹنا تو کیسا شہیدوں کی لاشوں نے سرحد نہ چھوڑی
غرض یہ کہ چشم زمانہ نے دس دس کو ایک ایک پر پیش پاتے نہ دیکھا
زمیں پر لہو غازیوں کا گرا بھی تو بہہ کر اسے پیچھے آتے نہ دیکھا

ہاں ایک اور نظم "سفید ہاتھ" میں یہ کہے بغیر بھی نہ رہ سکے کہ

سفید ہاتھوں کی ایک جنبش پہ جنگ کی راہِ پُر خطر لی
سفید ہاتھوں کا اک اشارہ ہوا تو گھبرا کے صلح کر لی

سعید رضا سعید کو اس بات پر بڑا فخر ہے کہ انہوں نے کبھی رجعت پسندوں سے سمجھوتہ نہیں کیا اور قلم کی حرمت کو ہر قیمت پر برقرار رکھا۔ انہوں نے ہمیشہ عوام کے لئے لکھا اور عوامی آزادی کی تحریکوں کو ہی موضوع بنایا۔ ویتنام کی طویل جنگ پر انہوں نے تین نظمیں لکھا ایک وہ جس میں گوریلا جنگ کے آغاز کی منظر کشی کی گئی تھی۔

جھاڑیاں کانٹوں کے نیزے تان کر آگے بڑھیں
وادیاں خطرے کی سن گن جان کر آگے بڑھیں

ندیاں کچھ دل ہی دل میں ٹھان کر آگے بڑھیں
دلدلیں دشمن کی بو پہچان کر آگے بڑھیں
بن کے ذرے سنگریزے خود بخود چلنے لگے
پتھروں نے روپ یوں بدلا کہ بم ڈھلنے لگے

ایک نظم میں انہوں نے یہ بتایا کہ ویتنام کی جنگ کا پاکستانی عوام سے کیا تعلق ہے ؎

ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں طغرے سے تصویر تلک
یارو ایک لڑائی ہے سیگان سے منگھو پیر تلک

تیسری نظم اس وقت لکھی جب سامراجی فوجیں سر پہ پاؤں رکھ کے ویتنام سے بھاگ رہی تھیں ؎

اڑا ہے چہرے کا رنگ ان کے جو خوں کا بیوپار کر رہے ہیں
کہ سر پھرے آگ کے سمندر کو تیر کر پار کر رہے ہیں
صفوں میں کانٹوں کے کھلبلی ہے کہ پھول یلغار کر رہے ہیں
سنبھل ذرا اے نظامِ کہنہ ہم آخری وار کر رہے ہیں

یہ ریت ہے اس جہاں کی جتنے اٹھے ہیں فرعون مٹ گئے ہیں
بڑوں میں آئی ہے جب رعونت تو اپنے چھوٹوں سے پٹ گئے ہیں

کراچی کے طلباء اور مزدوروں کے حلقوں میں ان کی نظمیں لوگوں کو زبانی یاد ہیں اور ان کی غیر موجودگی میں جلسوں میں پڑھی جاتی ہیں مثلاً ؎

مانا خاک کے ذرے ہیں ہم پہ ایٹم کی طاقت ہیں
الگ الگ تو کچھ بھی نہیں ہیں مل جائیں تو قیامت ہیں

٭

مشرق سے مغرب تک تھا جو چھایا ہوا وہ نحوست کا سایہ سمٹنے لگا
اے وطن کے غلامانِ ڈالر سنو آج ڈالر کا بھاؤ بھی گھٹنے لگا

٭

تمہارے بدلے فقط تمہاری الم بھری داستاں بچے گی
مرے رفیقو جہاں پہ میں ہوں وہیں پہ آؤ تو جاں نہ بچے گی

مصائب لاکھ بڑھ جائیں عزائم کم نہیں ہوتے
یہ سر وہ ہیں جو کٹ جاتے ہیں لیکن خم نہیں ہوتے

یہ آخری شعر ان کی اپنی زندگی کی تصویر ہے۔ انہیں کبھی مایوس ہوتے نہیں دیکھا۔ بڑے بڑے صدمے کو ذہن سے یوں جھٹک دیتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

عام زندگی میں وہ نہایت 'غیر شاعر' قسم کے انسان ہیں۔ زبان کا چٹخارہ بہت ہے کھانے میں صرف گوشت کے شوقین ہیں۔ شرط یہ ہے کہ بڑے کا ہو اور بہت سا ہو۔ اپنے ہاتھ سے بھی پکا لیتے ہیں اور جسے کھلاتے ہیں اسے بار بار تعریف کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔

ان کے دو ناول شائع ہو چکے ہیں۔ ایک کہانی' اور تین عورتیں ایک مرد"۔ ایک کہانی' ان کا زندہ جاوید ناول ہے۔ ریڈیو پاکستان کے لئے کئی ڈرامے لکھ چکے ہیں اور کئی کہانیوں کا ترجمہ بھی نایاب شکل میں موجود ہے۔ اب اپنے مجموعہ کلام کی ترتیب میں مصروف ہیں اور اگر وہ ان کی فطری لاپرواہی کی نذر نہ ہوا تو کتابی شکل اختیار کرے گا۔ جولائی ۱۹۲۹ء ان کا سن پیدائش ہے

سعید رضا سعید

عکس فن

کمرہ بند کئے بیٹھے تنہائی کا رونا روتے ہو
کھڑکی کھول کے باہر دیکھو کتنے سارے اپنے لوگ

طوفانوں کے ہانپتے جسموں سے تم پوچھ کے دیکھو تو
ہم اک ایسی ڈالی ہیں جو جھکنا، ٹوٹنا کیا جانے

اب جو پالسہ پلٹا تھا تو کچھ زیادہ ہی پلٹا تھا
اب جو پالسہ پلٹے گا تو کچھ زیادہ ہی پلٹے گا

اپنی اپنی سوچ سے تعمیر ہوتے ہیں مکاں
ہم تو چھت کو گھر کہیں گے اور دیواروں کو آپ

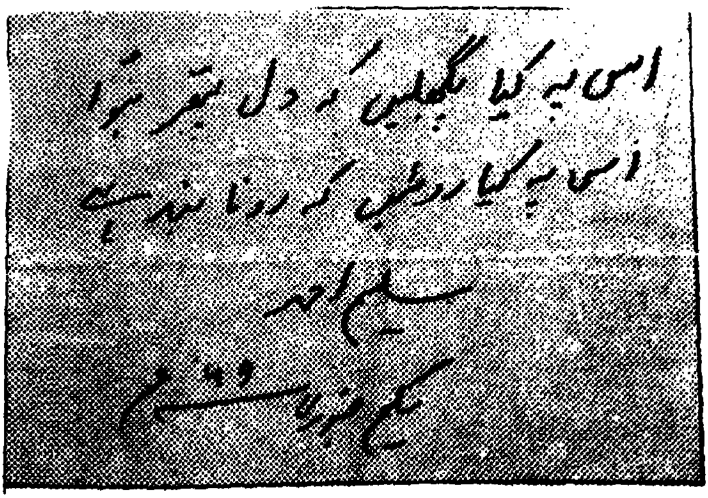
دھوپ میں جلتے جسموں والوں کو تم نے کیا سمجھا ہے
یہی تو تارے بوتے ہیں شبنم کی فصل اگاتے ہیں

تھک گئے ہو تب بھی مت بیٹھو کہ گھر نزدیک ہے
رات کالی ہو تو یہ سمجھو سحر نزدیک ہے

سلیم احمد

بیاض
نئی نظم پورا آدمی
ادھوری جدیدیت

پیدائش ۱۹۲۷ء



سلیم احمد

پرانے زمانے میں بڑے بڑے چوبی صندوقوں کا بڑا رواج تھا۔ جتنا کھاتا پیتا گھرانہ ہوتا اس کے ہاں کے صندوق اتنے ہی لمبے، چوڑے اور اونچے ہوا کرتے تھے۔ ان میں کپڑے اور کتابیں وغیرہ رکھی جاتی تھیں۔ ایک ایسے ہی گھر میں پانچ چھ سال کا ایک بچہ نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ سارے میں ڈھنڈیا پڑی۔ گھر کا کونا کونا دیکھ ڈالا گیا۔ اب باہر تلاش شروع ہوئی۔ اس دوران چچا جان اپنے کتب خانے میں دیکھا۔ دیکھا کہ لاڈلے بھتیجے کتابوں کے صندوق میں سو رہے ہیں۔ کسے معلوم تھا کہ آگے چل کر یہ بچہ کتابوں کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لے گا۔

یہ سلیم احمد تھے، جو ۲۷ء۱۹ کی یکم دسمبر کو یوپی کے ضلع بارہ بنکی کے ایک قصبہ کھیولی میں پیدا ہوئے، چچا کے کتب خانے میں مذہبی کتابیں تھیں، ادب نہ تھا لیکن یہ بچپن سے ہی ان میں دلچسپی لینے لگے۔ ذرا بڑے ہوئے تو چچا سید لیاقت علی نے رسالہ 'مولوی' جو دلی سے نکلتا تھا، ان کے نام جاری کرا دیا۔ جب ڈاکئے نے پہلی مرتبہ رسالہ لاکر دیا تو انہیں بڑی خوشی ہوئی، کہ اب ہماری بھی ڈاک آنے لگی اور بڑے شوق سے پورا رسالہ کئی مرتبہ ختم کیا۔

ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ بچپن کی ہر بات دل پر نقش ہوجاتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس چھوٹی عمر میں جو کچھ پڑھا۔ اس کا اثر آج تک قائم ہے اور ان کی فکر اور تحریر میں جھلکتا ہے

سلیم احمد

سلیم احمد کی شاعری کا آغاز بارہ سال کی عمر میں ہوا اور وہ اس طرح کہ اسکول کے طلباء کا ہیڈ ماسٹر برکت علی صاحب سے کچھ جھگڑا ہو گیا۔ بقول سلیم احمد صاحب کے زیادتی برکت علی صاحب کی ہی تھی۔ انہوں نے ہیڈ ماسٹر کے خلاف ایک مثنوی لکھی جسے لڑکوں نے نقل کر کے دیواروں پر چسپاں کر دیا۔ اس سے ماسٹر صاحب اتنے گھبرائے کہ انہیں طلباء سے معافی مانگنا پڑی۔ اساتذہ کے طبقے کے خلاف سلیم احمد صاحب کو بچپن میں جو شکایت پیدا ہوئی وہ آج تک باقی ہے۔ چنانچہ چند سال قبل ان کی دلچسپ تحریروں پر خاصہ ہنگامہ رہا۔

اس کے بعد سے شاعری کا سلسلہ چلتا رہا۔ ابتدا نظم سے کی چونکہ یہ ان کی طبیعت کی افتاد کے عین مطابق تھی۔ اس زمانے میں عام ادبی فضا غزل کے خلاف تھی۔ فراق گورکھپوری نے اس سلسلے میں کچھ مضامین بھی لکھے تھے۔ جو ان کی نظر سے گزرے۔ چونکہ ان کی پرورش حد درجہ لاڈ پیار میں ہوئی تھی اور طبیعت میں ایک ضد تھی دوسروں سے منفرد نظر آنے کی جذبہ تھا۔ اس لئے انہوں نے غزل کی مخالفت ہوتی دیکھ کر نظم گوئی ترک کر دی اور غزل گوئی شروع کر دی۔ ۱۹۴۵ء میں ایک غزل مرزا یاس یگانہ چنگیزی کے رنگ میں لکھی۔ اس کا مطلع تھا۔

کیا جھوٹ کیا سچ اللہ جانے
جتنی زبانیں اتنے فسانے

یہ غزل یگانہ چنگیزی کو اصلاح کے لئے بھیج دی۔ لیکن اس کے علاوہ اور کسی سے اصلاح لینے کا اتفاق پیش آیا نہ ضرورت محسوس ہوئی۔

نومبر ۱۹۴۷ء میں سلیم احمد پاکستان آ گئے اور ۱۹۵۰ء میں ریڈیو سے وابستہ ہو گئے اب ان کی ڈرامہ نگاری کا عظیم دور شروع ہوا۔ اب تک ان گنت ڈرامے لکھ چکے ہیں جن میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں:۔

تاریخی ڈرامے:۔ ۱۸۵۷ء، تیمور، چنگیز خاں وغیرہ۔
سماجی ڈرامے:۔ کل ہی نہ جانے، نیند کی وادی، موسم اور محبت، شاہراہ حیات۔

سخن ور (تذکرہ شعراء) سلیم احمد

خودکشی، یہ کس کی لاش ہے۔

جاسوسی ڈرامے۔ ہیبت محل، وہ جو مرچکا تھا۔ ناگن۔ صیاد وغیرہ وغیرہ۔

۱۹۵۵ء سے انہوں نے فلموں کے لئے بھی کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ پہلی فلم انسان تھی جو مکمل نہ ہوسکی۔ "راز" ان کی پہلی فلم تھی جو نہ صرف بنی بلکہ ریلیز بھی ہوئی اور بڑی کامیاب ثابت ہوئی۔ اس پر نگار ایوارڈ بھی ملا۔ سلیم احمد نے کئی فلموں کے مکالمے اور اسکرین پلے بھی لکھے ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ میرے بارے میں کچھ لوگوں کی یہ رائے غلط ہے کہ چونکہ مجھے بچپن میں نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ اس لئے مجھ میں منٹو کی طرح دوسروں کو چونکا دینے اور سب سے الگ راہ اختیار کرنے کا جذبہ پیدا ہوگیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں تو اس کے برخلاف گھر میں مختلف محبتوں کا مرکز رہا ہوں۔ در اصل قصہ یہ ہے کہ لوگ نفسیات کے بکھیڑوں میں زیادہ پڑتے ہیں۔ فن کے تقاضوں کو نہیں دیکھتے۔ چونکانا ایک فنی طریقہ کار ہے۔ میں نے اسے اس وقت اختیار کیا جب دیکھا کہ لوگوں کو پڑھنے سے دلچسپی نہیں رہی ہے ایسے میں ہر فنکار کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کو ادب پڑھنے کی طرف متوجہ کرے۔ افسانے کو پھر لوگ بڑی دلچسپی سے پڑھ لیتے ہیں۔ تنقید اور تحقیق کی طرف بہت کم لوگ توجہ دیتے ہیں۔

"ادب میں دو گروہ ہیں۔ ترقی پسند اور رجعت پسند... اس تضاد کی وجہ؟"

سلیم احمد بولے۔ "دیکھئے ادب کو زندگی کے ہر گوشے اور ہر شعبے کا ترجمان ہونا چاہئے یہ ادب کا فرض منصبی ہے کہ وہ زندگی کے ہر پہلو کی ترجمانی کرے۔ لیکن شرط اول یہ ہے کہ ادب ادب ہو۔ بعض لوگ اشتراکی حقیقت نگاری یا ترقی پسندانہ زاویۂ نظم ہی کو زندگی کی ترجمانی یا عکاسی سمجھتے ہیں اور ادب کو اس سے محدود کردیتے ہیں۔ اس سے مجھے اختلاف ہے۔ ان کے نزدیک مسئلہ یہ ہے کہ صاحب میں تو کرشن چندر کو پسند کرتا ہوں آپ منٹو کو کیوں پسند کرتے نہیں کرتے ؟ حالانکہ ادب ایک ادیب کے دوسرے نقطۂ نظر کو بھی واضح کرتا ہے اور اسے کرنا چاہئے۔

اب عوامی ادبی انجمن کے نکات کو لیجئے، جن سے مجھے اتفاق نہیں اور میں اپنے ادبی

کالموں میں ان پر تنقید بھی کر چکا ہوں۔ ان کے دونوں تصورات نظریہ پاکستان کی نفی کرتے ہیں جبکہ پاکستان صرف ایک قوم کا وطن ہے اور اس کا نام ہے پاکستانی۔"

ڈائجسٹ قسم کے ادب پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "یہ ادب نہیں محض صحافت ہے۔ لوگ عمیق تحریروں کا مطالعہ کرنا نہیں چاہتے۔ انہیں ایسا ادب چاہئے جو ریل میں سفر کرتے ہوئے، بس کی کیو میں کھڑے رہ کر اور پارک میں ٹہلتے ہوئے پڑھا جا سکے کیونکہ آج کا سہل پسند انسان نہیں چاہتا کہ اس کا ذہن کہیں خرچ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تفریحات اور کھیل وہی مقبول ہو رہے ہیں جس میں دیکھنے والے کی صرف آنکھیں کھلی رہیں، حرکات و سکنات دوسروں کی ہوں۔ یہ تھکے اور اکتائے ذہنوں کی علامت ہے۔ اس کے کئی سبب ہیں، بنیادی سبب معاشی ہے۔ ہر فرد انفرادی طور پر اپنے ذہن سے کچھ کام لے تو حالات بہر حال بڑی حد تک درست ہو سکتے ہیں۔"

"کیا کلچر کا مذہب ہوتا ہے یا اسے محض کسی علاقے سے ہی نسبت ہوتی ہے؟"

سلیم احمد صاحب نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ کہ "دنیا میں آج تک کوئی کلچر ایسا پیدا نہیں ہوا جس کی بنیاد مذہب پر نہ ہو۔ ساری پرانی تہذیبیں مذہب سے ہی پیدا ہوئی ہیں۔ اسی لئے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے کلچر کو مذہب کا اوتار کہا ہے۔ ہمیں اپنی قدیم تہذیبوں کے وارث ہونے کی بنا پر نہ صرف اس پر فخر کرنا چاہئے، بلکہ اس میں اضافہ کرنا چاہئے تاکہ آنے والی نسلیں ہم پر فخر کر سکیں۔"

"جدید شاعری میں ابہام بہت ہے۔ ایسا کیوں؟"

"اس لئے کہ جدید زمانے میں ابہام کو بطور ایک فنی ذریعۂ اظہار کے اختیار کیا گیا ہے ابہام کسی مجبوری کے تحت نہیں ہے، بلکہ خود ساختہ ہے اور اس پر بعض مغربی نظریات کا گہرا اثر ہے۔ مثلاً فرانسیسی علامت نگاروں کا۔ جنہوں نے ابہام کو خاصا فروغ دیا۔ ہم نے بطور فیشن اسے اپنا لیا ہے ہم چاہیں تو اسے ترک بھی کر سکتے ہیں۔"

سلیم احمد کے کلام کا ایک مجموعہ "بیاض" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ تنقیدی مضامین کے دو مجموعے "ادبی اقدار" اور نئی نظم پورا آدمی بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ایک تنقیدی مجموعہ

زیر اشاعت ہے اور" بابائے جدیدیت" کے عنوان سے ایک کتاب زیر ترتیب ہے۔

نئے لکھنے والوں کے سلیم احمد کا مشورہ یہ ہے کہ" اچھا لکھیں"۔ اچھا لکھنے سے مراد یہ ہے کہ ہر لکھنے والے کو یہ تعین کرنا پڑتا ہے کہ اس کی نظر میں اچھی چیز کیا ہے۔ لکھنا ایک فن ہے اور جس طرح دوسرے تمام فنون اس کے جاننے والوں سے سیکھے جاتے ہیں۔ اس طرح لکھنا بھی سیکھا جاتا ہے۔ درجہ اول کے لکھنے والے نے ایک فقرہ کس طرح لکھا۔ ایک شعر کہنے کے لئے کتنا ریاض کیا یہ جاننا ضروری ہے اور یہ چیز دنیا کے بڑے ادب کے مطالعے کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی"۔

سلیم احمد نے ٹی۔ وی کے لئے بھی بعض یادگار ڈرامے لکھے سب سے زیادہ مقبولیت ان کی ڈرامہ سیریز" تعبیر" کو حاصل ہوئی۔

سلیم احمد کا کہنا ہے کہ ہماری موجودہ سوسائٹی کو میر، سودا، نظیر اور آتش کی پوری کلیات کا مطالعہ بالجبر کرانا چاہیے۔ یہ ایک تہذیبی خدمت ہوگی۔ سلیم نڈر شاعر ہیں اور اپنے مجموعہ کلام" بیاض" میں لکھتے ہیں کہ

"شعر و ادب پڑھنے والے کو بالغ اور نڈر ہونا چاہیئے۔ اس مجموعہ میں شاعری کتنی ہے یا ہے بھی کہ نہیں اس کے بارے میں مجھ سے زیادہ آپ کو فیصلہ کرنا چاہیئے لیکن ایک بات میں ضرور کہوں گا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے۔ پوری بے خوفی سے کہا ہے۔ میں اپنے پڑھنے والوں سے بھی اسی بے خوفی کی امید رکھتا ہوں"۔

☆

سلیم احمد

عکسِ فن

ریاکاری لبوں نے سیکھ لی ہے
کوئی حالت ہو یہ ہنستے رہیں گے

ہم کو پوچھا ہمارے بعد سلیم
جیسے سوتے کو کوئی کرے پیار

اب ہماری صفائی کون کرے
دل بنا ہے گواہِ سلطانی

گُل و گلزار پہ اشعار تو لکھے ہیں سلیم
اب یہ لازم ہے کہ پیشہ بھی کرو مالی کا

زندگی

اذیت
جو مری رگ رگ میں نشتر سی کھٹکتی ہے
مجھے مژدہ سناتی ہے
کہ میں جو بے حسی سے مر چکا تھا
آج زندہ ہوں

وہ دن نہ ہو کہ مجھ سے وفا ترک تُو کرے
اور میں کہوں کہ مجھ کو یہی احتمال تھا

حمایت علی شاعر



آگ میں پھول

مٹی کا قرض

پیدائش ۱۹۳۱ء



ایک نظم

وقت ہے آوارہ ہوا کے مانند
شعلۂ زیست ہے شبنم کی طرح
آؤ مٹا دیں یہ تفاوت یہ جمود
آؤ کہ ہو پھر کسی عیسیٰ کا ورود
تو بھی مظلوم ہے مریم کی طرح
میں بھی تنہا ہوں خدا کے مانند

حمایت علی شاعر

۲۸ / ۹ / ۲

حمایت علی شاعر

فکرِ معاش کھا گئی دل کی ہر اک امنگ کو
جائیں تو لے کے جائیں کیا حُسن کی بارگاہ میں

ایک سولہ سالہ لڑکے نے جب یہ شعر کہا تو بڑے بڑے چونک پڑے۔ زمانہ تھا ۴۷ء کا اور جگہ تھی حیدر آباد جہاں مخدومؔ کے جادو نے پوری نئی نسل کو ترقی پسند تحریک کی ڈگر پر لا کھڑا کیا تھا۔

یہ حمایت علی شاعرؔ تھے جو اورنگ آباد میں پیدا ہوئے ہیں۔ میٹرک کیا اور پھر حیدر آباد چلے آئے۔ ۴۶ء سے ان کا کلام 'نظام' ویکلی بمبئی، ماہنامہ 'رباب' حیدر آباد اور 'میزان' دہلی وغیرہ میں شائع ہونے لگا تھا۔ حمایت حیدر آباد آ کر ریڈیو سے وابستہ ہو گئے اور ایک اخبار 'جناح' اور پھر 'منزل' میں کام کرتے رہے۔ ریڈیو سے وابستگی ۵۰ء تک رہی یہ وہ زمانہ تھا کہ بمبئی کی فلمی انڈسٹری ہندوستان بھر کے ذہین فنکاروں کا کھلے دل سے استقبال کر رہی تھی۔ چنانچہ حمایت نے بھی بمبئی کا رُخ کیا۔ مخدومؔ کی رہنمائی نے دل میں جو چنگاری پیدا کی تھی وہ بمبئی آ کر سردارؔ جعفری، کیفیؔ اعظمی، مجروحؔ سلطانپوری، نیازؔ حیدر، مظفرؔ شاہجہانپوری، کرشن چندر، عصمت چغتائی اور راجندر سنگھ بیدیؔ کی معیت میں بھڑک کر جوالا بن گئی۔ حمایت تقریباً دو سال بمبئی میں رہے۔ روزنامہ خلافت میں کام کیا اور ریڈیو سے بھی وابستہ رہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے رسالے 'محاذ' میں بھی کام کیا۔ بمبئی سے وہ کراچی آ گئے اور ریڈیو پاکستان

میں کام کرنے لگے لیکن سیاسی سرگرمیوں کی بنا پہ ملازمت کا سلسلہ ٹوٹتا اور بندھتا رہا ۱۹۵۵ء اور میں حیدرآباد میں ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا تو حمایت نے اپنا تبادلہ وہاں کرا لیا۔ غالباً ان کے اس فیصلے میں حیدرآباد (نام سے انسیت بھی شامل تھی۔

تعلیم میٹرک کے بعد چھوٹ گئی تھی لیکن ۱۹۵۸ء میں انہوں نے یہ سلسلہ پھر شروع کر دیا اور ۱۹۶۳ء میں سندھ یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے کر لیا۔ اب پی۔ ایچ۔ ڈی کی تیاری میں مصروف ہیں۔ ان کی تحقیق کا موضوع ڈرامہ ہے۔ حیدرآباد میں قیام کے دوران ریڈیو کی مصروفیات کے ساتھ ساتھ آپ سچل سرمست آرٹس کالج میں جزوقتی لکچرار کے طور پر بھی کام کرتے رہے ایک دوماہی رسالہ شور بھی جاری کیا۔ لیکن دوسرے ادبی جرائد کی طرح دو تین سال تک سسک سسک کر یہ ختم ہو گیا۔ حیدرآباد میں ہی 'ارژنگ' نام سے ایک ثقافتی ادارہ قائم کیا جس میں آج کی بعض دوسری فلمی شخصیتیں مثلاً محمد علی، مصطفیٰ قریشی بھی شامل تھے۔ اس ادارے کے تحت ڈرامے کھیلے جاتے تھے۔ کمشنر حیدرآباد نیاز احمد مرحوم اس کے سرپرست تھے اور انھیں کی کوششوں سے میونسپل کارپوریشن نے ایک اوپن ایئر تھیٹر کی تعمیر میں تعاون کیا۔ اس کا نام بھی 'ارژنگ' تجویز ہوا۔ وہیں رہ کر حمایت علی شاعر نے فلموں کے لئے گانے بھی لکھنا شروع کر دیئے۔ ان کی پہلی فلم 'آنچل' اور 'دامن' تھی۔ دونوں کو ایوارڈ ملا ۱۹۵۶ء میں۔
"آگ اور پھول" کے نام سے ان کا پہلا مجموعہ شائع ہوا۔ جس پر صدارتی ایوارڈ دیا گیا دوسرا مجموعہ "مٹی کا قرض" تین سال قبل شائع ہوا۔ جس پر صدارتی ایوارڈ دیا گیا۔ انہوں نے فلمیں بھی بنائیں پہلی فلم "لوری" تھی جو ۱۹۶۶ء میں نمائش کے لئے پیش کی گئی۔ اس کے بعد "گڑیا" بنائی۔ اب تک تین سو سے زیادہ فلمی گانے لکھ چکے ہیں۔ زیرِ ترتیب کتابوں میں منظوم ڈراموں کا مجموعہ "شکست کی آواز" نثری ڈراموں کا مجموعہ "دستک" اور شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی کہانیوں پر مشتمل "مہران سورج" ہیں۔ شاعری میں ایک نیا تجربہ انہوں نے کیا ہے وہ ہے "ثلاثی" جس میں تین مصرعے ہوتے ہیں۔ اس کا ایک مجموعہ بھی زیرِ ترتیب ہے۔ ایک ثلاثی ملاحظہ ہو۔

پتھر

یہ ایک پتھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے
اسے محبت سنوار دے تو یہی صنم ہے
اسے عقیدت تراش دے تو یہی خدا ہے

غالب کی طرح سے حمایت علی شاعر کا بھی پیشہ آبا سپہ گری رہا ہے۔ دادا فوج میں تھے والد سید تراب علی پولیس میں تھے انہوں نے لڑکپن میں شاعری شروع کی تو گھر والوں نے طنز سے انہیں شاعر صاحب ہی کہہ کر پکارنا شروع کیا۔ اسی لئے انہوں نے اپنا تخلص ہی "شاعر" رکھ لیا۔ ۱۹۴۹ء میں عزیزوں میں ہی شادی ہوگئی تھی۔

حمایت علی نے زندگی میں بڑے سرد و گرم دیکھے ہیں اور اپنی زندگی خود بنائی ہے۔ ذہنی اعتبار سے وہ اب بھی ترقی پسند ہیں لیکن پاکستان میں کسی عملی تحریک کی عدم موجودگی کی وجہ سے وہ بھی خاموش ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ تحریک کا جو نظریہ متحدہ ہندوستان میں تھا وہ ختم ہوگیا۔ فلموں سے وابستگی کی بنا پر ان کی ادبی تخلیقات پر اثر پڑا ہے جس کا انہیں احساس ہے لیکن ان کے خیال میں کسی دوسرے کام میں ادبی تخلیقات کے لئے اتنی بھی مہلت نہیں ملتی۔ عام شاعروں کی طرح حمایت وقت ضائع کرنے کے قائل نہیں۔ اپنی زندگی ایک باقاعدہ ٹائم ٹیبل کے مطابق گذارتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ ہر دور کا آدمی اپنے دور کے ادب کی رفتار سے غیر مطمئن رہا ہے۔ ادب نہ صرف اپنے دور کا ترجمان ہوتا ہے بلکہ مستقبل کی بات بھی کرتا ہے اور انسان میں اپنے حالات کی جانب سے بے اطمینانی ہو، تب ہی وہ مستقبل کو سنوارنے کی کوشش کرتا ہے۔ انہیں مصحفیؔ کا یہ مقطع بہت پسند ہے۔

مصحفیؔ ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

اپنے اشعار میں یہ شعر اکثر گنگناتے ہیں:۔

وہ گل کسی بہار کا احسان کیوں اٹھائے
جس کو ملی ہو زخمِ جگر کی شگفتگی

ایک سوال کے جواب میں حمایت علی شاعرؔ نے بتایا کہ ادب میں ابہام نئے سرے سے داخل ہوگیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ابہام کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ شاعر جو بات کہنا چاہتا ہے۔ اسے بخوبی نہ کہہ سکے، بات الجھ جائے اور کسی کے پلے ہی نہ پڑے۔ یہ بیان کی کمزوری اور شاعر کی خامی ہے۔ لیکن ادب میں ایک نئی تحریک چلی ہے جسے جدیدیت کہا جاتا ہے۔ اس میں ایک رجحان تجرید پسندی کا ابہام ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ انسان کی زندگی میں جو نفسیاتی پیچیدگیاں ہیں ان کا اظہار کیا جائے لیکن چونکہ یہ پیچیدگیاں بذات خود ناقابل فہم ہوتی ہیں اس لئے دوسرے کے لئے ان کا سمجھنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ لیکن پڑھنے والا اگر لکھنے والے کی ذہنی کیفیت اور احساس کا تاثر متبادل کرے تو اس ابہام کو گوارا کرلیا جائے گا۔ حمایت علی شاعرؔ کا کہنا ہے کہ اردو کے معنی ختم ہوجائے گی۔ کیونکہ یہ ایک خاص تہذیب سے متعلق تھی اور جب وہ تہذیب نہ رہی تو زبان کہاں رہ سکتی ہے۔ اردو میں نئے الفاظ کی شمولیت کو وہ ایک فطری عمل سمجھتے ہیں۔ اور ان کے خیال میں یہ کوئی مایوسی کی بات نہیں ہے۔ البتہ جو الفاظ سماعت پر بار ہوں گے وہ رہنے نہ پائیں گے۔ ہر زبان میں ایک فطری اور اجتماعی عمل کے طور پر تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ مصنوعی طور پر نہ انہیں لایا جاسکتا ہے نہ روکا جاسکتا ہے

حمایت ایک مخصوص اور منفرد ترنم سے پڑھتے ہیں اور جب پڑھتے ہیں تو محفل پر چھا جاتے ہیں۔ بحیثیت ایک انسان کے بھی حمایت نہایت مخلص اور اپنے حلقۂ احباب میں نہایت مقبول ہیں خود دکھ، تکلیفوں اور خارزار راہوں سے گذر چکے ہیں اس لئے دوسرے کے دکھ سے ان کا دل بہت جلد متاثر ہو جاتا ہے۔

کھانے میں انہیں دو پیازہ بہت پسند ہے۔ سخت جدوجہد کی طویل زندگی میں انہیں اکثر اکیلا بھی رہنا پڑا ہے۔ اس کے باوجود بقول ان کے اپنا کھانا خود پکانا نہیں سیکھا۔ اس سلسلے میں ہمیشہ عورت کے محتاج رہے۔

آج کے نوجوانوں کے لئے حمایت کا پیغام ہے کہ لفظ "ناممکن" اپنی لغت سے مٹادیں۔ محنت اور جدوجہد اگر خلوص نیت سے ہو تو ہزار ناکامیوں کے بعد سہی لیکن ایک نئی سحر ضرور طلوع ہوتی ہے۔ ان دنوں حمایت جامعہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ حمایت کا سن پیدائش ۱۹۳۱ء ہے۔

حمایت علی شاعر

عکسِ فن

زخموں کو پھول اشک کو شبنم کہو کہ اب
صاحب یہ چاہتے ہیں کہ غم کا بیاں نہ ہو

اس جہاں میں تو اپنا سایہ بھی
روشنی ہو تو ساتھ چلتا ہے

ملنے کو ایک اذنِ تبسم تو مل گیا
کچھ دل ہی جانتا ہے جو دل پر ستم ہوئے

بھٹکتے پھرتے ہیں دشتِ جنوں میں مثلِ غبار
وہ لوگ جن کو محبت کا آسرا نہ ملا!

ہر سنگ زنی مرے لئے بارشِ گل ہے
تھک جاؤ تو کچھ سنگ بدستِ دگراں اور

جانے وہ کونسی حسرت تھی کہ جس کی خاطر
زہر کو زہر سمجھ کر بھی پیئے جاتا تھا

شاعر لکھنوی

پیدائش ۱۹۱۷ء

زخم ہنر کا رنگ سلامت سب کو خبر ہو جائے گی
کتنے چہرے ہم نے تراشے ہاتھ قلم ہو جانے تک

شاعر لکھنوی
۲۱
۲
۱۹۷۹ء

شاعر لکھنوی

چرچ مشن ہائی اسکول، لکھنؤ میں مشاعرہ تھا۔ مصرع طرح تھا۔

"روک سکتی ہو تو بڑھ کر روک لے منزل مجھے"

اب سے پچاس برس قبل کا لکھنؤ تھا۔ ایک سے بڑھ کر ایک استاد موجود تھا لیکن ایک پندرہ سولہ سال کے لڑکے کی غزل نے مشاعرہ تہہ و بالا کر ڈالا۔ ایک ایک شعر کئی مرتبہ پڑھوایا گیا۔ یہ چونکا دینے والی اٹھان شاعر لکھنوی کی تھی۔

حسن پاشا نام، شاعر تخلص، ۱۶ر نومبر ۱۹۱۷ء کو پیدا ہوئے۔ اس سوال کے جواب میں کہ شاعری کا آغاز کیسے ہوا، کہتے ہیں کہ اسے عطیہ فطرت سمجھئے یا ستم ظریفی قدرت، شروع میں گھر والوں سے چھپ کر نشستوں میں شرکت کیا کرتے تھے لیکن شاعری بھی کہیں چھپتی ہے؟ (عشق اور مشک تو خواہ مخواہ کو بدنام ہیں)۔ گھر والوں کو معلوم ہو گیا لیکن وہ لکھنؤ کا گھرانا تھا بزرگوں نے فخر کیا کہ چلو لڑکے نے خاندان کا نام روشن کیا۔

اس زمانے میں فرنگی محل میں مولانا عنایت اللہ مرحوم کا دور تھا، وہاں بڑے معرکے کی نشستیں ہوتی تھیں۔ جو مسلسل تین دن اور تین تین رات تک جاری رہتی تھیں۔ صرف کھانے اور نماز کے لئے وقفہ ہوتا تھا۔ ایسے اہتمام کے مشاعرے لکھنؤ میں ہی ممکن تھے۔ خواجہ شمس الدین غوری مجذوب اور علامہ آرزو لکھنوی ان مشاعروں میں خاص طور سے شریک ہوتے تھے۔ شاعر لکھنوی اس وقت مبتدی تھے لیکن ان نشستوں سے انہوں نے بہت کچھ حاصل

کیا۔ کسی کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنے کی ضرورت تو پیش نہ آئی لیکن سید آلِ رضا، آنند نرائن ملا ۔ سراج لکھنوی اور جعفر علی خاں اثر لکھنوی کی صحبت نے ان کے فن کو ایسا نکھار بخشا جو شاید کسی اور کی شاگردی کرنے کے بعد بھی ممکن نہ تھا۔

شاعر صاحب نے اس زمانے کی نشستوں کا آج کل کے شاعروں سے موازنہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس وقت ہلڑ بازی نہیں ہوتی تھی۔ داد دینے کے لئے بڑا سلیقہ درکار تھا۔ مجال تھی کہ کوئی شخص شعر سمجھے بغیر واہ واہ کا شور مچا دے۔ سب کی نظر اساتذہ پہ لگی رہتی تھی۔ وہ داد دیتے تھے تو سب داد دیتے تھے۔ اور وہ خاموش رہتے تھے تو پوری محفل پہ سکوت چھایا رہتا تھا۔

شاعر لکھنوی کو شعر کہنے کے لئے بڑے پُرسکون ماحول کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے عموماً رات کو جب سب سو جاتے ہیں تب شاعر بیدار ہوتا ہے اور نصف شب گذر جانے کے بعد شاعری کا آفتاب طلوع ہو جاتا ہے۔

وہ ادب میں سیاسی اور سماجی تحریکوں کی اہمیت بخوبی سمجھتے ہیں۔ بعض تحریکوں کو سراہتے بھی ہیں لیکن اپنا دامن کبھی کسی تحریک سے وابستہ نہ ہونے دیا۔ ۱۹۶۷ء میں کراچی میں ادبی بحث چلی تھی کہ فولاد کے کارخانے اور مکئی کے کھیت پہ ادب وجود میں آسکتا ہے یا نہیں۔ انہوں نے اس سلسلے میں کہا تھا۔ کہ اگر کوئی شاعر واقعی ان چیزوں سے دل سے متاثر ہے اور آمد ہوتی ہے تو اسے ضرور لکھنا چاہئے لیکن مصلحتوں کے تحت آورد سے کام لینا غلط ہے۔

ادب کی موجودہ رفتار کے بارے میں آپ نے بتایا کہ رفتار چلنے کا نام ہے سو کبھی ادب جاری رہتا ہے اور کبھی اس میں جمود آجاتا ہے۔ مستقل صورت کوئی بھی نہیں۔ ان کے خیال میں ادب میں تجربہ اچھی چیز ہے۔ مگر تجرباتی ادب کے قائل نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ موجودہ دور تجرباتی شاعری کے دور سے گذر رہا ہے۔

شاعر لکھنوی کو ادبی اور تنقیدی کتابیں پڑھنے کا شوق ہے۔ مشاعرے میں ترنم سے بھی پڑھتے ہیں۔ اور تحت اللفظ بھی۔ غرض یہ موڈ پہ منحصر ہے۔

۱۹۴۲ء میں شادی ہوئی تھی۔ ماشاءاللہ سات بچے ہیں۔ لباس میں عموماً شیروانی استعمال کرتے ہیں۔ اپنا وزن کرانے کے قائل نہیں کہتے ہیں تو لنے سے برکت نہیں ہوتی۔ کھانے میں گوشت اور ماش کی پھریری دال ان کی پسندیدہ ڈشیں ہیں لیکن کبھی وقت پڑے تو اپنے ہاتھ سے کچھ نہیں پکا سکتے۔ اگرچہ کہتے ہیں کہ آملیٹ بنا لیتا ہوں مگر تجربہ شرط ہے۔

شاعر لکھنوی کو اپنے اشعار میں

ہم تو سمجھے تھے کہ ہے عشق یہیں تک محدود
منزلیں اور بھی آئیں رسن و دار کے بعد

سب سے زیادہ پسند ہے اور جب میں نے پوچھا کہ کسی دوسرے شاعر کا کوئی ایسا شعر سنائیے جو آپ کو سب سے زیادہ پسند ہو تو آپ نے عندلیب شادانی کا یہ شعر سنا دیا۔

جب کسی سے کوئی پیمان وفا کرتا ہے
کانپ اٹھتا ہوں کہ میرا ہی سا انجام نہ ہو

جس وقت یعنی ۲۲ فروری ۱۹۷۹ء کو میں یہ سطور لکھ رہی ہوں شاعر صاحب نے مجھے بتایا کہ ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ بعنوان "زخم ہنر" کا مسودہ تیار ہے۔ اور انشاء اللہ جلد ہی یعنی ۱۹۷۹ء میں چھپ کر ان کے مداحوں کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا۔

گو شاعر لکھنوی کا کلام اب تک کتابی شکل میں شائع نہیں ہوا۔ لیکن ان کے ناقدین نے ان کے اشعار کئی جگہ حوالے کے طور پر شریک کئے ہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں (بھارت) نے اپنی کتاب "اردو غزل" میں ان کے چھ اشعار منتخب کئے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے "متغزلین اور غزل" میں اردو شاعری کے پچیس سال کے عنوان سے آٹھ شعر منتخب کئے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے "اردو رباعی کا فنی و تاریخی ارتقاء" میں دو رباعیات شامل کیں اور "منتخب غزلوں" کے نام سے نریش کمار شاد (بھارت) کی مرتبہ دو کتابوں میں شاعر لکھنوی کی غزلوں کا انتخاب موجود ہے۔

شاعر لکھنوی

عکسِ فن

موسم کی بے راہ روی پر ہنس دینا آسان نہیں
وہ غنچے کیا اب کھلیں گے جن غنچوں میں جان نہیں

صرف آنسو ہی جوابِ غمِ دوراں تو نہیں
اک تبسم سے بھی یہ فرض ادا ہوتا ہے

بدل دیا ہے کچھ اتنا خزاں نے چہروں کو
بہار آئے تو شاید ہمیں نہ پہچانے

مری طلب کا وہ عالم مری نظر میں رہا
کہ منزلوں پہ پہنچ کر بھی میں سفر میں رہا

یہ پشیماں سی نظر یہ عرق آلود جبیں
تم نہ تھے اتنے حسیں ترکِ وفا سے پہلے

جینے کا عمل ہے خواب جیسا
دریا ہے یہاں سراب جیسا

گھر میں کوئی نہ تھا تو اے شاعر
خامشی نے جلا دیئے ہیں دیئے

اجنبی سی کوئی صورت شاعر
راستہ بھول گئی ہے مجھ میں !

شبنم رومانی

مثنوی سیر کراچی

پیدائش ۱۹۲۸ء

ہم کو حالات نے اس طرح کیا تھا یکجا
جیسے گلدان میں دو پھول لگے ملتے ہیں

۸ - ۱ - ۱۹۷۹ء

شبنم رومانی

وہ دسمبر کی ٹھٹھرا دینے والی سردی کی شام تھی۔ ابھی سورج ڈوبا بھی نہ تھا لیکن کہر آلود شام دیکھ کر محسوس ہوتا تھا رات کی دلہن اپنا آنچل پھیلانے جا رہی ہے۔ ایسے میں سمندر کے کنارے ٹھنڈی اور بھیگی ریت پر سنسناتی ہواؤں کے تھپیڑے سہہ سہہ کر تڑپتی مچلتی آتی جاتی اور کسی بد نصیب کے مستقبل کی طرح بن بن کر بگڑنے والی موجوں کا نظارہ کرنے کو جی چاہے تو خواہش غیر معمولی ہی لیکن غیر فطری ہرگز نہ ہوگی۔

لیکن خواہشات تمام تر پوری نہیں ہو جاتیں۔ خنکی تھی کہ موج بلا کی طرح بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے بجلی کے اسٹوو پہ پانی گرم کر کے پیالی میں انڈیلا۔ اور پھر کافی دودھ شکر سب اکٹھے گھول کر کتاب لے کر صوفے میں دبک گئی۔ گرم گرم کافی کی پیالی اور کتاب۔ تیز دھوپ میں اچانک درخت کا سایہ مل جائے اور سبک ہوا کا جھونکا تپتے ہوئے رخساروں کو چھو جائے تو جو لطف حاصل ہوتا ہے۔ وہی اس نکھرے نکھرے موسم سے سرور آگیں کیف اس وقت حاصل ہو رہا تھا۔ تب اچانک کھڑکیوں کے شیشوں کی دیوار سے ایک مترنم راگ پھوٹ پڑا۔ رم جھم کا راگ۔ پھر جو ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا تو کھڑکھڑاتے ہوئے پٹ یکبارگی کھل گئے، برفیلی ہوا کا بھیگا بھیگا جھونکا کھڑکی کی راہ در آیا۔ میں کھڑکی کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی اور "مہاوٹ" کے رنگ دیکھنے لگی۔ چند ہی منٹوں میں اچانک طور پر جس طرح پھوار کا کھیل شروع ہوا تھا۔ اسی طرح ختم بھی ہو گیا۔ میری نظر سامنے

دیوار پر پڑی اور نہ جانے ذہن کے کس گوشے میں چھپا ہوا یہ شعر بے اختیار یاد آگیا۔

ــــــہ اب کے بارش ایک ساتھی دے گئی
ایک چہرہ بن گیا دیوار پہ!

شعر خوب صورت ہو تو ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں محفوظ ضرور ہو جاتا ہے اور یہ شعر... یہ تو اس وقت نہ جانے کیوں ایک غیر مادی لیکن مجسم حقیقت بن کر سامنے آگیا تھا۔

کون ہے اس خوب صورت شعر کا خالق؟ میں نے سوچا لیکن بار بار سوچنے پر بھی یاد نہ آیا۔ پھر آج جب کاغذ میز پر پھیلے پڑے تھے۔ قلم ہاتھ میں تھا۔ اور اشعار کا انتخاب ہو رہا تھا کہ میں چونک پڑی۔ تو یہ شعر... یہ خوب صورت شعر ان کا ہے۔! آئیے میں آپ کو بھی اس شعر کے خالق سے متعارف کراؤں۔

یہ ہیں مرزا عظیم بیگ چغتائی

آپ چونکے کیوں۔ اس میں قطعی مبالغہ نہیں کہ ان کا نام عظیم بیگ چغتائی ہے اور تخلص شبنم رومانی۔ شاہ جہاں پور (یوپی) میں ۱۹۳۰ء میں مرزا اظہر احمد بیگ کے گھر پیدا ہوئے۔ ان کی کم سنی میں ہی والدِ محترم کا انتقال ہو گیا اور بعد میں اظہر بیگ مرحوم کی ذاتی لائبریری سے جب ان کا کلام برآمد ہوا تو پتہ چلا کہ مرحوم شاعر بھی تھے۔ خرد تخلص کرتے تھے اور قدیم رنگ میں شعر کہتے تھے۔ ہونہار بروا والی بات تھی چنانچہ یہ بھی یاد نہیں کہ شاعر کب نہ تھے اور کب ہوئے۔ البتہ صغیر سنی میں کچھ شعر جو بہشتی زیور پر لکھے تھے اب بھی محفوظ گراں ہیں اور خود ان کے لئے سرمایہ حیرت کہ الفاظ کا بے عیب استعمال اور خیالات کا بے محابہ اظہار کیونکر ہوا۔

ملاحظہ ہو ــــــہ

ایک چیز بصیرت ہے ایک چیز بصارت ہے
کاندھوں پہ غریبوں کے سردارِ امارت ہے

اور جب کالج کی چہار دیوار تلے پہنچے تو کم سنی کا یہ خیال شعور کے سانچے میں ڈھل چکا تھا۔

ایک عیشِ طلب عطر میں ڈوبے ہوئے شہ سے
بہتر ہے پسینے میں نہایا ہوا مزدور

عمر کی کچھ اور منزلیں طے کیں تو الفاظ و شعور کا لباس بھی بدلا۔

حور و قصور و کوثر پہ ہیں قابض چند انساں
باقی دنیا خوابوں کی جنت میں رہتی ہے

شبنم رومانی نے ابتدائی عربی فارسی کی تعلیم مدرسہ عین العلم میں حاصل کی ۱۹۴۴ء میں بینی مادھو ستیہ سبھا ہائی سکول شاہ جہاں پور سے میٹرک کیا۔ اور ۱۹۴۸ء میں بریلی کالج (آگرہ یونیورسٹی) سے بی کام کی ڈگری حاصل کی۔

والد کے انتقال کے بعد والدہ محترمہ صدر النساء بیگم اور نانا حاجی حافظ نعمت اللہ خاں مرحوم نے تربیت کی۔ شعر و سخن کے سلسلے میں والدہ نے تو کبھی حوصلہ شکنی نہیں کی لیکن ایک بار ڈاک سے ایک رسالہ ان کے نام سے موصول ہوا تو نانا صاحب بہت چیخے چلائے "دیکھنا صاحبزادے کے کرتوت۔ شبنم بنے ہیں۔ پھولوں پہ ٹپکتے ہیں۔ اب یہ گئے ہاتھ سے۔ دیکھنا یہ سب لکھا پڑھا ڈبو دیں گے"۔ پھر یہ خفگی اس وقت دور ہوئی جب ایک محفل میلاد میں اپنے چہیتے نواسے کی زبان سے نعت سنی۔

شبنم شعر کہنے کے لئے اہتمام بھی خوب کرتے ہیں۔ سلیقے سے سجی ہوئی میز ہو اور میز پہ چائے کا گرم گرم پیالی جس سے بھاپ اٹھ رہی ہو۔ پھر رواں پنسل یا قلم، سفید براق سا فولسکیپ سائز کا کاغذ۔ ان کے خیال میں اہتمام جتنا عمدہ ہوگا شعر اتنے ہی اعلیٰ درجے کے برآمد ہوں گے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ آپ نے کھڈی یا مشین پہ نرم و گداز بے ریشے کی مصری روئی کا سوت چڑھایا تو کپڑا بھی نرم و نازک برآمد ہوگا اور جو سڑی لیسی روئی ڈالی، خار دار ریشے دار، تو ریشم تو نکلنے سے رہا، پھر موٹا جھوٹا کپڑا ہی لیجیے۔ یہ تو رہی اہتمام والی بات۔ اب بے اہتمامی کا حال سنئے کہ مشاعرے کی نظامت کر رہے ہیں تو ہر آنے والے شاعر کا فی البدیہہ تعارف جانے والے شاعر کی غزل کی زمین میں اشعار کے ذریعے ہوگا۔ کسی نے رباعیاں پڑھیں۔ دوہے یا قطعات پیش کئے تو اگلے شاعر کا تعارف

دو ہے، رباعی یا قطعات ہی ضرور ہوگا۔ اس کا تعلق طبیعت کی نفاست سے نہیں، میکانکی ذہن سے ہے جو اللہ میاں کی دین ہے، لیکن شبنم کے نزدیک یہ میکانکی عمل نہ تو قابل فخر ہے نہ مستحسن بقول ان کے فن اس سطح سے بہت بلند ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بے حساب غزلیں کہیں اور بے شمار تلف کر دیں لیکن ان کی تخلیقی صلاحیتیں صرف نظم کے میدان تک محدود نہیں رہیں۔ ان کے موڈ کی بات ہے کہ جب دھن سوار ہوئی تو افسانے، انشایئے اور بچوں کے لئے نظمیں... سبھی کچھ لکھ ڈالا۔ مثنوی کی دھن سوار ہوئی تو پوری ایک کتاب مثنوی "سیر کراچی" کے عنوان سے لکھ ماری (جس کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ بچوں کی نظموں کا مجموعہ، افسانوں کا مجموعہ، انشائیوں کا مجموعہ۔ اور غزلوں نظموں کے کئی مجموعے مرتب کئے ہوئے پڑے ہیں۔

ادب کی موجودہ رفتار کے متعلق انہوں نے فرمایا کہ "پاکستان میں شاعری اور تنقید نے بہت ترقی کی ہے۔ مگر فکشن کی طرف لکھنے والوں کی توجہ کم رہی ہے۔ تنقید کے باب میں سوائے مجنوں گورکھپوری کے پرانے لکھنے والوں نے بہت مایوس کیا ہے۔ البتہ نئے ناقدین میں وزیر آغا، سلیم احمد، محمد علی صدیقی، سلیم اختر، انجم اعظمی، سحر انصاری اور بعض دوسرے دوستوں نے ادب پر سنجیدگی کے ساتھ بحثیں کی ہیں اور تنقید کو نئی جہات سے آشنا کیا ہے

موجودہ دور میں غزل میں جو نئے تجربات ہو رہے ہیں۔ ان کے بارے میں شبنم کا خیال ہے کہ غزل کی صنف میں بلا کی جاذبیت اور وسیع تر امکانات ہیں۔ اقبال، رفیعی اور شکیب جلالی۔ کی غزلیں اس کی واضح مثال ہیں۔

اردو شعر و ادب کی ترقی کے لئے چند تجاویز پیش کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اچھی لائبریریوں اور تحقیقی اداروں کی ضرورت ہے۔ ادبی کتابوں کی اشاعت کے لئے باہمی امداد کے اصول پہ اشاعتی ادارے کھولے جائیں، شاعروں اور ادیبوں کے مفاد کا تحفظ کیا جائے۔ رائٹرز گلڈ اگر چاہتی تو یہ مقاصد پورے ہو سکتے تھے۔ میں نے اپنے رفقاء کے تعاون سے انہی مقاصد کے پیش نظر ۱۹۶۰ء میں "ارباب قلم" (پاکستان) کے نام سے ایک ادبی ادارہ کی

بنیاد ڈالی ہے۔ یہ ادارہ امداد باہمی کے اصولوں پر کام کر رہا ہے۔ حال ہی میں "ارباب قلم فاؤنڈیشن" کی بنیاد بھی ڈالی گئی ہے۔ جو کثیر المقاصد ٹرسٹ ہے۔ اس کے علاوہ مکتبہ ارباب قلم بھی قائم کیا ہے جس کے اہتمام سے کئی ادبی مجلے اور اہم کتابیں شائع کی گئی ہیں۔ ان کا اپنا شعری مجموعہ "جزیرہ" کے نام سے اس مکتبے کے تحت شائع ہو رہا ہے۔

بات ادیبوں اور شاعروں سے ہوتی ہوئی مشاعروں تک آ پہنچی۔ اس ضمن میں شبنم نے بڑی سچی سچی باتیں کہیں۔ مثلاً یہ کہ مشاعروں نے اردو کے شعری ادب کو نقصان پہنچایا ہے داد تو بہر حال فنکار کی کمزوری ہے۔ چنانچہ متعدد بلند خیال شعراء کو محض مشاعرے میں داد حاصل کرنے کے لئے پست سطح پر اتر کر شعر کہتے دیکھا گیا ہے۔ کچھ شعراء ترنم کی مشکلات کے سبب بعض مخصوص بحروں میں شعر کہنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ کچھ بہت اچھے شعراء مشاعروں کی گندی سیاست اور سامعین مشاعرہ کی بدذوقی سے بددل ہو کر شاعری ہی سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں۔ "مشاعرہ" جو نئے شعراء کے لئے تربیتی ادارہ اور مشاق شعراء کے لئے اپنے قاری سے براہ راست تعلق کا ذریعہ ہے۔ اب صرف ورائٹی شو بن کر رہ گیا۔ اس لئے عام مشاعروں اور بالعموم ٹکٹ کے مشاعروں کی حوصلہ افزائی نہیں کرنی چاہئے۔ ہاں ان علاقوں میں مشاعرے مفید ہو سکتے ہیں جہاں اردو کی ترویج کی ضرورت ہے۔

چلتے چلتے ایک مزے کی بات اور سن لیجئے کہ شبنم صاحب آزاد نظم کے سخت مخالف رہے ہیں۔ مگر ۳۱ دسمبر ۶۸ء کو جب انہوں نے اپنی زندگی کے چالیس سال مکمل کر لئے تو رباعی کے بجائے اچانک ان پر بقول ان کے "نظم آزاد کا پھاٹک کھل گیا۔ اس عجیب اتفاق اور دلچسپ تجربے کے بعد ان کی رائے آزاد نظم کے بارے میں یکسر بدل چکی ہے۔ بقول ان کے یہ FORM اظہار و ابلاغ کا بہترین ذریعہ ہے اور اس کا

سخن ور (تذکرہ شعراء)

آہنگ پابند شاعری سے کسی طرح کم موثر نہیں ہے۔ شبنم صاحب ۱۹۷۳ء سے روزنامہ "مشرق" میں پابندی کے ساتھ ادبی کالم لکھ رہے ہیں۔ جن کا ایک انتخاب کتابی شکل میں آنے والا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ بچوں کے لئے بھی لکھتے تھے۔ بچوں کے لئے ان کی نظمیں بھی "کھیل کھیل میں" کے عنوان سے زیر طبع ہیں۔

شبنم رومانی

عکسِ فن

اپنی مجبوری کو ہم دیوار و در کہنے لگے
قید کا ساماں کیا اور اس کو گھر کہنے لگے

حسن کا چاکِ گریباں دیکھنا
یہ ہمارے عہد کی پہچان ہے

ایک ہنگامہ ہے میرے اردگرد
نصب ہوں بُت کی طرح بازار میں

ہر لفظ ڈوبتا نظر آیا کتاب میں
اُبھرا ورق ورق ترا چہرہ کتاب میں

نہ پڑھ یُوں کہیں کہیں سے مجھے
کہ مَیں انسان ہوں کتاب نہیں

کبھی خوشبو نے دکھایا چہرہ
کبھی مجھ کو نظر آئی آواز

ہم کو حالات نے اس طرح کیا تھا یکجا
جیسے گلدان میں دو پھول کھلے ملتے ہیں

مجھے یہ زعم کہ مَیں حُسن کا مصوّر ہوں
اُنہیں یہ ناز کہ تصویر تو ہماری ہے

شکیب جلالی

روشنی اے روشنی



پیدائش ۱۹۳۴ء
وفات ۱۹۶۶ء

شکیب جلالی

علی گڑھ (بھارت) کے قصبہ جلالی میں یکم اکتوبر ۱۹۳۴ء کو جنم لینے والے سید حسن رضوی نے اپنا تخلص شکیب رکھا۔ شاعری کا آغاز چودہ سال کی عمر یعنی ۱۹۴۸ء میں ہوا۔ ۱۹۵۶ء میں شادی ہوئی۔ شاعر جواں حوصلہ تھا۔ والدین کا اکلوتا بیٹا اور چار بہنوں کا بھائی دس سال کی عمر میں ماں کی ممتا سے محروم ہو گیا۔ والدہ کا انتقال ایک حادثہ میں ہوا تھا۔ شکیب کے والد یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے اور اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے۔ شکیب کے کاندھوں پہ چھوٹی سی عمر میں خاندان کی کفالت کا بوجھ آن پڑا۔ بدایوں سے میٹرک کیا اور بہنوں کے ہمراہ راولپنڈی آگئے۔ یہاں بھی حالات ناسازگار ہی رہے۔ لیکن شکیب نے ہمت نہ ہاری اور معاشی تگ و دو کے ساتھ ساتھ لاہور سے بی۔اے کر لیا۔ پھر تھل ڈیولپمنٹ اتھارٹی سے وابستہ رہے۔ قیام جوہر آباد اور بھکر میں رہا۔

شکیب کی زندگی میں ان کا کلام کتابی صورت میں شائع نہ ہو سکا۔ حالانکہ انہوں نے اپنے مجموعۂ کلام کا نام اپنی زندگی ہی میں تجویز کر لیا تھا۔ جو ان کے انتقال کے بعد محترم احمد ندیم قاسمی نے مکتبۂ فنون سے اگست ۱۹۷۲ء میں شائع کیا۔ مکتبۂ فنون نے اس کتاب کے جملہ حقوق اشاعت و اخذ و ترجمہ شکیب کی بیوہ محترمہ محسنہ خاتون کے حق میں محفوظ کر دیے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی صاحب نے ۱۹۶۸ء میں شکیب جلالی کے فن پہ اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "جب کوئی مجھ سے پوچھتا ہے کہ گذشتہ دس بارہ برس کے اندر کوئی ایسا شاعر ابھرا ہے جس نے صحیح معنوں میں بھرپور غزل کہی ہے تو بغیر کسی تکلف کے میں شکیب جلالی کا نام لیتا ہوں۔ ناصر کاظمی، احمد فراز، اور شہزاد احمد کے سے کامیاب غزل گو شعراء کی موجودگی میں کسی نئے شاعر کا غزل کے میدان میں اپنا ایک مقام پیدا کر لینا کچھ آسان نہ تھا مگر شکیب کی بے پناہ فنی اور تخلیقی قوتوں نے چند ہی برس کے اندر اسے ان غزل گو شعراء کے برابر لا کھڑا کیا ہے۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں، شکیب کے دم سے اردو غزل نے ایک اور سنبھالا لیا ہے۔ شکیب کی غزل نے اردو شعر و ادب کے قاری کو بتایا کہ غزل گو بیسویں صدی کے نصف آخر کا ایک باشعور فرد ہو کر بھی غزل کہہ سکتا ہے اور ایسی غزل کہہ سکتا ہے جس میں عصرِ رواں کی روح بول رہی ہو اور جو اس کے باوجود غزل ہو۔ احساس کی نزاکت اور تجربے کی ہمہ گیری کی مثالیں نئے غزل گو شعراء میں عام ہیں مگر اس نزاکت اور اس ہمہ گیری کو شعر میں یوں منتقل کرنا کہ ہر شعر خوب صورت بھی ہو اور غالب، اقبال اور فراق کی غزل سے الگ بھی پہچانا جا سکے اور عصرِ جدید کا شعر بھی کہلائے اور اس کا تاثر ہنگامی بھی نہ ہو، تو یہ شکیب کا حصہ ہے۔ اسی لئے آج شکیب اردو غزل کی امید گاہ ہے"۔

شاید ناسازگار حالات کی بنا پہ شکیب جلالی ایک ناقابلِ فہم دماغی مرض میں مبتلا ہو گئے اور صرف ۳۲ سال کی جوان عمر میں ۱۲ نومبر ۱۹۶۶ء کو ریل گاڑی کے نیچے آ کر خودکشی کر لی اور سرگودھا میں دفن ہوئے۔

شکیب جلالی

عکسِ فن

سوچو تو سلوٹوں سے بھری ہے تمام روح
دیکھو تو اک شکن بھی نہیں ہے لباس میں

آکر گرا تھا کوئی پرندہ لہو میں تر
تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر

موتی کیا کیا نہ پڑے ہیں تہِ دریا لیکن
برف لہروں کی کوئی توڑنے والا ہی نہیں

ہر موڑ پر ملیں گے کئی راہزن شکیب
چلئے چھپا کے غم بھی زر و مال کی طرح!

میں وہ آدم گزیدہ ہوں جو تنہائی کے صحرا میں
خود اپنی چاپ سن کر لرزہ براندام ہو جائے

اپنے غم پر تبسم کا پردہ نہ ڈال
دوست! ہم ہیں سوار ایک ہی ناؤ پر

نہ سوچئے تو بہت مختصر ہے سیلِ حیات
جو سوچئے تو یہی زندگی سمندر ہے!

منظور حسین شور



نبضِ دوراں

دیوارِ ابد

پیدائش ۱۹۱۳ء

حرم کی شمع بجھی بتکدے کے دیپ بجھے
میں جل رہا ہوں مجھے اعتبار ہو کہ نہ ہو

پروفیسر منظور حسین شور

۲۷ مارچ ۸۹ء

منظور حسین شورؔ

فارسی میں لفظ شور کے معنی ہیجان اور جوش کے ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں علیگڑھ یونیورسٹی کے ایک طالب علم نے منظور حسین نے اپنی فارسی نظم وائس چانسلر سر سلیمان کو سنائی تو وہ بہت خوش ہوئے اور کہا

"کتنا شور ہے اس نظم میں"

اس کے بعد سے منظور حسین نے اپنا تخلص شورؔ رکھ لیا۔ پروفیسر شورؔ کے آباؤاجداد انیسویں صدی کے آغاز میں ایران سے ہندوستان آئے تھے۔ اور حسن گنگو بہمنی کے پایہ تخت ایلچپور میں آباد ہو گئے تھے۔ پروفیسر شور وہاں سے ۴۴ میل دور امراؤتی میں ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ شاعری کا ذوق فطری تھا۔ آٹھویں جماعت میں تھے کہ شعر کہنے لگے۔

شاعری کے بارے میں پروفیسر شورؔ کا خیال ہے کہ ہر انسان کو تین قسم کے حالات سے واسطہ پڑتا ہے۔ یعنی سماجی، معاشی اور سیاسی اور شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ عوام پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ وہ بالمقصد شعر کہنے کے قائل نہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ شاعری تو وہی کر سکتا ہے جسے کسی بادشاہ کی شان میں قصیدہ کہنا ہو۔ البتہ خارجی عوامل بھی اس کو شعر کہنے پر اکساتے ہیں جیسے شاعری سے فطری لگاؤ ہو۔ محبت ایک فطری جذبہ ہے۔ بالکل یوں کہئے کہ ایک حادثہ ہے، یہ حادثہ جب کسی ایسے شخص پر گزرتا ہے جو فطری شاعر ہو تو وہ شعر کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے پروفیسر شورؔ نے داخلی اور خارجی شاعری کے درمیان حد فاصل کھینچتے ہوئے بتایا کہ داخلی

شاعری وہ ہے جس میں شاعر کی اپنی مسرت اور ملال کی کیفیت ہو اور خارجی شاعری وہ ہے جس کی کوئی حد متعین نہیں ہے ۔ جس کا مطالعہ جتنا زیادہ ہوگا اتنی ہی اس کی شاعری میں وسعت ہوگی ۔

محبت کو حادثہ ثابت کرتے ہوئے شور صاحب نے یہ شعر سنایا ۔

عشق اپنی خوشی سے کون کرے
عشق اگر ناگہاں نہ ہو جائے

اس کے ساتھ ہی شور صاحب یہ بھی سمجھتے ہیں کہ دنیا کی عظیم شاعری صرف زلف و رخ کی شاعری کبھی نہیں ہو سکی ۔

داغ کے ایک شاگرد حیات خاں منظہر اسکول میں ان کے ٹیچر تھے ۔ وہ ان کا کلام سن کر بڑی حوصلہ افزائی کرتے تھے ۔ شور صاحب نے شاعری میں کسی سے اصلاح نہیں لی ۔ ۱۹۲۸ء میں جب وہ علی گڑھ پہنچے تو وہاں جاں نثار اختر اور شان الحق حقی وغیرہ موجود تھے ان سے متاثر ہو کر نظمیں کہنے لگے ۔ نیاز فتحپوری کے "نگار" میں ان کا کلام کثرت سے شائع ہوا ۔ فارسی کلام حیدرآباد دکن میں قمر ساحری کے پاس محفوظ ہے ۔ اس کے مجموعے کا نام 'ما زندہ ام' (ہم زندہ ہیں) تجویز ہوا ہے ۔ ۱۹۶۶ء تک یہ اپنا کلام انہیں بھیجتے رہے وہ مصرعہ بھیجتے تھے یہ غزل کہہ کر روانہ کرتے تھے اب اُدھر کچھ عرصہ سے انہوں نے چپ سادھ لی ہے ۔ نہ مجموعہ شائع ہوا نہ کلام واپس ملا ۔ بہرحال شور صاحب کے پاس ان کی نقل موجود ہے ۔

پروفیسر شور نے علیگڈھ سے ۱۹۳۲ء میں فارسی میں ایم اے اور ایل ۔ ایل بی کیا ۔ اس کے بعد ۱۹۳۶ء میں ناگپور سے اردو میں ایم اے کیا ۔ اور دو سال بعد اسی یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو گئے ۔ برصغیر کی تقسیم تک آپ وہیں رہے ۔ ۱۹۴۸ء میں آپ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں آگئے ۔ پولیس ایکشن کے بعد آپ ۱۹۴۹ء میں کراچی پہنچے لیکن حالات سازگار نہ پائے ۔ چنانچہ چار ماہ بعد زمیندار کالج گجرات چلے گئے ۔ ۱۹۵۱ء میں وہاں سے اسلامیہ کالج لائلپور آئے ۔ اور اس کے اگلے سال گورنمنٹ کالج لائلپور میں ملازم ہوگئے ۱۹۶۳ء سے کئی سال تک وہیں شعبۂ اردو کے سربراہ رہے ۔

۱۹۶۵ء میں کراچی میں جو بحث چلی تھی کہ شاعروں کو فولاد کے کارخانوں پر نظمیں کہنا چاہیئے، اس سلسلے میں جب میں نے پروفیسر شور علیگ سے سوال کیا تو انہوں نے رائے دی کہ فولاد کے کھیتوں اور مکئی کے کھیتوں پر نظم نہیں کہنا چاہئے۔ یہ موضوعات خالص نثر کے ہیں۔ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ شاعری میں ابلاغ ہوتا ہے اور نثر میں تبلیغ ہوتی ہے اگر شعر میں تبلیغ کی جائے۔ تو شعر اور پروپگنڈے میں فرق ہی کیا رہ جاتا ہے۔ پروفیسر شور کا کہنا ہے کہ آپ انسان پر نظمیں کہیے۔ مزدور پر نظمیں کہیئے۔ اس کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کیجئے لیکن مشینوں اور کارخانوں کے نظام کی تبلیغ نہ کیجئے۔ روس میں ایک ادیب نے کتاب لکھی ہے۔ جس کا عنوان ہے (NOT BY BREAD ONLY) اس نے لکھا ہے کہ زندگی ایک کثیر الاطراف حقیقت ہے جس کے بے شمار پہلو ہیں۔ محض روٹی اور عورت ہی کا نام زندگی نہیں ہے۔

پروفیسر شور نے سوال کیا کہ آخر غالب اور میر کو بڑا شاعر کیوں مانا جاتا ہے۔ کیا انہوں نے مزدوروں پر نظمیں کہی ہیں؟ بڑا شاعر فطرت کے نگار خانے میں زیادہ سے زیادہ تصاویر کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ غالب کا شعر ہے۔

؎ دجلہ قطرے میں دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

یہاں 'کل' کے معنی روٹی کے نہیں ہیں۔ یہ تو ایک مادی، حیوانی ضرورت ہے۔ تبلیغی شاعری کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے لیکن جس شاعری میں ابلاغ ہو اس میں نظیر اکبر آبادی کی فضا آجاتی ہے۔ یہاں پروفیسر شور نے خود اپنا شعر سنایا۔

؎ مرے حساس دل میں درد ہے سارے گلستاں کا
مجھے ہر شاخ شاخِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

شور صاحب ادب کی موجودہ رفتار سے قطعی مطمئن نہیں اور اس کی وجہ انہوں نے یہی بتائی کہ "جب آپ ادب کے پاؤں میں تبلیغ کی زنجیریں ڈال دیتے ہیں اور خطوطِ سیر کو متعین کر دیتے ہیں تو آپ فکر و عمل کی آزادی سلب کر لیتے ہیں۔ جب کہ شعراء کی کوئی جماعت یا گروہ اگر بندشے

ٹکے موضوعات پر نظمیں کہنا شروع کرے تو ادب تو بہت پیدا ہو سکتا ہے۔ مگر وہ محض اعادہ ہوگا۔ تخلیق کا امکان ختم ہو جائے گا۔ ایسا ادب پلیٹ فارم پارٹی اور پروپگنڈے کے بیساکھیوں کے سہارے چلتا ہے۔

یہاں میں نے شورؔ صاحب سے ایک سوال کیا:۔
"گستاخی معاف! آزادؔ اور حالیؔ گروپ نے بھی ایک زمانے میں بندھے ٹکے موضوعات پر نظمیں کہنے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ کیا آپ کے خیال میں وہاں تخلیق نہیں تھی؟"
اس کا جواب شورؔ صاحب نے یہ دیا کہ انہوں نے غزل کی حد بندی توڑ کر نظم کی فضا پیدا کی تھی۔

؎ عروسِ فکر کو ہم قید سے آزاد کرتے ہیں
نئے مضمون نیا رنگ سخن ایجاد کرتے ہیں

چکبستؔ

؎ اب بھاگتے ہیں سایہ زلفِ بتاں سے ہم
کچھ خود سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

حالیؔ

غزل کے خلاف حالیؔ نے جو بغاوت کی اس کی وجہ روایتی شاعری تھی۔ انہوں نے کہا فطرت کو آنکھ کھول کر دیکھو یہ بہت وسیع ہے۔ شاعر ترجمانِ دل ہی نہیں ترجمان فطرت بھی ہوتا ہے اور فطرت کے معنی محض کارخانے روٹی اور عورت کے نہیں ہوتے۔

شورؔ کو شعر کہنے کے لئے کوئی خاص ماحول درکار نہیں۔ مشاہدے یا کسی واقعے سے جب بھی متاثر ہوتے ہیں شعر کہہ لیتے ہیں۔ مشاعرے میں ترنم سے بھی پڑھتے اور تحت اللفظ بھی یہ موڈ پر منحصر ہے۔

۱۹۳۱ء میں جب وہ بی اے میں تھے تو امراؤتی میں ان کی شادی کر دی گئی تھی۔ چھ بچے ہیں۔ تین لڑکے، تین لڑکیاں ہیں۔ مطالعہ باقاعدگی سے کرتے ہیں اور فلسفہ اور تنقید ان کے پسندیدہ موضوع ہیں۔ کہانی اور ناول کو زیادہ "لفٹ" نہیں دیتے۔

"دیوارِ ابد" اور "نبضِ دوراں" کے نام سے ان کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ تیسرا زیرِ ترتیب ہے۔ "نبضِ دوراں" کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ اسے کسی بھی مجموعے کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔

شورؔ صاحب کو یہ شعر بہت پسند ہے لیکن یاد نہیں کس کا ہے۔

ے وہ کیا کیا کر گئے دشوار منزل
ہمارے ساتھ دو اک گام چل کر

اپنے اشعار میں انہیں یہ شعر پسند ہے:۔

ے حرم کے دیپ بجھے بتکدے کے دیپ بجھے
میں جل رہا ہوں تجھے اعتبار ہو کہ نہ ہو

شورؔ پہلے شورؔ علیگ کہلاتے تھے۔ پھر علیگ کو اپنے نام سے خارج کر دیا کہ اب ہر کس و ناکس اور ان پڑھ نے بھی خود کو علیگ کر دیا ہے۔ جامعہ کراچی میں شعبہ اردو سے وابستہ ہیں۔ ان کی رباعیات، غزلیات اور منظومات کے علیحدہ علیحدہ مجموعے زیرِ ترتیب ہیں۔ ایک مجموعہ تنقیدی مضامین کا بھی تیار کر رہے ہیں۔ انہوں نے پچھلے دنوں ایک طویل ترین نظم کہی ہے "صلیبِ انقلاب"۔ صرف ایک بند حاضرِ خدمت ہے۔

میری نظروں میں نہ تھی آدمیت کی تقسیم
میں سمجھتا تھا کہ انسان ہے اس سے بھی عظیم
اس سے آگے نہ غمِ فکر رسا دے مجھ کو
میرے معبود کوئی اور سزا دے مجھ کو

اس عمر میں بھی شورؔ کی فکر جواں ہے۔ گفتگو میں جولانی ہے اور دل ویسا ہی خوبصورت اور زندہ ہے جیسا اس دنیا میں آنے کے بعد پہلی سانس لیتے وقت تھا۔

☆

پروفیسر شور

عکسِ فن

ہر نفس اپنی ذات سے اُلجھن
کتنی دشوار وضع داری ہے!

وہ نقاب اُٹھ بھی جاتا تو نظر کہاں سے لاتے
ترے روبرو بھی تیرا وہی انتظار ہوتا

ترے شہر میں وہ عالم بھی گذر گیا جنوں پر
کوئی مجھ سے بات کرتا تو مَیں اشکبار ہوتا

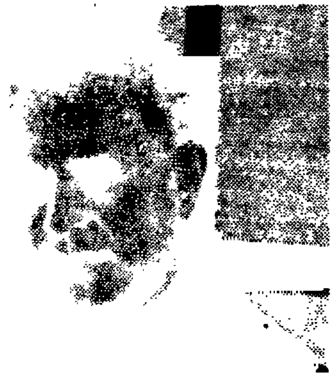
غمِ خلوص و ملالِ وفا سے پُوچھ کے دیکھ
نصیب ہو تو بڑی چیز ہے کم آمیزی

مرے ہاتھ میں ہو اگر تیرا ہاتھ
جو سُورج بھی ڈوبے تو رات آئے نا

جلے بھی تو کب تک جلے وہ چراغ
ہوا میں بھی جس سے بجھا جائے نا

کسی کے رُخ پہ غبارِ ملال ہو لیکن
مرا ہی رنگِ پریدہ دکھائی دیتا ہے

شورش کاشمیری



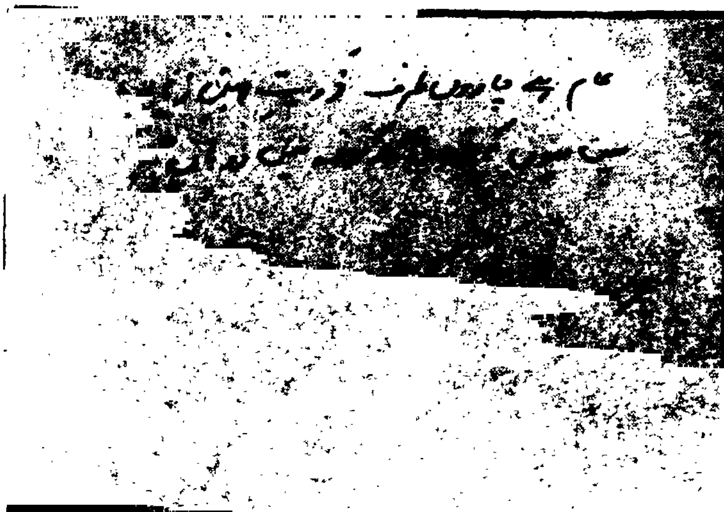
گفتنی ناگفتنی

چہ قلندرانہ گفتم

الجہاد والجہاد

پیدائش ۱۹۱۷ء

وفات ۱۹۷۴ء



شورش کاشمیری

لاہور کی پبلک لائبریری ملک کی پرانی اور سب سے بڑی لائبریریوں میں سے ایک ہے اور ایک ہی شخص یہ دعویٰ کر سکتا تھا کہ اس نے اس لائبریری کی تقریباً ساری کتابیں پڑھی ہیں۔ اس کا نام تھا آغا شورش کاشمیری۔

عبدالکریم نام، شورش تخلص، آغا دوستوں کی عطا اور کاشمیری وطن کی نسبت، پیدا ہوئے امرتسر میں جہاں جلیانوالہ باغ کا واقعہ ہماری تحریک آزادی کا ایک زریں باب ہے۔ پیدائش کی تاریخ تھی ۱۴ اگست جو ہماری آزادی کی تاریخ ہے اور سن تھا ۱۹۱۷ء جب پہلی جنگ عظیم اپنے شباب پر تھی۔ یہ سارے اتفاقات جس بچے کی پیدائش کے وقت جمع ہو گئے ہوں وہ کیوں نہ ایک جری سپاہی ثابت ہوتا۔ انہوں نے میٹرک کیا تو تحریک آزادی زور شور سے جاری تھی۔ انگریز سامراج کے خلاف نفرت ہر محب وطن کو تھی۔ شورش کی حب الوطنی کی اساس بھی اس پر تھی کہ سامراج سے کوئی سمجھوتہ نہ کیا جائے۔ وہ زندگی بھر اس اصول پر قائم رہے اور متعدد بار جیل کی صعوبتیں برداشت کیں انہوں نے کبھی ان لوگوں سے ہاتھ نہیں ملایا، جو سامراج کے مفاد کے مطابق کام کر رہے تھے۔ بدلے ہوئے حالات کے تحت ان کا قلم کا نشتر سامراج کے خلاف لڑنے والوں کی ہی شہ رگ پر رکھا رہا اور پرانے دشمن ان کے دوست بن گئے

شورش کو شاعری کا ابتدائی شوق اسکول میں ان کے استاد مولوی نیاز محمد کی بدولت

پیدا ہوا وہ خود بھی شاعر تھے۔ جب یہ دوسری یا تیسری جماعت میں تھے تو احسان دانش جو اس وقت احسان بن دانش تھے) کاندھلے سے بھٹکتے ہوئے لاہور جا پہنچے شورش اسکول سے آنے کے بعد ان سے پڑھا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ دو سال جاری رہا اور اسی دوران احسان کی شاعری نے اس بچے کو بہت متاثر کیا۔ اس وقت تک شورش غزلیں کہا کرتے تھے۔ ایک آدھ غزل پر علامہ تاجور نجیب آبادی سے بھی اصلاح لی۔ ان کے بھاری بھرکم شخصیت کا اثر تھا کہ ان کی شاعری میں بھی وزن پیدا ہو گیا۔ اختر شیرانی اور بسمل وارثی کو بھی چند غزلیں دکھائیں۔ اب نہ وہ لوگ باقی ہیں نہ اس دور کی غزلیں ہی محفوظ ہیں۔ باقاعدہ اصلاح کا سلسلہ مولانا ظفر علی خاں سے رہا یعنی دس بارہ نظمیں انہیں دکھائیں۔ جو رنگ شورش کا ہے اس میں مولانا سے بہتر استاد نہیں مل سکتا تھا۔ لیکن یہ شاگردی بھی اس قسم کی تھی کہ بقول شورش۔

"کبھی کسی لفظ، مطلب یا اظہار میں اٹکاؤ محسوس ہوا تو مشورہ کر لیا۔

شورش کا ماحول ہمیشہ سیاسی اور ادبی رہا۔ اس دور کے صف اول کے تمام ہی سیاسی رہنماؤں سے تعلق خاطر رہا اور ان کی رفاقت نصیب ہوئی۔ بہتوں کا جیل میں ساتھ رہا ان تمام شخصیتوں کا مطالعہ وہ ایک کتاب کی شکل میں لکھ رہے تھے۔

شورش کو مزاج کی افتاد شاعری کے کوچے میں لائی ہوش آیا تو عشق سے واسطہ پڑا جوانی نے غزل کی شمع جلائی پھر سیاسی تجربوں نے شعور بیدار کیا تو گرد و پیش کے واقعات پر طنز و تبصرے کا شاعر بنا دیا۔ اب بقول خود محض اس لئے شعر کہتے ہیں کہ عام لوگوں میں معاشرے کے ان ناسوروں سے نفرت پیدا ہو جو اولاد آدم کے سینے سے رس رہے ہیں۔ یہی ان کی شاعری کا مقصد تھا۔

شورش کاشمیری کو نظم اور نثر دونوں پر ایک قدرت تھی کہتے تھے کہ الفاظ کا لشکر ہر وقت ہاتھ باندھے ان کے سامنے مودب موجود رہتا ہے اور وہ جس لفظ کا کان پکڑ کر جہاں چاہے بٹھا دیتے ہیں۔ اہل زبان نہ ہوتے ہوئے بھی ان کی تحریر زبان دانوں کے لئے سند کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ جس زور بیان کے مالک تھے وہ اس دور کے صحافیوں میں

کہیں نظر نہیں آتا۔ قلم کے ہی شیر نہیں وہ ایک شعلہ بیان مقرر بھی تھے۔ اس میں عطاء اللہ شاہ بخاری کی روایت انہی سے زندہ رہی۔ مجمع کی نفسیات سے وہ بخوبی واقف تھے۔ خیالات کی ندرت ان کی میراث تھی۔ الفاظ کا بحر ذخار ان کی نوک زبان پر رہتا تھا۔ چنانچہ کیسا ہی مجمع ہو وہ چند منٹ میں اسے اپنا ہم خیال بنا لیتے تھے۔

شورش مشاعروں میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ ان کے خیال میں شاعری جلوت کی نہیں خلوت کی چیز ہے۔ اچھی نشستوں میں شرکت کر کے وہ البتہ بڑے محظوظ ہوتے تھے

وہ اس کے قائل تھے کہ سیاسی اور سماجی تحریکیں ہمیشہ ادب پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اور ہر عہد کا ادب اپنے دور کے سیاسی اور سماجی حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ اگر نہ کرے تو اسے دیانتدارانہ ادب نہیں کہا جا سکتا۔

شورش اسلامی نظام کے لئے کوشاں تھے اور اسی کو اپنی زندگی کا مشن بنائے ہوئے تھے۔ آج بھی وہ ایک طالب علم کی سی پابندی سے مطالعہ کرتے اور تاریخ، سیاست تذکرے، ادب، دین اور شاعری ان کے محبوب موضوع تھے۔ البتہ ناولوں سے انہیں چنداں دلچسپی نہیں رہی تھی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہمارے ہاں ناول نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ شورش جیسی ذہنی سطح کے لوگوں کو

شورش نے بلا کا حافظہ پایا تھا۔ ولی دکنی سے لے کر اس دور کے عام شعراء کے اچھے اشعار تک بلا مبالغہ کئی لاکھ شعر انہیں یاد تھے اور اپنی تحریر و تقریر میں جگہ جگہ ایسے شعر چسپاں کرتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا جیسے یہ شعر اسی موقع کے لئے لکھا گیا تھا۔ میں نے ان کا پسندیدہ شعر پوچھا تھا تو انہوں نے فارسی کا یہ شعر سنا دیا

گریز از صف ما آنکہ مرد غوغا نیست
کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

شورش نئی نسل سے مطمئن نہیں تھے۔ ان کے خیال میں وہ شدید ذہنی بحران کا شکار ہے۔ پرانے لوگ ماضی کا سرمایہ لئے اٹھتے جا رہے ہیں۔ نوجوانان اہل قلم و انشاء زیادہ ہیں۔ ادیب یا شاعر کم۔ ان میں زیادہ تر کے پاس معلوم ہوتا ہے کہ کہنے کو کچھ نہیں

ہے۔ ذہن کی الجھن ان کی تحریر میں بھی ابہام پیدا کر دیتی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ نہ ان بیچاروں کا گہرا مشاہدہ ہے نہ وسیع مطالعہ۔

شورش نظم معریٰ اور نظم آزاد سے بھی مطمئن نہیں تھے۔ ان کے خیال میں شاعری کی اس ہیئت اور تجربے کو ہماری ادبی روایات اور قومی ذہنیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

انہوں نے کہا تھا کہ پاکستان میں اردو کا مستقبل شاندار ہے البتہ سکہ بند اور ٹکسالی اردو زمانہ کے تغیر کی وجہ سے اپنی شکل تبدیل کرے گی جو ہر زبان کے ارتقاء کے لئے ضروری ہے۔ اردو کی ترقی کے لئے ان کا مشورہ تھا کہ حکومت کو ایسے اقدامات کرنا چاہیئں جو خود عوام کی خواہش کے مطابق ہوں اور عوام اردو کے حق میں ایک تحریک بن جائیں۔ اخبارات اور رسائل کا یہ کام ہے کہ وہ لوگوں میں پڑھنے لکھنے کا ذوق پیدا کریں۔ ساتھ ہی تعلیم عام کی جائے اور کتابوں کی قیمت کم کرائی جائے۔ صرف اس طرح اردو ترقی کر سکتی ہے۔ ان کے خیالات میں زبان اور شعر و ادب کو جغرافیائی حد بندوں میں قید تو نہیں کیا جا سکتا لیکن ان حدوں کو بہر حال ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ہر دور شاعری کے لئے سازگار ہوتا ہے۔ بشرطیکہ ہم جو کہنا چاہتے ہیں۔ اس کا پورا شعور رکھتے ہوں۔ ماضی میں زندگی بسر کرنا اور حال میں عہدہ برا ہونا دشوار ہے۔ مستقبل کی اساس ماضی کے تجربوں کی روشنی میں حال کی جد و جہد پر ہی رکھی جاتی ہے۔

شاعری میں جدیدیت کے بارے میں سوال کا جواب انہوں نے یہ دیا تھا کہ اگر اس سے مراد جدید نظر آتے ہیں تو ان سے مفر نہیں ممکن لیکن اگر جدید تجربے ہیں تو وہ موزوں نہیں۔ ویسے بقول اقبال ؎

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصہ جدید و قدیم

شورش جب تک زندہ رہے تیس ہزار سے اوپر شعر کہہ چکے تھے۔ جن میں اکثریت سیاسی نظموں کی ہے۔ ان کے کئی مجموعہ شائع ہو چکے ہیں اور نثر کی کئی کتابیں بھی بازار میں آ چکی ہیں۔

شورش کاشمیری

عکسِ فن

اے ربِ ذو الجلال تری برتری کی خیر
کن ظالموں کی مدح و ثنا کر رہا ہوں میں

دل میں مکیں تھا شورش جلتے رہے چراغ
جاتے ہوئے وہ شوخ انہیں بھی بجھا گیا

بہت قریب سے دیکھا ہے رہنماؤں کو
کہوں تو گردشِ لیل و نہار رک جائے

ہم اس مقام پہ ہیں عزیزانِ محترم
حبس کا جہاں میں کرب و بلا نام ہو گیا

جب مرے آشیاں کا سوال آگیا
گر کے بجلی کو اکثر سنبھلنا پڑا

ہمیں اس زندگی کی سرحدوں سے دور جانا ہے
ثریا سے تعارف کہکشاں سے دوستی کر لیں

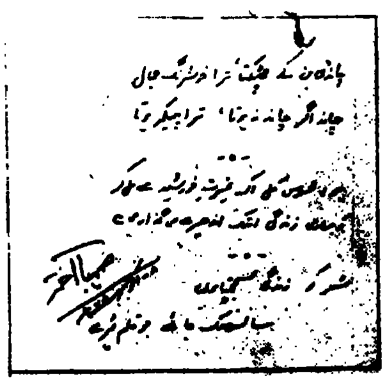
خون آلود شاہراہوں سے
کہکشانِ وفا بھی اٹھیں گے

صہبا اختر



سرکشیدہ

پیدائش ۱۹۳۲ء



صہبا اختر

ان شاعروں میں جنہوں نے بہت کہا ہے اور مسلسل کہہ رہے ہیں، صہبا اختر بھی شامل ہیں اس لحاظ سے بڑی حد تک منفرد ہیں کہ انہوں نے اپنا سارا شعری سرمایہ سنبھال کر رکھ چھوڑا ہے

اختر علی رحمت نام ہے۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۳۲ء کو جموں میں پیدا ہوئے۔ بچپن اور لڑکپن بریلی میں گزرا۔ تعلیم بریلی اور علی گڑھ میں پائی۔ تقسیم کے بعد پاکستان آ گئے ان کے والد منشی رحمت علی آغا حشر کے ہمعصر تھے ان کے "تصویر رحمت"، درد جگر، باوفا عاشق، محبت کا پھول، اور جلاد عاشق، نامی ڈرامے "پبلک" میں بے حد مقبول ہوئے۔ صہبا آج بھی گھن گرج کے ساتھ پڑھتے ہیں وہ غالباً ان کے والد کے اسٹیج سے منسلک رہنے کا نتیجہ ہے۔ بریلی میں یہ خاندان کالا امام باڑے کے پاس رہتا تھا۔ جہاں سال بھر منقبتی مشاعروں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ انہوں نے بھی تیرہ چودہ سال کی عمر میں پہلی بار منقبت کہی اور پڑھ کر داد پائی۔ کراچی پہنچے تو کسی سے شناسائی نہ تھی وہ دن بڑی جدوجہد کے تھے ان کی خوش قسمتی تھی جو حفیظ ہوشیارپوری سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے بھی دوستی کا حق ادا کر دیا۔ ہر قسم کی معاونت کی اور اعلیٰ ادبی حلقوں میں روشناس کرایا۔ ریڈیو سے وابستہ ہونے کے بعد گیت بھی لکھے اور اپنے گیتوں کی بدولت فلموں میں پہنچے۔ ۱۹۶۲ء سے اب تک کئی فلموں کے گیت لکھ چکے ہیں۔

صہبا اختر نے ہر صنف میں کہا ہے ان کے شعری سرمائے میں منظوم ڈرامے اور دوہے بھی شامل ہیں اپنے اندازے کے مطابق ساٹھ ہزار سے اوپر شعر کہہ چکے ہیں۔ جس زمانے

میں ریڈیو سے منسلک تھے۔ کچھ نثر بھی لکھنا پڑتی تھی لیکن اس صنف کو باقاعدہ نہیں اپنا۔

شاعری کے بارے میں ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ شاعر بننے کے لیئے ریاضت شرط اول ہے الہامی شاعری کے قائل نہیں۔ کہتے ہیں شعر کہنے کے لیئے بھی کسان کی طرح محنت کرنی پڑتی ہے، وہ زندگی کے کینوس پر بے شمار رنگ آرائیوں کے قائل ہیں کسی سیاسی تحریک سے کبھی وابستہ نہیں رہے۔ حب الوطنی کا یہ عالم ہے کہ انگریزی کے مشہور مقولے MY COUNTRY, RIGHT OR WRONG کے سختی سے قائل ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں ان کے کلام کا مجموعہ "سرکشیدہ" شائع ہوا ہے۔ سویرا، فنون، سیپ، ادب لطیف، ماہ نو اور لیل و نہار وغیرہ میں بھی ان کا کلام چھپتا رہا ہے۔ سات سال "حریت" سے وابستہ رہے۔ پہلے نظمیں لکھتے تھے۔ پھر جعفر منصور کے انتقال کے بعد قطعات بھی لکھنے لگے اب "مشرق" کے قطعہ نگار ہیں اور راشننگ کے محکمہ سے متعلق ہیں۔ لیکن اس سے ان کی جسامت کا کوئی تعلق نہیں۔

انہیں بچوں سے بہت محبت ہے سڑک پر کسی بچے کو روتا دیکھ کر بے چین ہو جاتے ہیں اور جب تک اسے بہلا نہ لیں، آگے نہیں بڑھتے، کئی سال ہوئے آگ میں گھرے ہوئے ایک بچے کو بچانے کے لئے جان پر کھیل گئے تھے۔ ریڈیو کے علاوہ انہوں نے حلقہ ارباب ذوق سے بھی بہت کچھ سیکھا کہتے ہیں کہ سو کتابیں پڑھنے سے زیادہ علم کسی عالم کے پاس بیٹھنے اٹھنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ ان کے خیال میں جدید شاعری تقریباً مہمل ہے اس لئے کہ اس میں شاعری کی بنیادی خصوصیات یعنی آہنگ اور موسیقیت نہیں ہوتی۔ جدید شاعری میں تو مقصدیت تک کا فقدان ہے۔ ان کے خیال میں جدید شاعری کو انمل بے جوڑ کہنا بہتر ہے۔ اس کی مثال وہ اس طرح دیتے ہیں۔

"میں شلوار کاندھے پہ لے کر چلا
اندھیری فضا میں
مجھے منبر آئی نظر
زباں نے حلاوت محسوس کی
اور پھر ایک الو نے آواز دی

ان کے خیال میں جدید نظم اسی قسم کی ہوتی ہے۔ لیکن یہ جدیدیت نہیں ہے وہ اپنے آپ کو جدید شاعر سمجھتے ہیں کیونکہ اس جدید زمانے میں انہیں سنا اور پڑھا جاتا ہے۔
صہبا اختر کہتے ہیں "میں نے الفاظ کے تجربے بھی کئے اور اشکال (ہئیت) کے بھی لیکن میں خلاء میں نہیں بھٹکتا۔ وہ کہتے ہیں کہ شاعری کے ہر روپ کے اپنے تقاضے ہیں وہ انسان کے اندر بھی ہے اور باہر بھی انہیں داخلی اور خارجی دونوں پہلو عزیز ہیں۔ کہتے ہیں وہ اپنی محبوبہ کی کنول جیسی آنکھوں سے بھی محبت کرتے ہیں اور کسی اندھے کے کورنین بھی انہیں عزیز ہیں۔ کہتے ہیں میں ایک پھول کے مرجھانے سے بھی اتنا ہی متاثر ہوتا ہوں جتنا کسی انسان کے مرنے پر۔ ان کا خیال ہے آزاد شاعری پابند شاعری سے زیادہ مشکل ہے لیکن بیشتر لوگ اس کے ساتھ پورا انصاف نہیں کر پاتے۔ اگر اس صنف کو سلیقے سے برتا جائے اور آہنگ کا خیال رکھا جائے تو یقیناً یہ ہمارے ادب میں گراں قدر اضافہ ہوگا
صہبا اختر کی رائے میں شاعری کا حق اسی کو ہے جس کا گہرا مطالعہ ہو اور فن پر نظر ہو۔ پھر یہ مطالعہ بھی جاری رہنا چاہئے۔ اگر ترک کر دیا تو ذہن میں ٹھہراؤ پیدا ہو جائے گا۔"

صہبا اختر

عکسِ فن

آجا، اندھیری رات میں تنہا بتا چکا ہوں
شمعیں جہاں نہ جلتیں، آنکھیں جلا چکا ہوں

اس بے طلوع شب میں، کیا طالع آزمائی
خورشید لاکھ اُبھرے، لیکن سحر نہ آئی!

مجرمِ عشق ہوں مجھے صہبا
جو سزا دے وہ بے گناہ ہی دے

تھا وہ اپنے ہی خوف کا محکوم
جس کی آواز میں تحکم تھا

مجھ پہ ایسا کوئی شعر نازل نہ ہو
جس کی حدّت میرے خوں میں شامل نہ ہو

کاش وہ وقت بھی آئے دنیا میں، جب
زر پکارے مگر کوئی سائل نہ ہو

جانے کب آجائے وہ صہبا مثالِ فصلِ گل
اس لئے ویرانۂ دل کو سجا رکھتا ہوں میں

سیّد ضمیر جعفری



جزیروں کے گیت
لہو ترنگ
مافی الضمیر

پیدائش ۱۹۱۸ء

غزل

(سید ضمیر جعفری)

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

سید ضمیر جعفری

شاعری ایک ایسا فن ہے کہ شاعر کو عوام اور عوام کی زندگیوں سے رابطہ قائم رکھنا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے شاعر کو تعلقات عامہ کی مہارت اپنے فنی ریاض کے طفیل گھر بیٹھے حاصل ہو جاتی ہے۔ شاید اسی لئے ارباب اقتدار کی نظر میں سید ضمیر جعفری اسلام آباد میں ادارۂ ترقیات دارالحکومت کے ڈائرکٹر تعلقات عامہ کے عہدے کے لئے موزوں قرار پائے۔ یہ ۱۹۶۹ء کی بات ہے۔

ایسے ضلعے کم ہوتے ہیں جن کی شہرت اپنے ملک کی سرحدیں پھلانگ کر چار دانگ عالم میں پھیل جائیں۔ جہلم اسی قسم کا ضلع ہے۔ وہاں چک عبدالخالق نامی سادات کی ایک پرانی بستی ہے۔ ۱۹۱۸ء میں وہاں سیدوں کے ایک ممتاز خاندان میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام رکھتے ہوئے نسبی سلسلے کا خیال رکھا گیا۔ بچے کے لئے صاف اور سادہ دلی کی دعائیں مانگی گئیں۔ پنجتن پاک سے تعلق کا اظہار کیا گیا۔ اور خاندان کی روحانی اقدار کا لوازمہ برتا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سید ضمیر حسین شاہ نام تجویز کیا گیا۔ گھر کے ماحول کا تانا بانا مذہب، درویشی، زراعت اور ملازمت سے مربوط تھا اور گاؤں کی زندگی ہرے بھرے کھیتوں ٹھاٹھیں مارتے ہوئے نیلگوں دریائے جہلم اور حد نظر پہ افق کے کنارے چومتے ہوئے سرمئی پہاڑیوں سے عنوان تھی۔ ایسا سہانا اور روحانی ماحول تو پتھروں کے دل میں بھی گداز پیدا کر دے پھر ایک حساس انسان کیوں نہ شاعری کی

طرف راغب ہوتا ہے چنانچہ چھٹی جماعت سے ہی انہوں نے بقول خود تک بند شروع کر دی۔ کچھ عرصہ تک تو گھر والوں کو پتہ نہ چلا۔ مگر شاعری بھی عشق اور مشک ہی کے زمرے میں آتی ہے۔ لہٰذا گھر والوں تک بات پہنچ گئی اور تاثر یہ لیا گیا کہ "لڑکا کام سے گیا"

والد صاحب سمجھدار آدمی تھے جانتے تھے کہ یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی آتار دے اس سے منع کرنے کی بجائے انہوں نے اس دفع الوقتی کی زکوٰۃ نکال کرنا مناسب بتانے کی تلقین کی اور ہدایت کی کہ

"شعر کہتے ہو تو نعتِ سرورِ کونین ؐ بھی کہا کرو"۔

سعادت مند بیٹے نے باپ کی بات گرہ سے باندھ لی اور پھر کبھی نہ بھولے۔

سید ضمیر جعفری نے اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔ اے کیا اور سرکاری ملازمت سے وابستہ ہو گئے۔ جہلم کے پانی نے میجر بنا دیا۔ شاعری نے تعلقاتِ عامہ کا تاج سر پہ اور خلوصِ خدمت نے تمغۂ قائد اعظم سینے پر آویزاں کر دیا۔

"میرے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ شعر کہنے کے لئے انہیں خاص اہتمام اور ماحول کی تمنا ضرور ہے لیکن جس کا پیشہ ہی تعلقاتِ عامہ ہو اسے عوام سے فرصت اور سکون کے لمحے کب ملتے ہیں۔ اس لئے ذرا سی تنہائی کو غنیمت جانتے ہیں اور جب سارا عالم سوتا ہے تو شب کے بارہ بجے کے بعد شاعر دُرِ سخن پروتا ہے۔ ادب کے بارے میں گفتگو ہوئی تو ضمیر جعفری نے بتایا کہ ادب زندگی کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور زندگی کی رہنمائی بھی کرتا ہے۔ اس کا ثبوت ضمیر کی اپنی شاعری بھی ہے۔ ادب کی موجودہ رفتار ان کے نزدیک تسلی بخش ہے اور موضوع اور اسلوب و اظہار میں کشادگی اور تازگی کے آثار و انوار بڑھ رہے ہیں۔

بعض شعراء کے برخلاف ضمیر جعفری کو جدید شاعری سے کوئی کد نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جدید شاعری ادب میں اپنا مقام پیدا کر چکی ہے۔ شاعری میں فرسودہ علامتوں کے استعمال کے بارے میں ایک سوال کے جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ جن علامتوں

کا زندگی سے کوئی تعلق نہیں رہا وہ اپنے آپ ختم ہو جائیں گی اور اگر ایسا نہ ہوا تو وہ شاعر ختم ہو جائیں گے جو مردہ علامتوں کے جنازے گھسیٹتے پھرتے ہیں۔ غزل میں جو نت نئے تجربے کئے جا رہے ہیں ضمیر جعفری ان کے حق میں ہیں۔ اس لیے کہ تجربات رک جانے کا مطلب جمود ہے۔ پھر جس تجربے میں جان ہوگی وہ زندہ رہے گا ورنہ خوفناک ہو جائے گا اور لوگ اس سے بدکنے لگیں گے۔ زبان کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ یہ ہر آن بدلتی رہتی ہے۔ تغیر کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔ اس لئے پاکستان میں اردو زبان کو مقامی اثرات قبول کرنا ہی ہوں گے۔

بڑے بڑے جغادری قسم کے ناقدین اپنے وقت کا سب سے بڑا حصہ اس بحث میں صرف کرتے ہیں کہ کسی شاعر کے کلام میں داخلیت کتنے فی صد اور خارجیت کتنے فی صد موجود ہے؟ روایت کے مطابق میں نے بھی سوال ان سے بھی کیا۔ اور انہوں نے سیدھا سادا جواب یہ دیا کہ

"مجھے نہیں معلوم میری شاعری کا محور داخلی ہے یا خارجی"۔

یہ سوال کہ بیسویں صدی شاعری کے لئے خوش آئند اور سازگار ہے یا نہیں انہوں نے جواب میں کہا کہ یہ سائنس کی صدی ہے آرٹ کی نہیں۔ آرٹ میں بھی اظہار کے لئے سائنسی طریقۂ کار اختیار کرنا ہوں گے۔ لیکن اب بھی ہوگا کہ سائنس کی بہتات سے انسان کا دم گھٹنے لگے گا تو پھر تازہ ہوا کے لئے آرٹ کے دریچے آپ ہی آپ کھل جائیں گے"۔

ضمیر جعفری پابند شاعری کرتے ہیں لیکن آزاد شاعری کرنے والوں سے انہیں بغض اور بیزاری نہیں۔ ویسے ان کی یہ دلیل کافی وزنی ہے کہ آزاد شاعری میں طبیعت کے سہل انگار ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ جبکہ فن کا تقاضا یہ ہے کہ ریاضت اور جگر کاوی سے کام لیا جائے حالانکہ ان کی طبیعت میں شاعرانہ لاابالی پن بدرجہ اتم موجود ہے۔ حد یہ ہے کہ اپنا پورا کلام بھی سنبھال کر نہیں رکھا۔ اور اگر کوئی ان کی پرانی غزل اپنے نام سے کبھی مشاعرے میں پڑھ دے تو ان کا تبصرہ کچھ اس قسم کا ہوگا۔

"غزل سنی ہوئی معلوم ہوتی ہے ہائے کیا اچھے شعر نکالے ہیں ظالم نے"۔

صفی لکھنوی کا یہ مقطع انہیں بہت پسند ہے۔

؎ وہ سب ہے صفیؔ دائرہ مرگ میں شامل
وہ عمر کا حصہ کہ میرے کام نہ آیا

اپنا یہ شعر انہیں پسند ہے۔

؎ اپنی خبر نہیں ہے بجز اس قدر مجھے
اک شخص تھا کہ مل نہ سکا عمر بھر مجھے

مشاعرے میں ترنم سے پڑھتے ہیں۔ ان کا ترنم مخصوص ہے اس لئے سامعین بھی انہیں تحت اللفظ سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ضمیرؔ جعفری ایک اچھے نثر نگار بلکہ مزاح نویس بھی ہیں "اڑتے خاکے" کے عنوان سے ان کے مزاحیہ مضامین کا ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ لباس کے معاملے میں وہ جیسا دیس ویسا بھیس کے قائل ہیں۔ دفتر میں یا تقریبات میں سوٹ بھی پہنتے ہیں لیکن مشاعروں میں کرتا پاجامہ پہن کر جانا پسند کرتے ہیں گھر میں تہمد زیب تن کرتے ہیں۔

ضمیر جعفری

عکسِ فن

شاید انہیں کا عجز مرے کام آگیا
جن دوستوں نے چھوڑ دیا وقت پر مجھے

ملی ہیں نوعِ بشر سے مجھے وہ ایذائیں
کہ جب بھی غور کیا خود بھی شرمسار ہوا

ہر نظر بس اپنی اپنی روشنی تک جا سکی
ہر کسی نے اپنے اپنے ظرف تک پایا مجھے

تا ابد کتنے اندھیرے تھے کہ روشن ہو گئے
شمع کا جلنا بظاہر رات بھر کی بات ہے

ضمیر اک قیدِ نامحسوس کو محسوس کرتا ہوں
کسی نادیدنی زنجیرِ پا کو دیکھتا ہوں میں

دُور تک دامانِ ہستی پر دیئے جلتے گئے
دیر تک عمرِ گذشتہ کا خیال آیا مجھے!

ہم زمانے سے فقط حُسنِ گماں رکھتے ہیں
ہم زمانے سے توقع ہی کہاں رکھتے ہیں

لمحے لمحے کو بیکراں پایا عُمر کو عشر مختصر جانا

سراج الدین ظفر



غزال و غزل
زمزمۂ حیات

پیدائش سنہ ۱۹۱۳ء
وفات سنہ ۱۹۷۳ء

نہ پوچھ معجزۂ مدحتِ شہِ کونین
مرے قلم میں ہے جنبش پرِ ہما کی طرح

سراج الدین ظفر کراچی ۹/۵

سراج الدین ظفؔر

کتابوں کے اتنے بڑے کاروبار کے مالک نہ ہوتے تو ان کی شاعری ہی ان کے لئے ذریعہ عزت اور بذریعہ شہرت کے علاوہ اچھی ذریعۂ آمدنی بھی بن جاتی اور اگر شاعر نہ ہوتے تو پروفیسر کہلاتے اور کسی بڑے ہوٹل میں دفتر لے کر زائچے بناتے، مستقبل کا حال بتاتے اور نجومیوں کی صفِ اول میں جگہ پاتے۔

یہ دہری، تہری بلکہ چوہری شخصیت ہے مشہور شاعر سراج الدین ظفؔر کی جو ۱۹۱۲ء میں جہلم میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۶ء میں لاہور سے بی اے۔ ایل ایل بی کیا۔

ان کی والدہ اپنے عہد کی مشہور لکھنے والوں میں سے تھیں۔ ہیبت ناک اور پُراسرار کہانیاں۔ محیرالعقول واقعات اور ڈراؤنے قصّے لکھنے میں ان کا جواب نہ تھا۔ ۱۹۳۲ء سے انہوں نے لکھنا شروع کیا اور چند ہی سال میں مقبولیت کے نئے افقوں کو چھونے لگیں۔ ان کا نام مسز عبدالقادر ہے۔ 'لاشوں کا شہر' راہبہ' صدائے جرس' وادی قاف اور تختِ بار' وغیرہ ان کی کہانیوں کے مختلف مجموعوں کے نام ہیں جن میں سے بعض کے دس دس ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ان کہانیوں میں بدنصیبی لانے والے جواہر اور تانبے کی قدیم تختیوں پر کندہ مستقبل کے احوال وغیرہ کا ذکر جابجا ملتا ہے۔ یقیناً والدہ کے اسی رجحان نے نہ صرف سراج الدین ظفؔر کو علم نجوم سے دلچسپی دلائی بلکہ ان کے بھائی عالمگیر بھی بڑے پائے کے ماہر علم نجوم بن گئے۔

دس سال کی عمر میں ان کے نام سے چند نظمیں منسوب ہوئیں جو ان کی کہی کم اور ا
کی والدہ کی کہی زیادہ تھیں۔ ۱۹۲۷ء یا ۱۹۲۸ء میں یہ لوگ کشمیر گئے تھے۔ والدہ نے
کہا یہاں کے مناظر پر نظمیں لکھو، فی نظم ایک روپیہ ملے گا۔ یاد رہے یہ وہ زمانہ تھا
جب گھریلو ملازم آٹھ آنے ماہوار پہ کام کرتے تھے۔ آج اس کی چوگنی رقم لیتے ہیں۔ گو
اس وقت کے ایک روپے کی قدر آج کے تین سو روپے کے لگ بھگ تھی۔ ہونہار سرا
نے دس بارہ نظمیں لکھیں اور اس حساب سے ڈیڑھ ہزار روپے کما لئے۔
۱۹۲۴ء میں لاہور میں ان کی شادی ہو گئی۔ انٹر میں تھے تو ہوابازی کی تعلیم حا
کی۔ مسلمانوں میں سب سے نوعمر ہوابازوں میں تھے۔ حکومت ہند سے اس سلسلے میں ان
حاصل کیا۔ ایل ایل بی کے بعد کچھ دن وکالت کی پھر ہوائی فوج میں افسر ہو گئے۔ ۱۹۵۰ء
تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد اپنے خسر مولوی فیروز الدین کے ایماء پر اپنا
کاروبار شروع کر دیا۔ تین چار سال انجمن ناشران و تاجران کتب کے صدر رہے رکو
پچاس کتابیں نصاب کے لئے لکھیں۔ ان کی تاریخ کی کتاب کا سندھی میں بھی ترجمہ ہوا۔ ا
خدمات کے سلسلے میں ۱۹۵۷ء میں جے۔ پی بنائے گئے اور تمغۂ خدمات حاصل کیا۔
سراج الدین ظفر کا ایک مجموعہ "زمزمۂ حیات" کے نام سے ۱۹۳۶ء میں شائع ہو چکا تھا۔ ا
دوسروں کی کتابیں چھاپنے سے ہی فرصت نہیں تھی۔ جو اپنی مزید کتابیں شائع کریں ویسے نثر
ایک مجموعہ "آئینے" بھی چھپ چکا ہے اور عنقریب اپنے کلام کا مجموعہ بھی چھاپ رہے ہیں۔
(سراج الدین ظفر سے جب میں نے یہ گفتگو کی تھی اس وقت تک ان کا کوئی مجموعہ کلام شا
نہیں ہوا تھا۔ یہ اکتوبر ۱۹۶۷ء کی بات ہے۔ اس کے بعد ۱۹۶۸ء میں ان کی غزلوں کا مجمو
"غزال و غزل" شائع ہوا۔ اور ۱۹۶۹ء میں اسے آدم جی ادبی ایوارڈ (پانچ ہزار روپیہ) م
ظفر صاحب نے اس رقم میں مزید اضافہ کر کے عطیے کے طور پر کراچی یونیورسٹی کو دے دی تاکہ
اردو آنرز میں اوّل آنے والے طالب علم کو گولڈ میڈل دیا جائے)۔
ظفر نے طالب علمی کے زمانے میں ہی تقریباً تمام اساتذہ کے کلام کا غائر مطالعہ کر
تھا اور یوں اُردو شاعری کے پورے ارتقاء پر ان کی نظر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام

میں یہ ارتقاء ہمیں اپنے پورے عروج پر ملتا ہے۔

مطالعے کا شوق جو والدہ سے ورثے میں ملا آخر تک باقی رہا۔ جب تک رات کو تیس چالیس صفحے نہ پڑھ لیں نیند نہیں آتی تھی۔

انہی دنوں وہ فلسفے اور روحانیات کا مطالعہ کر رہے تھے اور میں نے ان سے کہا تھا کہ کیا اس کے اثرات عنقریب آپ کی شاعری میں دیکھے جا سکیں گے ...؟ تب مسکرا کر فرمایا تھا۔ "میں نے جو حاصل کیا وہ اپنے پڑھنے والوں کو دیا اور اب بھی جو فیض پاؤں گا۔ اپنے قارئین کو اس سے فیض یاب کروں گا۔"

ظفر نہ صرف ایک پائے کے شاعر تھے۔ بلکہ ایک عظیم انسان بھی تھے۔ برصغیر میں ان کا گھرانا ہمیشہ علم و اقتدار کا مستقر رہا۔ ان کے دادا میاں فضل الدین گکھڑوں کی ایک شاخ اسکندرال کے سربراہ تھے۔ والد میاں عبدالقادر ریلوے میں انجینئر تھے۔ نانا مولوی فقیر محمد محمد اجل علماء میں سے تھے۔ خود ظفر صاحب کا رشتہ ایک علمی گھرانے میں ہوا۔ الحاج مولوی فیروز الدین (فیروز سنز کے بانی) ظفر صاحب کے خسر تھے۔ ظفر کی شاعری اور ان کے کردار پر اس علمی گھرانے کی چھاپ ہمیشہ رہی۔ انہوں نے انگریزی میں بھی شعر کہے جو نیو ورلڈ رائٹنگ نیویارک میں شائع ہوتے رہے۔ اس رند مستانہ نے جہاں غزل کہہ کر اس کا حق ادا کیا وہاں نعتیں بھی کہیں اور اپنے منفرد انداز میں۔ اس سہ پہلو شخصیت کو جو ماہر فلکیات تھا خوش فکر شاعر اور دردمند و زندہ دل انسان کو تو ابھی بہت جینا تھا۔ لیکن جانے کس کی نظر کھا گئی کہ وہ ۶ مئی ۱۹۷۲ء کو اچانک پانچ بجے چپ چاپ اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے چلے گئے۔

انہیں نجوم کا شوق شروع سے تھا۔ ۴۵ء سے اس کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا اس علم و فن پر تقریباً پانچ سو کتابیں اکٹھی کیں جن میں بعض نایاب ہیں۔ ہندو علما نے اس فن پر جتنے شاستر لکھے وہ سب ان کے پاس موجود تھے۔ حالانکہ ان میں سے بعض اب ہندوستان میں بھی نایاب ہیں کئی رومن مسودے بھی انہوں نے حاصل کر لئے تھے پہلے یہ سمجھ کر کہ کتاب پڑھنے ہی کی چیز ہے وہ دوسروں کو پڑھنے دے دیا کرتے تھے

مگر جب بعض نایاب کتابیں اس طرح ضائع ہوگئیں تو پھر محتاط ہو گئے ۔ اور پھر کتاب کی دوستی کسی سے نہیں کرتے تھے ۔

ہندوستان کے وزیر اعظم لال بہادر شاستری کی تاریخ پیدائش انہیں دستیاب ہو گئی تھی ۔ چنانچہ ایک ہفتہ قبل آپ نے ان کی اچانک موت کی پیشین گوئی کر دی تھی ۔ اسی طرح اپنی بیٹی سلمیٰ اور داماد کے انڈونیشیا کے سفر کے بارے میں معلوم کر لیا تھا کہ یہ راس نہیں آئے گا ۔ چنانچہ دونوں کی جانیں ہوائی حادثے کی نذر ہو گئیں ۔

عرب ملکوں پر اسرائیل کے حملے کی تاریخ کا بھی انہوں نے پہلے سے تعین کر دیا تھا ۔ اس کے بعد اندرا گاندھی کے سیاسی عروج زوال پہ کام کر رہے تھے ۔

سراج الدین ظفر نہ صرف پورے برصغیر بلکہ یورپ کی بھی سیاحت کر چکے تھے ۔ اس دوران مصر بھی گئے اور اپنی والدہ کے ساتھ قدیم مقابر دیکھے ۔

ظفر کو مشاعرے پر چھا جانے کا گر آتا تھا ۔ وہ گرج کر پڑھتے تھے اور تحت اللفظ پڑھنے والوں میں تقریباً سب سے کامیاب تھے ۔ جب وہ کہتے تھے کہ

اس قوم پر کسی نے اتارا نہیں ہمیں

تو لہجے کا تیقن اور آواز کی گونج پکار پکار کر پتہ دیتی تھی کہ شاعر کس مقام پہ پہنچ کر یہ بات کہہ رہا ہے ۔ عجیب بات یہ ہے کہ جہاں اسٹیج پہ ان کی آواز اتنی بلند ہوتی تھی وہاں روز گفتگو میں وہ بہت آہستہ بولتے تھے حتیٰ کہ سننے کے لئے آدمی کو ہمہ تن گوش بننا پڑتا تھا ۔ اسٹیج پہ ان کی شعر گوئی کے منفرد انداز کو بہت سے کیمروں کی آنکھ نے محفوظ کر لیا ۔ ایک ایسی ہی تصویر مشہور فوٹو گرافر الطاف راتا نے بنائی تھی ۔ ظفر صاحب کے انتقال کے بعد فیروز سنز لمیٹڈ نے ایک چھوٹا سا کتابچہ ان کے بارے میں شائع کیا اس کے سرورق پہ یہ تصویر موجود جسے دیکھ کر آنکھیں کہتی ہیں ۔ ظفر تو زندہ ہے ۔ دیکھو وہ کہہ رہا ہے ۔ اپنی ہی گرجتی اور منفرد لہجے میں ۔

راس آئی نہ وسعت ہمیں زندانِ جہاں کی
ہر گوشۂ وسعت کو یہاں تنگ بھی دیکھا

سراج الدین ظفر

عکسِ فن

آیا جو تذکرے میں جہنم کے میرا نام
حوروں کو آرزوئے ملاقات ہو گئی

مری غزل ہے ظفر عصرِ نو کا آئینہ
قدیم رنگ سے ہے بغضِ للّٰہی مجھ کو

گُل کو دے کر تبسمِ شاداب
اشکِ شبنم سے اس کو تر بھی کیا

جمالِ روئے محمدؐ کی تابشوں سے ظفر
دماغِ رند ہوا عرشِ کبریا کی طرح

کوئی سرتاپا عطا بھی ہو تو مجھ کو کیا ظفر
مجھ کو کیا دے گا کہ خود دستِ عطا رکھتا ہوں میں

مستقبل و ماضی کی حقیقت نہیں کچھ بھی
آ گوشۂ مروجِ ابدیت میں سما دیکھ

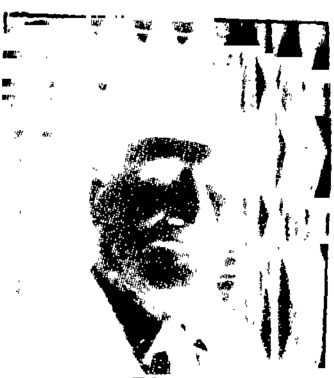
ظہیر کاشمیری



تغزل

عظمت آدم

پیدائش سنہ ۱۹۲۰ء



ظہیر کاشمیری

"میرا پورا نام دستگیر ظہیر ہے ۲۱/ اگست ۱۹۲۰ء کو امرتسر میں پیدا ہوا۔ کشمیر میرا آبائی وطن ہے۔ اس لئے ظہیر کاشمیری کہلاتا ہوں۔ چھٹی جماعت کا طالب علم تھا۔ عمر رہی ہوگی کوئی گیارہ سال۔ بس تبھی سے تک بندی کہہ لیجئے یا شعر گوئی کی ابتدا ہو چکی تھی۔ کیونکہ گھر کے بزرگ بھی شعر گو اور شعر فہم تھے۔ حکیم ظہیر الدین اور حکیم فیروز الدین طغرائی کا نام تو آپ نے سنا ہوگا۔ اچھے شاعر تھے اور میرے عزیزوں میں سے تھے اسے خود ستائی کہہ لیجئے یا بزرگوں کا فیض کہ کسی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنے کی ضرورت محسوس ہی نہ کی بس خود ہی کوشش کرتے رہے نظم غزل اور نثر کے میدان میں قلم آزمائی کی اور اب برے بھلے جیسے بھی شاعر ہیں سخن فہموں کے سامنے ہیں۔"

ظہیر کاشمیری جس رفتار سے بولتے ہیں اسی رفتار سے لکھتے بھی ہیں۔ چنانچہ ایک سوال میں تین چار جوابات اکٹھے مل جاتے ہیں۔ ان سے پہلی بار نواب شاہ کے مشاعرے میں ملاقات ہوئی تھی۔ غالباً ۱۹۶۶ء کی بات ہے۔ ملاقات کیا تھی۔ بس ایک رسمی سا تعارف تھا۔ سننے کا اتفاق بھی پہلی بار اس مشاعرے میں ہوا۔ خوب پڑھتے ہیں گھن گرج کے ساتھ۔ اس وقت تک دو مجموعے شائع ہو چکے تھے۔ عظمتِ آدم اور تغزل زیر طبع مجموعے تھے۔ جمالِ فردا اور فکرِ امروز زیر (مقالے) ہیں اس کے علاوہ ایک ہی موضوع پر مختلف شعرا کے اشعار جمع کرکے ان کی ترتیب و تدوین بھی کی تھی۔

ظہیر تقسیم ہند سے قبل ہی یہاں آگئے تھے ۔ ابتداء میں فلمی دنیا میں ادبی سفیر کی خدمات انجام دیں ۔ ۱۹۵۹ء میں روزنامہ "احسان" میں مجنوں کے نام سے کالم لکھتے رہے ۔ "سویرا" کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے ۔ فلم "تین پھول" کی کہانی لکھی اور خود ہی ہدایت کاری بھی کی ۔ سرکاری ملازمت کی زحمت طبیعت نے گوارا نہ کی ۔ ان دانشوروں کی تحریکوں کو آگے بڑھانے کے ہمیشہ سے حامی ہیں جنہوں نے تاریخ کے مختلف موڑ پہ غلامی، افلاس اور جہالت کے خلاف جدوجہد کی اور عظمتِ احساس اور حریتِ فکر کو محفوظ کرنے کے لئے قربانیاں دیں ۔

ظہیر انسان کے تاریخی شعور اور احتیاطی مجاہدات پہ ایمان رکھتے ہیں ۔ ان کا کہنا ہے کہ میرے اوائل شعور کے زمانے میں برصغیر پاک وہند پہ اور افریقہ اور ایشیا کے بیشتر حصوں پہ برطانیہ ایک مہیب سامراج کی طرح مسلط تھا ۔ جس نے دنیا کے کم و بیش سارا آبادی کو فکری اور مادی طور پہ مفلوج کر رکھا تھا ۔ ظہیر نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ اس عالمگیر طاغوتی سامراج کے خلاف لڑنا ہی سب سے بڑا جہاد ہے چنانچہ انہوں نے اسے اپنا نصب العین بنا لیا اور علمی و عملی طور پہ ملک کی بائیں بازو کی جماعت سے منسلک ہوگئے اور برصغیر کے کروڑوں انسانوں کی جدوجہد آزادی میں حصہ لینا شروع کر دیا اس سلسلہ میں کئی بار ان پہ مقدمے بھی چلے ۔ قید وبند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں ۔ لیکن یہ کئی سالوں تک مزدوروں اور کسانوں اور طالب علموں کے ساتھ آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیتے رہے ۔ کچھ عرصہ ٹریڈ یونین کانگریس امرتسر کے صدر بھی رہے ۔ صوبائی مزدور کمیٹی پنجاب اور یونائٹڈ پنجاب کی آل پنجاب اسٹوڈینٹس فیڈریشن کے قائم مقام صدر بھی رہے ۔ ترقی پسند تحریک کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار فرماتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ہمارا ملک اور دنیا کے دیگر ممالک اس منزل کی جانب اپنی بساط اور حالات کے مطابق بڑھتے چلے جا رہے ہیں جہاں سے ایک خوش گوار دور کا آغاز ہوتا ہے ابھی مکمل خوشحالی اور مکمل ذہنی نشوونما کا حصول بعید از خیال ہے منطقی طور پہ جہاں جہاں جہالت، بھوک اور غلامانہ ذہنیت

باقی ہے۔ وہاں ترقی پسند تحریک کے آگے بڑھنے کے امکانات بھی موجود ہیں۔ دیگر ترقی پذیر ممالک کی طرح ہمارے ملک کو بھی ابھی بہت سے شعوری اور مادی مراحل طے کرنے ہیں ان ممالک پر نظر ڈالیں۔ جنہوں نے عظیم تاریخی کارنامے انجام دیتے ہوئے طبقہ داری سماجی دور کے استحصال پسندانہ اقتصادی کار کو بدل ڈالا - اور اپنی اجتماعی کوششوں سے ایک نئے سماج کی بنیاد ڈالی اور تقسیم کار کے مسائل کو سماجی سطح پر بڑی حد تک حل کر لیا۔ پھر بھی وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ کتنی مدت بعد پوری دنیا میں خوشحالی کا دور دورہ ہوگا۔ جدوجہد بہرحال جاری رکھنا چاہیئے۔

اردو زبان کے متعلق ظہیر کا خیال ہے کہ یہ پاکستان کی ایک بڑی قومی زبان ہے اس لئے کسی تیسری یا چوتھی زبان کے ساتھ اس کے ٹکراؤ کا کوئی مسئلہ موجود نہیں اور جہاں تک علاقائی زبانوں کا تعلق ہے ان کے اظہار کی سطحیں اردو سے مختلف ہیں ان کے مقامات پہلے سے متعین ہیں اور ان کی ترویج اپنی جگہ لازمی ہے۔ یہ خدشہ بے بنیاد ہے کہ پنجابی، سندھی یا بلوچی زبان کسی دور میں بھی نامناسب رعایت کی وجہ سے اردو کے مدِ مقابل آسکیں۔ اردو اتنی زیادہ متنوع، ترقی یافتہ اور ہمہ گیر زبان ہے کہ کم از کم مغربی پاکستان کی حد تک عدلیہ انتظامیہ اور تعلیم کے تمام شعبوں میں سرکاری طور پر رائج کی جا سکتی ہے زبان کی اندرونی اور قدرتی صلاحیت کو مزید وسعت دینے کے لئے سب سے بڑی بنیادی بات یہ ہے کہ ادیب اور شاعر، تخلیقی، خارجی اور ترقی پسندانہ اقدار کو اپنی تحریروں میں زیادہ سے زیادہ سمونے کی کوشش کریں اس قسم کی تحریکی کوششیں تنظیمی کوششوں سے بہتر ہوتی ہیں۔

ادب میں گھٹن کے احساس کے موضوع پر ظہیر نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اس سے مراد اگر یہ ہے کہ ادب کم لکھا جا رہا ہے تو یہ غلط ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ آج ادب میں کوئی ہمہ گیر خارجیت پسند تحریک موجود نہیں تو یہ بلاشبہ درست ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس گھٹن کا تعلق کچھ خارجی حالات سے ہو لیکن بنیادی طور پر اس کا انحصار ادیبوں اور دانشوروں کے اسلوب نظر پر ہے اسی طرح جدید شاعری میں اچانک

نئی علامتیں ہر جگہ استعمال کی جاتی رہیں تو اس انقلابی لسانی تبدیلی سے شعر و ادب کے بے حسن ہو جانے کا خدشہ بھی ہے۔ چنانچہ سہل ادبی سے پرانی علامتوں کے ساتھ ساتھ نئی تشبیہات و استعارے استعمال کئے جاتے رہے تو انہیں مقبولیت ضرور حاصل ہو گی۔

دورِ حاضر کے مشاعروں کے سلسلے میں ظہیر کا خیال ہے کہ آج مشاعرہ دربار سے نکل کر فلموں اور سرکاری تقریبوں میں پہنچ گیا ہے۔ گو کہ مشاعرے شروع ہی سے ذریعہ آمدنی بھی رہے ہیں اور جمہوری ادارے بھی۔ اگلے وقتوں میں شعرا نوابوں سے مشاہرے بھی وصول کیا کرتے تھے اور کھلے بندوں جلی کٹی بھی سنادیا کرتے تھے ہجو ملیح کا فن تو سب ہی جانتے ہیں۔ چنانچہ آج بھی اہل قلم مشاہرے بھی وصول کرتے ہیں۔ اور ناگفتنی کو گفتنی بھی بنا دیتے ہیں۔ آج کل مشاعرے کی بنیاد مشاہرہ ہے یا جمہوریتِ فکر اس کا فیصلہ شعراء حضرات ہی کر سکتے ہیں۔

ان دنوں ظہیر کاشمیری روزنامہ "مساوات" لاہور سے وابستہ ہیں۔

ظہیر کاشمیری

عکسِ فن

ہم کو طوفان سے جب ملی فرصت
یاد آیا سلوک ساحل کا

سن لیا نالۂ جرس ہم نے
اُٹھ گیا اعتبار منزل کا

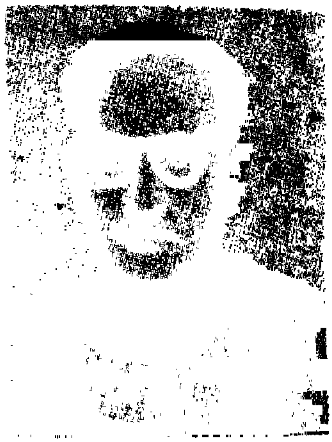
یہ رات پہ سلے گراں اندھیرے
اِک دل کا چراغ جل رہا ہے

ہم کل بھی سرِ دار صداقت کے امیں تھے
ہم آج بھی انکارِ حقیقت نہ کریں گے

ہمارے نام سے خائف رہو خدا وندو!
ہمارا نام ہے اعلانِ عظمت آدم،

اسی میں حکمتِ آسائشِ جہاں ہے ظہیر
کہ خاک پھانک سکو اور خوں اگل کے چلو

سیّد عابد علی عابدؔ



شب نگار بنداں
بر ریشم عود

پیدائش ۱۹۰۶ء
وفات ۱۹۷۱ء

عابد علی عابدؔ

کیا خیال ہے عابد صاحب اگر شعراء کے درمیان کھانے پکانے کا مقابلہ ہو جائے دیکھئے نا شعر و سخن کے مقابلے تو طرحی مصرعے دیکھ کر کرائے جاتے ہیں۔ اگر کھانے پکانے کا مقابلہ ہو جائے تو آپ کتنے نمبر لے جائیں گے"؟

گیارہ سال قبل کی بات ہے۔ جب میرے اس سوال پہ عابد صاحب خوب ہنسے پھر کہا کھانا تو میں گذارے لائق پکا لیتا ہوں۔ لیکن اگر سینڈوچ کا مقابلہ ہو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ مقابلے میں سرفہرست میرا نام ہوگا۔

یہ تو ایک ضمنی بات تھی لیکن یہ حقیقت ہے کہ عابد علی عابدؔ ہرفن مولا تھے۔ باورچی خانے کے علاوہ، افسانہ، ڈرامہ، تحقیق و تنقید اور شاعری کے میدان میں بھی دخل و عمل رکھتے تھے۔

سید عابد علی عابدؔ ۱۹۰۶ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ شاعری کا آغاز یوں ہوا کہ خود بھی نہ جان سکے کہ کب سے شعر کہنے شروع کئے "ہزار داستان" کے مدیر سہا مجددی بھوپالی نے حوصلہ افزائی کی۔ باقاعدہ کسی سے شرف تلمذ حاصل نہیں کیا۔ ایک غزل کسی رسالے میں شائع ہوئی تو گھر والوں نے بڑی لے دے کی۔ لیکن یہ اپنے مسلک پر قائم رہے اور یوں روایت پرستی کے خلاف جہاد جاری رہا۔ احمد شاہ بخاری پطرسؔ۔ اقبالؔ۔ جوشؔ، شادؔ، مصحفیؔ اور داغؔ سے متاثر ہوئے۔ لیکن شاعری میں رنگ ان کا اپنا ہی رہا۔ معاصر شعراء میں تاثیرؔ، فیضؔ چراغ حسن حسرتؔ، صوفی تبسم اور ن م راشدؔ سے خاص طور پر تعلقات رہے۔

عابد صاحب کو شعر کہنے کے لئے کسی خاص ماحول اور اہتمام کی ضرورت نہیں تھی بس جب کیفیت طاری ہوتی اور کاغذ قلم سنبھال گوشہ نشینی اختیار کر لیتے۔

۱۹۲۶ء میں عابد صاحب نے شادی کر لی' دوسرا نکاح ۱۹۵۸ء میں لاہور کالج برائے خواتین کی لیکچرار محبوب فاطمہ صاحبہ سے کیا۔ سیاسی اور سماجی تحریکوں سے ہمیشہ دور رہے البتہ حلقۂ ارباب ذوق کے ادبی مسلک پر گامزن تھے۔ یہ وابستگی شروع سے ہی تھی۔ اپنی شاعرانہ زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہوئے عابد صاحب نے بتایا تھا کہ ۱۹۲۶ء میں شملے میں ایک مشاعرہ مولانا حسرت موہانی کی صدارت میں ہوا۔ وہاں ایک مشہور شاعر " ویران تو ہوگا " بیابان تو ہوگا والی ردیف قوافی میں غزل پڑھی' مثلاً۔

کہا ہم عشق میں رو دیں کہا تم عشق میں رو دو
کہا طوفان کا ڈر ہے کہا طوفان تو ہوگا

پنڈت ہری چند اختر نے اس غزل کی پیروڈی کی اور کئی شعراء نے مل کر ایک غزل تیار کی اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو

کہا ہم اونٹ پر بیٹھیں کہا تم اونٹ پر بیٹھو
کہا کوہان کا ڈر ہے کہا کوہان تو ہوگا

اس طرح ایک مشاعرے میں مولانا حسرت موہانی نے غزل پڑھنا شروع کی مطلع ملاحظہ ہو۔

پہلے کہیں خدا اسے شوقِ شکار دے
پھر یہ کہ وہ ہمیں کو نشانہ قرار دے

صفِ اول میں ایک بزرگ تشریف فرما تھے۔

انہوں نے فرمایا مولانا مطلع پھر عنایت ہو۔ مولانا حسرت نے دونوں ہاتھوں سے اپنی عینک سرکائی اور عینک کے اوپر سے گھورتے ہوئے اس دخل در معقولات پر بولے۔ " کوئی ضرورت نئیں " (کوئی ضرورت نہیں)

عابد علی عابد روزانہ بلاناغہ مطالعہ کرنے کے عادی تھے۔ خصوصاً لسانیات' تاریخ' فارسی اور ادبیات اردو کا ذوق و شوق سے مطالعہ کرتے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا تھا۔

صاحب "ہمارے ادیب اور شعراء (گنتی کے چند ناموں کو چھوڑ کر) بچوں کے ادب کی تخلیق کی طرف توجہ کیوں نہیں دیتے"؟ تو جواب میں فرمایا کہ "میں بھی اس کی توجہ نہیں کر سکتا" (نہ جانے کیوں) اردو زبان کے متعلق ان کا خیال تھا کہ حالات امید افزا ہیں۔ ادب آج جیسا بھی لکھا جا رہا ہے۔ ہمارے دور کا صحیح ترجمان ہے۔ ان کے خیال میں ہمارا ادب آج مختلف تغیرات سے دوچار ہے۔ اس لئے نئی چیزوں میں ہمیں بعض اوقات ایسی چیزیں مل جاتی ہیں۔ جو مبہم یا کچھ بکھری بکھری سی ہوتی ہیں۔ ویسے جدید دورِ شاعری سے جو توقعات ہم نے وابستہ کر رکھی ہیں۔ وہ یقیناً پوری ہوں گی۔

اپنا یہ شعر انہیں بے حد پسند تھا۔

؎ وقتِ رخصت وہ چپ رہے عابدؔ
آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل

آتشؔ کا یہ شعر وہ اکثر گنگناتے تھے۔

؎ سفر ہے بشرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

عابد علی عابدؔ کا انتقال ہوا۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف رہے۔ جن میں تنقید پہ ان کی کتاب "اسلوب" اور شعری مجموعہ "شب نگار بنداں" بطورِ خاص یادگار ہیں۔

سیّد عابد علی عابدؔ

عکسِ فن

لوگ تو دامن سی لیتے ہیں، جیسے ہو جی لیتے ہیں
عابدؔ ہم دیوانے ہیں جو بال بکھیرے پھرتے ہیں

میرا جینا ہے سیج کانٹوں کی
ان کے مرنے کا نام تاج محل

گلشن میں عجب ہوا چلی ہے
پھولوں نے ہونٹ سی لئے ہیں

میں تو ہوں شیفتۂ رنگِ تغزّل عابدؔ
کہ یہی شاہدِ خونیں جگراں ہوتا ہے

اے دوستو، یہی ہے قیامت کہ روزِ محشر
ہم بھی جگائے جائیں گے خلقِ خدا کے ساتھ

کہتے تھے تجھی کو جان اپنی
اور تیرے بغیر بھی جئے ہیں

دمِ رخصت وہ چُپ رہے عابدؔ
آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل

عارف عبدالمتین



آتش سیال

دیدہ و دل

صلیب غم

موج در موج

پیدائش ۱۹۲۳ء

جتنی حسرت سے تری آنکھوں کا بادل برسا،
یہ الگ بات مرا شعلۂ غم بجھ نہ سکا!

تیرا پیکر ہے وہ آئینہ کہ جس کے دم سے،
میں نے سو روپ میں خود اپنا سراپا دیکھا!

ایک لمحے کے لئے چاند کی خواہش کی تھی،
عمر بھر سر پہ مرے قہر کا سورج چمکا!

میں نے جس شاخ کو پھولوں سے سجایا عارف،
میرے سینے میں اسی شاخ کا کانٹا اترا!

عارف عبدالمتین

۲۳ مئی ۱۹۶۹ء

عارف عبدالمتین

"تم اگر صحیح معنوں میں شاعر بننا چاہتے ہو تو ٹیگور کے کلام کو ماڈل بنالو۔" اسے نصیحت کہئے یا مشورہ جو میرے والد صاحب خواجہ عبدالحمید نے مجھے دیا تھا۔ اور جو قدم قدم پر میرے لئے مشعل راہ ثابت ہوا۔ ناناجان خواجہ غلام محمد کو سائنس اور فلسفہ کے مطالعے سے بڑا شغف تھا۔ والد صاحب کو بھی مذہب، سیاست اور ادب سے بڑا لگاؤ تھا۔ انگریزی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں کے ادب عالیہ کا انہوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا۔ فارسی شاعری سے بطور خاص حِظ اٹھاتے تھے۔ حافظؔ۔ عرفیؔ اور عمر خیام کی شاعری سے انہیں بالخصوص انسیت تھی اور اپنی گفتگو کے دوران ان کے اشعار کا حوالہ اکثر دیا کرتے تھے۔ جو کے جمالیاتی پہلو کی نگہداشت کے اس قدر قائل تھے اور اسے مقصدیت سے محفوظ رکھنے کے اس قدر آرزومند تھے کہ فرمایا کرتے تھے:

"شاعری تتلی کی طرح نرم و نازک شئے ہے۔ اس پر گدھے کا بوجھ لادنا دانشمندی نہیں۔"

ڈاکٹر ایم ضیاء الدین جو ٹیگور یونیورسٹی شانتی نکیتن میں پروفیسر تھے میرے خالو تھے۔ اپنے ان بزرگوں کی محبت کا فیض گھر کا حریت پسندانہ ماحول اور جلیانوالہ باغ کے شہداء کا خون جن چراغوں کو روشن کر گیا تھا وہ میرے دور و نزدیک بسنے والے تمام لوگوں کے دلوں میں بدستور فروزاں تھے اور رہیں گے۔"

یہ پس منظر شاعر عارف عبدالمتین کی سوانح کا ہے جو یکم مارچ ۱۹۲۳ء کو بمقام

کٹڑہ جمیل سنگھ امرتسر میں پیدا ہوئے۔ اپنی شاعرانہ زندگی کے ابتدائی حالات بتاتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ جانے کب اور کس طرح اس کا آغاز ہوا۔ ہاں بڑی بہنوں سے پتہ چلتا ہے کہ جب میں چھوٹا سا تھا تو ؎

بارش سے کیچڑ کمال ہو گئی
چیونٹی بھی چلنے سے بیزار ہو گئی

جیسی تک بندی کیا کرتا تھا اور اپنی دھن میں اسے گنگناتا پھرتا تھا۔ البتہ اتنا یاد ہے کہ جب میٹرک میں تھا تو ہم چار دوست چار "مومنانہ تخلص (ساجد، زاہد، عابد، عارف) رکھ کر باقاعدہ شعر گوئی میں مستغرق رہا کرتے تھے۔ باقی تینوں دوست تو بعد میں تائب ہو گئے مگر میں اتنا سخت جان نکلا کہ اب تک اس سے باز نہیں آیا اور نہ آئندہ امید نظر آتی ہے۔ جن اساتذہ سے میں نے باقاعدہ یا بے قاعدہ کسب نور کرنے کا شرف حاصل کیا ان میں پرنسپل دلاور حسین۔ پرنسپل کرامت حسین جعفری۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری فیض احمد فیض۔ پروفیسر سلیم فارانی۔ محمد عبد اللہ فلسفی اور خواجہ صادق حسن کے نام نامی نمایاں ہیں۔ ان ہستیوں سے میں جس طور پر متاثر ہوا ہوں وہ میرا نظام فکر، میرے زندگی کے عملی پہلو اور میرے فن سے ظاہر ہے۔ پھر جب والد صاحب کو میری شعر گوئی کا علم ہوا تو اول اول تو انہوں نے مجھے اس خار زار راہ پر چلنے سے بچائے رکھنے کی کوشش کی لیکن بعد میں انہوں نے یہ مشورہ دیا کہ اگر تم اس راہ پر چلنا ترک نہ کر سکو تو میری خواہش ہے کہ تم ٹیگور بنو مگر میں جانتا ہوں کہ تمہارے پاس ٹیگور ایسے ذرائع نہیں ہیں اور شاید تمہیں اس کے حصول کی آرزو بھی نہیں۔ پس میں بڑی اذیت کے ساتھ محسوس کرنے لگا ہوں کہ۔

ع موتی میرے کوڑیوں کے بھاؤ بک جانے کو ہیں

یہ مصرع وہ اکثر پڑھا کرتے اور تب ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک آتے غالباً ایسے مواقع پر ایک باپ کے ذہن میں مستقبل کے تباہ حال بیٹے کا تصور ابھرتا اور یہی چیز میرے لئے حیران کن تھی کیونکہ وہ ایک درویش صفت انسان تھے انہوں نے لاکھوں روپے حلال طریقوں سے کمائے اور اللہ کی راہ میں بے دریغ خرچ کئے اور کبھی کوئی معترض

ہوا تو ایک شان استغنا سے فرمایا
"اگر تو ہے مردِ مومن کوڑی نہ رکھ کفن کو۔" یہ صرف لفاظی نہ تھی حقیقت تھی اور ا
جبکہ میں خود چار بچوں کا باپ ہوں مجھے ان کی مذکورہ فکر مندی پر غور کرتے ہوئے حیر
نہیں ہوئی بلکہ اس کے جوند کا شدید احساس ہوتا ہے۔

عارف عبدالمتین صاحب نے شاعری کے علاوہ نثر نگاری کی طرف بھی توجہ دی۔
اور جس طرح شاعری کی تمام اصناف نظم، غزل، رباعی، قطعہ، فرد مثنوی وغیرہ سے طبع
آزمائی کی ہے اسی طرح نثر میں تنقیدی مضامین۔ افسانے اور ڈرامے بھی تخلیق کئے
ہیں۔ ایک ناول بھی لکھا۔ درسی کتب بے شمار لکھی ہیں۔ لیکن طبیعت کا میلان صرف مضمون
نویسی کے لئے موزوں پایا ہے۔

ادب ہر زمانے اور ہر دور میں اس دور کی تحریک سے متاثر رہا ہے۔ عارف صاحب اس
سے متفق ہیں۔ اپنے بارے میں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک باشعور اور حساس انسان کی طرح ہر تحریک
سے میں متاثر ہوتا ہوں لیکن اپنے ذہن کے دروازے کھلے رکھ کر۔ اور یہی وجہ ہے کہ کسی بھی
تحریک سے خواہ وہ علاقائی ہو، قومی ہو یا بین الاقوامی میں متاثر ضرور ہوا۔ لیکن خود کو تحریک
کا تابع نہیں ہونے دیا۔ ہر تحریک کے متعلق میرا ردِ عمل میرے اپنے آزاد اور غیر مشروط
غور و تدبر کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ میں نے حقیقت کو کبھی یک پہلوی شے سمجھنے کا جرم نہیں
کیا۔ میرے نزدیک یہ ہزار پہلوی ہیرے کی مانند ہے اور انسان کو اس کے تمام پہلوؤں
سے منعکس اور منعطف ہونے والی شعاعوں سے بصیرت افروزی کا کام لینا چاہیئے۔
میرے ہم عصروں کی اکثریت نے بھی مجھے بہت کم سمجھا بلکہ میں نے اپنے آپ کو
HIGHLY MISUNDERSTOOD PERSON خیال کیا ہے۔ ان کی ایک طرفگیوں کے
پیشِ نظر مجھے اکثر اس المناک صورت سے دوچار ہونا پڑا ہے کہ ؎

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

بہرحال یہ المناک صورتِ حال مجھے گوارا ہے۔ اس کے برعکس میں اس کیفیت سے ہم آغوش

بھنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں کہ کوئی سا ایک گروہ مجھے اپنا ہم خیال سمجھ کر مجھے اپنے دل میں جگہ دے اور میں ان روایتی اندھوں کی صف میں کھڑا ہو جاؤں جنہوں نے ہاتھی کے بدن کے جس حصے کو چھوا تھا اسے کلی طور پر اس شے کے مشابہ قرار دے دیا تھا جس سے وہ مشابہ تھا۔"

زبان اردو کے مستقبل کے سلسلے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ گو میں پر امید ہوں لیکن اِن خطرات سے بھی غافل نہیں ہوں جو اس کے وجود کو لاحق ہیں میری رائے ہے اگر اردو کے دوستوں نے اردو کے مفادات کا تحفظ ایسے غیر جذباتی اور دور اندیشانہ انداز میں نہ کیا جس سے علاقائی زبانوں کے بولنے والوں کو کامل اطمینان و اعتماد ہو کہ ان کی زبانوں کا اردو کے حامیوں کی طرف سے پورا پورا احترام کیا جا رہا ہے اور وہ عملاً چاہتے ہیں کہ یہ زبانیں اپنی جائز حدود کے اندر اپنی مکمل حاکمیت کے ساتھ نشوونما پائیں تو اس امر کا زبردست اندیشہ ہے کہ علاقائی مفاد پرست قوتیں اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر ایسے حالات پیدا کر دیں کہ ایک دن ہم اس عظیم تہذیبی ورثہ سے ہی ہاتھ دھو بیٹھیں۔ جسے ہم نے کئی سو سال کی شبانہ روز کاوشوں سے فراہم کیا ہے اور جس پر پوری انسانیت بجا طور پر ناز کر سکتی ہے ظاہر ہے کہ یہ ایک بہت بڑا المیہ ہوگا اور اس المیہ کے ظہور کی ذمہ داری خود اُردو کے بہی خواہوں پر ہوگی۔"

اردو شعر و ادب کی ترقی کے لئے انہوں نے چند تجاویز پیش کرتے ہوئے فرمایا۔

(۱) ملک میں ناخواندگی کی شرح میں اضافہ کے لئے زبردست جہاد کیا جائے۔ کیونکہ پڑھے لکھے عوام ہی صحیح معنوں میں علم و ادب کے سرپرست ہو سکتے ہیں۔ حکومت پر اس سلسلے میں بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

(۲) ملک میں شعراء اور ادباء کے سماجی مرتبہ کو بلند کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی تاکہ شعر و ادب کے میدان میں کام کرنے کے لئے ذہین لوگوں میں رغبت پیدا ہو۔ کیونکہ تخلیق فن کا میدان اپنی نشوونما کے لئے بڑی حد تک معاشرتی پذیرائی کا مرہونِ منت بھی ہے۔

۳۔ حکومت کو آمادہ کیا جائے کہ وہ ایک وسیع منصوبے کے تحت پورے ملک میں پبلک لائبریریوں کا ایک جال پھیلائے جن کے ذریعے ایک طرف تو لوگوں کو اپنی جیب پر بوجھ

ڈالے بغیر علم و ادب تک رسائی حاصل ہو اور دوسری طرف اشاعتی اداروں کی سرپرستی کا ایک پہلو نکل آئے۔

(۴) مذکورہ بالا لائبریریوں کے لئے کتب کی خریداری کو ایک ایسے مرکزی حکومتی ادارے کے سپرد کر دیا جائے جو جملہ معیاری اشاعتی اداروں سے براہ راست کتب خرید کر انہیں مہیا کرے اور یوں چند بڑے اشاعتی اداروں کی بالواسطہ اجارہ داری پر قدغن لگائی جائے اور چھوٹے چھوٹے اشاعتی اداروں کو پنپنے اور علم و ادب کی خدمت کرنے کے مواقع فراہم کئے جائیں...

(۵) اردو زبان میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں سرکاری نیم سرکاری اور غیر سرکاری جریدے شائع کرنے کا میلان پیدا کیا جائے اور ان میں شائع ہونے والی سفارشات مناسب و معقول معاوضہ ادا کرنے کا اہتمام کیا جائے، تاکہ تحریر و تخلیق کا معیار بلند ہو۔ قلم کاروں کے روزگار کی راہیں کشادہ ہوں اور عام قاری کی ذہنی سطح میں رفعت پیدا ہو۔

(۶) مشاعروں کے فروغ کی طرف خصوصی توجہ کی جائے۔ کیونکہ اردو ادب کی تاریخ شاہد ہے کہ مشاعروں نے اردو کی مقبولیت اور اس کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ انہیں سابقہ ارفع سطح تک پہنچانے کا خاص اہتمام کیا جائے اور انہیں ان کی موجودہ پست سطح سے نجات دلائی جائے۔

(۷) اردو ٹائپ میں مطلوبہ اصلاح کر کے اس کی ترویج کی کوشش کی جائے تاکہ ہمارا اشاعتی اور طباعتی نظام عہد حاضر کی برق رفتاری کا ساتھ دے سکے۔

(۸) ملک میں مختلف ادبی انجمنوں اور تنظیموں کے قیام کے لئے جد و جہد کی جائے جو نظریاتی اختلافات کے باوجود اردو شعر و ادب کے سلسلے میں متفق ہوں اور ایک دوسرے سے بھرپور تعاون کریں۔ یہ ادبی جماعتیں اپنے تنقیدی جلسوں میں اس امر کا خاص خیال رکھیں کہ بحثیں ستائش و مناقشتِ باہمی کے اظہار کا ذریعہ بننے کے بجائے حاضرین میں اعلیٰ تنقیدی شعور پیدا کرنے کا موجب بنیں۔

(۹) موجودہ ادبی انعامات کے سلسلے کو توسیع دی جائے اور اس ضمن میں حکومت اور ملک کے صنعتی اداروں ہی کی طرف رجوع نہ کیا جائے بلکہ مختلف مقتدر اشاعتی اداروں کو بھی غیر معمولی معیار کی حامل علمی ادبی کتب پر سالانہ انعامات مقرر کرنے پر آمادہ کیا جائے البتہ تمام انعامات کے استحقاق کا فیصلہ بڑے غیر جانبدارانہ انداز میں مختلف مصلحتوں سے بالاتر ہو کر کیا جائے اور ان شرائط کی تکمیل کے لئے انتہائی معتبر اور فنی بصیرت کے مالک ججوں کا تقرر عمل میں لایا جائے۔

(۱۰) حکومت کی طرف سے ادبی جرائد کی سرپرستی بڑے بھرپور انداز میں کی جائے اور اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ حکومت انہیں اپنے اشتہارات متواتر فراہم کرنے کا اہتمام کرے اور اس سلسلے میں اگر کوئی ترجیحی سلوک روا رکھا جائے تو محض معیار کی بلندی کا قدرتی نتیجہ ہو۔

(۱۱) ریڈیو اور ٹیلیویژن ہر دو ادارے اردو زبان و ادب کے فروغ کے لئے کارہائے نمایاں سرانجام دے رہے ہیں۔ ان کی خدمات کی افادیت کی حدود کو وسیع تر کرنے کی غرض سے فاضل ادباء کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو ان اداروں میں معقول ملازمتیں مہیا کی جائیں اور ایسا کرتے وقت ان کی تعلیمی معذوریوں سے صرف نظر کر کے ان کی علمی و ادبی فضیلت اور اس کے بل بوتے پر حاصل کردہ مقام کو پیش نگاہ رکھا جائے۔

(۱۲) کالج کی تدریسی سطح پر جدید ادب کی مناسب اور تدریجی نمائندگی کا اہتمام کیا جائے بالخصوص ایم اے کا نصاب یوں وضع کیا جائے کہ اس کا ایک پرچہ صرف جدید ادب کے مطالعہ کے لئے وقف ہو۔

عارف عبدالمتین کے اب تک کئی مجموعہ کلام شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

دیدہ و دل، موج در موج، آتش سیال، اور صلیب غم۔

انہیں اپنے اشعار میں یہ شعر پسند ہے۔

اپنے بچوں کی طرف غور سے جب بھی دیکھا
کتنے ہی رنگوں میں بکھرا ہوا پایا خود کو

عارفؔ عبدالمتین

عکسِ فن

کتنی حسرت سے تری آنکھ کا بادل برسا
یہ الگ بات مرا شعلۂ غم بجھ نہ سکا

مَیں نے جس شاخ کو پھولوں سے سجایا عارفؔ
میرے سینے میں اسی شاخ کا کانٹا اُترا

مری عظمت کا نشاں، میری تباہی کی دلیل
مَیں نے حالات کے سانچے میں نہ ڈھالا خود کو

مَیں تیرے ذہن میں رچ بس گیا ہوں مثلِ خیال
جدھر بھی جائے گا تُو، میرا سامنا ہوگا

زمیں کی ایک جنبش ہی بہت ہے
زمیں سے آملیں گے یہ محلّے!

جو اُبھرے وقت کے سانچے میں ڈھل کے
وہ ڈوبے ایک عالم کو بدل کے

جمیل الدین عالی



غزلیں دوہے گیت
لاحاصل
جیوے جیوے پاکستان

پیدائش سنہ ۱۹۲۶ء

غزل کے شعر

[illegible]
[illegible] یاد آؤ گے

[illegible]
[illegible] یاد آؤ گے

جو بھی تم نے شہرت پائی ہو [illegible]
[illegible] یاد آؤ گے

[illegible]
[illegible] یاد آؤ گے

عالی [illegible]
[illegible] یاد آؤ گے

گورا یا کالا رنگ، کنجی یا غلافی آنکھیں، سیدھے یا گھنگھریالے بال وغیرہ تو ایسی چیزیں ہیں جو انسان کو آباؤ اجداد سے ورثے میں ملتی ہیں لیکن کیا شاعری بھی ملتی ہے؟ اس کا فیصلہ آج تک نہیں ہو سکا ہے لیکن عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ جن گھرانوں میں علم و ادب اور شعر و سخن کا چرچا ہوتا ہے وہاں پرورش پانے والے بچے صاحب ذوق نکلتے ہیں۔

جمیل الدین عالیؔ نے آنکھ کھولی تو کچھ ایسا ہی ماحول پایا۔ علاؤ الدین خاں علائیؔ آف لوہارو اسٹیٹ جو غالبؔ کے خلیفہ اور شاگرد تھے، ان کے دادا تھے۔ ان کے پردادا کی بہن امراؤ بیگم غالبؔ کو بیاہی تھیں۔ والد تھے نواب سر امیر الدین احمد خاں فرخ مرزا والئ لوہارو۔ یہ وہی فرخ مرزا ہیں۔ جن کے بچپن میں غالبؔ نے انہیں ایک جوابی خط لکھا اور اپنے آپ کو ان کا دلدادہ کہا۔ ایک چچا ضمیر الدین خاں عالی فارسی کے شاعر تھے۔ دوسرے رشتے کے چچا نواب سائلؔ دہلوی داغؔ کے نورتنوں میں سے تھے اور پورے ہندوستان میں ان کے نام کے ڈنکے بج رہے تھے۔ ان کی والدہ بھی خواجہ میر دردؔ کی پڑپوتی ہیں۔ غرض جو ماحول انہیں ملا بہت سوں کو نصیب نہیں ہوا۔

پورا نام مرزا جمیل الدین احمد خاں یکم جنوری ۲۶ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ بارہ تیرہ سال کی عمر میں شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ چچا سائلؔ دہلوی کے پاس ہزاروں شاگرد آتے تھے۔ یہ بھی پہنچے۔ اپنے شعر پر اصلاح لی لیکن داغؔ کے شاگرد کی اصلاح اس

بارہ تیرہ سال کے بچے کو پسند نہیں آئی لہذا حضرت سائل نے انہیں باضابطہ شاگردی میں لینے سے انکار کر دیا۔ بر سبیل تذکرہ جس شعر پر "جھگڑا" ہوا وہ بھی سنا دیتے ہیں۔ عمر کوئی بارہ تیرہ سال تھی۔

ہائے دل اس کی اداؤں پہ فدا ہوتا ہے
مدتوں کا مرا ہمسایہ جدا ہوتا ہے

سائل صاحب نے دوسرے مصرع پہ اصلاح دی

جو کلیجے کا تھا ہمسایہ جدا ہوتا ہے

بس کلیجے سے چڑھ گئے۔ انہوں نے شروع میں اپنا تخلص مائل رکھا لیکن چچا کے استاد بھائی اس نام سے جے پور میں موجود اور مشہور تھے۔ لوگوں نے ٹوکا تو پندرہ بیس دن بعد یہ تخلص چھوڑ کر حقیقی چچا کا تخلص عالی اختیار کر لیا۔ عالی کے دوہے سنتے وقت کچھ لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ ان کا تخلص ہندی کا آلی ہے۔ جس کے معنی محبوب کے ہیں۔ مثلاً علامہ آرزو کا گیت ہے۔

مورے انگنا میں آئے آلی
میں چال چلوں متوالی

لیکن ہندی میں یہ لفظ فارسی سے آیا ہے۔ مغل شہزادوں کو عالی جاہ کہہ کر خطاب کیا جاتا تھا اور راجپوت لڑکیاں اس کے خواب دیکھا کرتی تھیں کہ کوئی شہزادہ آکر انہیں بیاہ لے جائے گا۔ مارواڑ کے لوک گیتوں میں محبوب کے لئے "آلی جا" استعمال ہوتا ہے۔ جو عالی جاہ کی ہی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ غرض عالی کا تخلص چاہے فارسی میں ہو خواہ ہندی میں اصل میں وہ 'عین' سے ہی ہے۔ الف سے نہیں ہے۔

عالی نے تعلیم دہلی میں حاصل کی اور اینگلو عربک کالج سے ۱۹۴۴ء میں بی۔اے کیا۔ اسی سال بلند شہر میں خاندان ہی کی ایک لڑکی سے شادی ہو گئی۔

۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۷ء تک تین سال عالی کے اکتساب شعور کا زمانہ ہے۔ بلند شہر کے مضافات اور تلنگانہ میں انہیں عوامی جلسوں اور میلوں ٹھیلوں میں شرکت کا

موقع ملا۔ آلہا اُودل اور اس قسم کے گیت سنے اور دیہی علاقوں کی زبان نے اپنی چاشنی میں گم کر لیا۔ یہیں سے ان کے دوہے شروع ہوئے۔ بعد میں مشرقی پاکستان کے دوروں نے کچھ بنگال کی چھاپ بھی لگادی۔ بہت جلد دوہوں کی وجہ سے خصوصی شہرت حاصل کرلی ہندوستان پاکستان کے بڑے بڑے نقادوں نے یہاں تک کہا کہ بھگت کبیر کے تین سو برس بعد دوہوں کا احیاء عالیؔ جی نے کیا ہے۔ ان سے پہلے بہت مشکل زبان میں معدودے چند شعرا تو نظر آتے ہیں۔ جیسے دو سو برس پہلے "ست سئی" کے مصنف بہاریؔ یا کوئی پچاس برس قبل کے خواجہ ولی محمد ایم۔اے جو مشہور تو حساب پر اپنی نصابی کتابوں سے ہوئے مگر جن کا ایک پورا مجموعہ دوہوں پر مشتمل ہے۔ یہاں اس کی پذیرائی نہیں ہوئی۔ مگر بقول پروفیسر حسن عسکریؔ مرحوم عالیؔ جی کے دوہے بڑے شاداب اور ہرے بھرے ہوتے ہیں۔ انہوں نے ہندی اردو کے امتزاج سے ایک اپنی زبان بنائی ہے۔ جو اردو سے زیادہ مختلف نہیں اور بہت آسان اور اثر انگیز ہے۔

عالیؔ جی ۴۷ء میں پاکستان آگئے۔ پہلے کامرس منسٹری میں اسسٹنٹ رہے۔ پھر اعلیٰ سروس کا امتحان پاس کرلیا۔ ۵۱ء میں انکم ٹیکس افسر ہوگئے۔ ۵۹ء میں اعلیٰ ملازمتوں کے لئے انتخاب ہوا تو یہ ایوانِ صدر کے عملے میں لے لئے گئے اور ۶۳ء تک افسر بکار خاص کے عہدے پر فائز رہے۔ پھر وزارت تعلیم میں رجسٹرار کاپی رائٹ ہو کر چلے گئے۔ اس کے بعد نیشنل ڈیپوٹیشن پر نیشنل پریس ٹرسٹ کے سکریٹری کی حیثیت سے تبادلہ ہوگیا۔ اپریل ۶۷ء میں سرکاری ملازمت اور اس عہدے، دونوں سے استعفیٰ دے دیا۔ جنوری ۶۷ء میں نیشنل بنک میں اعلےٰ عہدیدار بنے۔ ان کی زندگی کا یہ پہلو ان کی تلون مزاجی با ہمہ صفت طبیعت پر روشنی ڈالتا ہے۔ مقابلوں اور انتخابات میں ہمیشہ جیتے ہیں... سوائے ایک کے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

عالیؔ نے اساتذہ میں تقریباً سب ہی کو پڑھا ہے لیکن میرؔ، دردؔ، آتشؔ، غالبؔ اور نظیرؔ سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ اردو کے سب سے بڑے شاعر غالبؔ اور اقبالؔ کو

مانتے ہیں ۔ جگر اور فراق کو پسند کرتے ہیں اور موجودہ شعرا میں فیض، مختار صدیقی، احمد ندیم قاسمی اور اختر الایمان کے زیادہ قائل ہیں ۔ گیتوں میں علامہ آرزو لکھنوی اور میرا جی کو بہت مانتے ہیں۔

عالی ان "آٹھ بڑوں" میں سے ایک ہیں جنہوں نے رائٹرز گلڈ قائم کیا ۔ دراصل یہ خیال انہیں کا تھا جسے جناب قدرت اللہ شہاب اور دوسرے مشاہیر کی تائید حاصل ہوئے سب پاکستانی زبانوں اور مکاتیب خیال کے ادیبوں کا پہلا کنونشن جو ۱۹۵۹ء کی جنوری میں منعقد ہوا انہی کی محنت شاقہ کا نتیجہ تھا ۔ اس کنونشن نے گلڈ کو جنم دیا ۔ اکیڈمی آف لیٹرز کا خاکہ منظور کیا اور قدرت اللہ شہاب کو سیکریٹری جنرل اور عالی کو مرکزی معتمد منتخب کیا ۔ گلڈ کے پہلے مرکزی سیکریٹری پھر سیکریٹری جنرل منتخب ہوتے رہے ۔ انہوں نے ۱۹۵۹ء یعنی گلڈ کی تاسیس سے ۱۹۷۰ء تک اس میں رضاکارانہ کام کیا ۔ مخالفتیں بھی سہیں ، کارنامے بھی سرانجام دیئے ۔ خیر وہ ایک الگ کہانی ہے ۔ انجمن ترقی اردو سے بچپن سے تعلق ہے ان کی تصنیفات میں سفرنامے اردو کے طویل ترین سفرنامے ہیں ۔ یہ پورے تین برس سلسلہ وار ہر ہفتے "جنگ" میں چھپتے رہے ہیں۔

پچھلے چند سال سے شاعری کے بارے میں عالی کا تصور بدل گیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ شاعری اور ادب اور دیگر فنون کو معاشرتی انقلاب کا ذریعہ ہونا چاہیئے لیکن اس عقیدے کو شاعری میں ابھی ڈھالنے کا موقع نہیں ملا ہے ۔ گیارہ بارہ برس مصروفیت واقعی بہت زیادہ رہی ہے بیک وقت گلڈ انجمن ترقی اردو اور اردو کالج کی اعزازی معتمدی اور ملازمت الگ ۔ شعر بہت کم کہے ہیں ۔ نثر زیادہ لکھی ۔ پھر شعر کی طرف آئے تو قومی نغموں اور گیتوں میں ایک اپنی راہ الگ نکالی ۔ ان کے پندرہ ترانے ، مثلاً "جیوے جیوے پاکستان" ، "ہم مصطفوی ہیں" ، "اسے دلیس کی ہواؤ" ، تو تقریباً سارے پاکستانیوں کی زبان پہ آگئے ہیں ۔ چند بہت خوب صورت گیت لکھے ۔ جن میں راگ راگنیوں کا التزام ہے ۔ مگر غزل بہت کم کہہ سکتے ۔ اب پھر ادھر آرہے ہیں ۔ گو انہیں یقین نہیں کہ اب پہلے سی غزل کہہ سکیں گے ۔ ان کی غزل پہ فارسی کا رنگ غالب رہا ہے ، مگر ایک اپنا رنگ بھی پیدا کیا ہے ۔ پہلے مجموعے پہ پروفیسر عسکری مرحوم نے اپنے مقدمے

میں یہ کہا تھا کہ وہ عالی کو پاکستان کے دو ڈھائی بڑے بڑے شعراء میں شمار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے انہیں خالص غزل گو کا خطاب دیا تھا۔

عالی بڑے زبردست قسم کے ذکعاڑ' واقع ہوئے ہیں اور کام کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں۔ وہ ۱۹۶۳ء سے مستقلاً ایک ہفتہ وار کالم "جنگ" میں لکھ رہے ہیں۔ گلڈ کے زمانہ کار میں کوئی تیس کتابیں مختلف پاکستانی زبانوں میں مشاہیر پاکستانی ادیبوں کی چھاپیں۔ انجمن کی پرانی ڈکشنری نظر ثانی کے بعد چھپوائی۔ قاموس اللغات کی تین ضخیم جلدیں آچکی ہیں۔ کل ملا کر انجمن سے اٹھانوے کتابیں ان کے انتظام و انصرام میں چھپی ہیں۔ اس کے جرائد' سہ ماہی" اردو" اور ماہنامہ" قومی زبان" انہی کی نگرانی اور ادارتی شرکت میں شائع ہوتے ہیں۔ مرکزی اردو بورڈ لاہور سے کئی سالہ تعلق کے زمانے میں اس کے نہایت اہم اشاعتی منصوبے بنانے میں مسلسل عملی حصہ لیا۔ کئی کتابیں تجویز کیں اور مرتب کرائیں۔ یہ سب شاعری نہیں۔ اور انہیں شاعری کو نظر انداز کرنے پر معاف نہیں کیا جا سکتا مگر مگر یہ سب ادبی خدمت تو ہے۔ اردو کالج فنون کو چلانا نئے اردو سائنس کالج کی تعمیر کرانا (جس میں کئی ہزار طلباء و طالبات پڑھتے ہیں) کسی کھاتے میں تو جاتا ہے۔

۱۹۶۰ء میں پاکستانی مندوب ہو کر روس گئے۔ ۱۹۶۱ء میں یونیسکو کا فیلوشپ ملا اور یورپ اور امریکہ میں تربیت حاصل کی۔ ۱۹۶۲ء میں ہارورڈ یونیورسٹی کے بین الاقوامی مذاکرے میں پاکستان کی طرف سے شرکت کی پھر ۱۹۶۸ء میں روس میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ ۱۹۶۶ء اور ۱۹۶۷ء میں چین گئے اور افریشیائی تنظیم سے گلڈ کا اشتراک رکھا۔ ۱۹۶۸ء میں قومی ثقافتی کمیشن قائم ہوا تو جناب فیض احمد فیض صدر اور یہ نائب صدر رہے۔ رپورٹ پر اختلافات ہوئے تو یہ الگ ہو گئے۔ ۱۹۷۵ء میں روس نے تقریبات امیر خسرو منعقد کیں تو انہوں نے پاکستانی وفد کی قیادت کی۔ دسمبر ۱۹۷۵ء میں انہیں نوبل فاؤنڈیشن نے نوبل ادبی اور سائنسی انعامات کی تقریب دیکھنے اسٹاک ہوم بلایا۔ غالباً یہ پہلے ایشیائی ادیب ہیں جنہیں انعام ملے بغیر تقسیم انعام میں مہمان کے طور پر شریک کیا گیا۔ لوگ کہتے ہیں ادب پر پوری توجہ دیں تو کیا پتہ ایک دن نوبل انعام

بی لے کر دکھا دیں۔ لیکن نہ یہ ادھر پوری توجہ دے رہے ہیں نہ اب اس کا امکان باقی رہ گیا ہے۔ بہر حال ۱۹۶۰ء سے پیر میں ایک چکر ہے جو ختم ہونے میں نہیں آتا۔ اسے کسی فقیر کی بد دعا سمجھ لیجئے یا سراج الدین ظفر کی پیشین گوئی۔ یہ بھی ایک لطیفہ ہے۔ یہ ۱۹۵۹ء کا ذکر ہے۔ ملتان کے ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے شعراء کا ایک قافلہ جا رہا تھا۔ اس میں ظفر نے اپنی لوہتی چوپڑی نکالی اور جیوتش و دیا سے ساتھیوں کا "بھوشیہ" معلوم کرنے لگے۔ ان کے بارے میں بتایا کہ تم ساری دنیا کا سفر کرو گے۔ یہ بات ہو کر رہی۔ کچھ خراب حالات کی پیشین گوئی کی سو وہ بھی پوری ہوئی۔ ظفر صاحب نے حکم لگایا تھا کہ عالی بہت بڑے آدمی بنیں گے۔ کچھ لوگوں کی رائے میں ان کی نصف پیشینگوئی تو پوری ہو چکی ہے۔ ویسے عالی جی بڑے اصرار سے اپنے آپ کو بہت چھوٹا شاعر اور بہت چھوٹا آدمی کہتے ہیں۔

عالی صاحب کو کھانے میں کچھ چیزیں بہت پسند ہیں۔ مثلاً جاڑوں میں نہاری اور گاجر کا حلوہ، گرمیوں میں مولی کا ساگ، تخم ریحان کا شربت اور ستو۔ پان زندگی بھر نہیں کھایا۔ مرغ کے اتنے شوقین ہیں کہ ان کے دوست دوست نے محض ان کے ڈر سے پولٹری فارم نہیں کھولا۔ وزن پہلے ۱۴۵ پونڈ تھا۔ یورپ کا دورہ کر کے لوٹے تو کپڑے تنگ ہو گئے۔ چاہتے تو ہیں کہ وزن ۱۴۵ پونڈ رہ جائے لیکن اس سلسلے میں عملی طور پر کچھ کر نہیں پاتے۔

عالی کی آواز ایسی پاٹ دار ہے کہ مائک کی محتاج نہیں۔ ترنم بڑا دلآویز اور خصوصی نوعیت کا ہے۔ مشاعروں پہ چھا جاتے ہیں لیکن برسوں سے حتی الامکان شرکت سے کتراتے ہیں۔ یہاں مدت سے عالی جی کو کسی مشاعرے کیا نشست میں بھی نہیں پایا۔ لوگ ان کے رومانی دوہوں اور ان کی آواز کے عاشق ہیں اور بطور تبرک ٹیپ کر کے رکھ لیتے ہیں۔ ان کے نغموں کے کئی لانگ پلے ریکارڈ مشاہیر گانے والوں کی آواز میں آ چکے ہیں۔ خود ان کی آواز میں دوہوں اور غزلوں کا ریکارڈ اور کیسٹ تیار ہوا ہے۔ وہ ایک مسحور کن، بلند اور صد بھری آواز کے مالک ہیں۔ گو یہ ادب کا میدان نہیں مگر

اس میدان میں بھی ان کا شمار حضرت جگر مرحوم کے بعد شکیل بدایونی اور مجروح سلطانپوری کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہندوستان پاکستان میں نئے دوہے کہنے والے کئی شعرا اور شاعرات ان کو اپنا گرو مانتے ہیں۔ ان کا نام اپنے دوہوں میں بطور عقیدت لاتے ہیں۔ مگر کاش یہ اس صنف میں مزید اضافے کریں۔

۱۹۷۴ء سے ۱۹۵۸ء تک ان کا ایک طویل منظوم ڈرامہ "انسان" نیا دور کراچی میں بالاقساط شائع ہوتا رہا۔ پھر یہ خاموش ہو گئے۔ دو برس پہلے اس کے چند نئے حصے پھر چھپے مگر یہ ڈرامہ پورا کر کے نہیں دیتے۔ اس سے مطمئن بھی نہیں ہیں اور مکمل کرنے کا طریقہ بھی نہیں جانتے۔ پوچھا جائے تو کبھی کہتے ہیں جلد پورا کر دوں گا۔ کبھی کہتے ہیں وہ تو میری موت تک بھی پورا نہ ہوگا۔ "انسان" دراصل ڈرامہ نہیں۔ اس میں ایکشن تقریباً ناپید ہے وہ کچھ کرداروں کے طویل مکالموں کا مجموعہ ہے جو فکر و بیان کے لحاظ سے بہت طاقت ور ہیں۔ اصل تھیم کیا ہے یہ اب تک نہیں کھلا۔ شاید جلد کھل جائے شاید کبھی نہ کھلے۔

عالی نے ۱۹۷۰ء میں قومی اسمبلی کا الیکشن بھی لڑا اور ہار گئے۔ انہیں پیپلز پارٹی نے غالباً ان کی بے پناہ مقبولیت سے متاثر ہو کر ان کے کسی سیاسی تجربے کے بغیر ایک دن اچانک قومی نشست کے لئے ٹکٹ دے دیا اور انہوں نے لے لیا اور لڑ گئے اور بہت نقصان اٹھایا۔ تجربے کے لحاظ سے اسے فائدہ بھی کہہ سکتے ہیں مگر اس بات پر بہتوں کا اتفاق ہے کہ ادیب کو عملی سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہئے خود یہ بھی متفق ہیں یا نہیں۔ اس کا پتہ نہیں چلتا۔ بہر حال نئے قوانین کی رو سے یہ دوران ملازمت یا ملازمت سے سبکدوش ہونے کے دو برس بعد تک عملی سیاست میں حصہ نہیں لے سکتے۔ اس مختصر سیاسی تجربے نے ان کے اندر کے شاعر سے کیا لیا یا اسے کیا دیا۔ یہ وقت ہی بتائے گا۔

جمیل الدین عالی

عکسِ فن

عشق چھپے اور مُشک چھپے اور جوبن تک چھپ جائے
سچا بول اور جھوٹی کویتا کبھی نہ چھپنے پائے

تہ میں بھی ہے حال وہی جو تہ کے اوپر حال
مچھلی بچ کے جائے کہاں جب جل ہی سارا جال

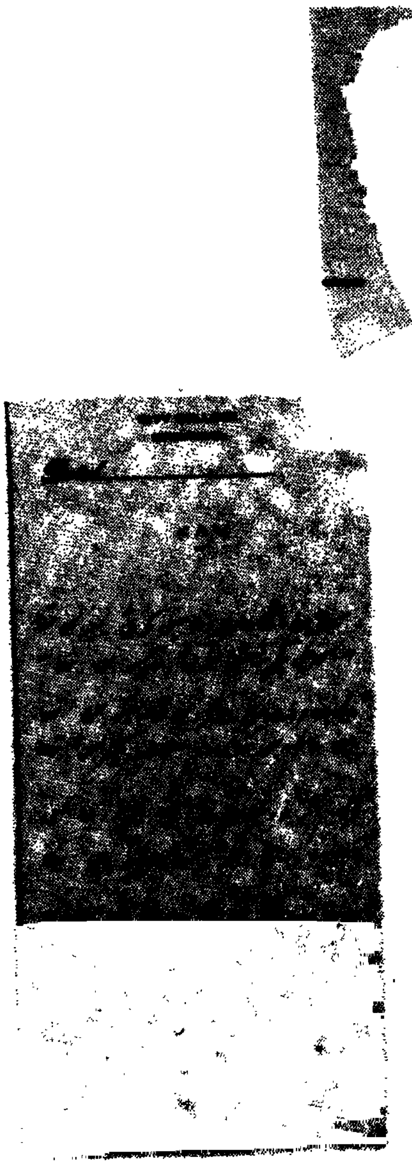
سِرِّ حقیقت ہاتھ نہ آیا بھول گئے افسانے بھی
پہلے ہی کیا کچھ تھے عالی اب ٹھہرے فرزانے بھی

کہیں تو ہو گی ملاقات اے چمن آرا
کہ میں بھی ہوں تری خوشبو کی طرح آوارا

ہنسی میں تلخیٔ آلام کو چھپائے ہوئے
چلے چلو یُوہنی بارِ حیات اٹھائے ہوئے

تجھ میں کیا بات ہے جو مجھ میں نہیں ہے ظالم!
ہاں مگر تیرے لئے میرا پریشان ہونا

عظیم عبّاسی



پیدائش ۱۹۰۶ء

عظیم عباسی

کسی کو شاعر بنانا ہو تو اس کا مجرب نسخہ یہ ہے کہ اسے کسی بڑے مشاعرے کا صدر بنا دیجئے۔ عظیم عباسی کا بھی یہی قصہ ہوا۔ ۱۹۳۵ء میں لاء کالج جبل پور میں آل انڈیا مشاعرہ ہوا اور طلبا نے انہیں صدر بنا دیا۔ شعراء کی ایک ٹولی نے یہ کہہ کر مشاعرے کا بائیکاٹ کر دیا کہ غیر شاعر کو صدارت کیوں دی گئی۔ صدارتوں کے پیشہ ور ٹھیکیدار الگ برہم تھے کہ ان کی حق تلفی ہوئی ہے۔

شعر کہنا تو درکنار عظیم عباسی نے اس سے پہلے کبھی تقریر بھی نہیں کی تھی۔ طلباء کا یہ اصرار تھا کہ ہمارے انتخاب کی لاج رکھنے کے لئے ایک زوردار خطبہ صدارت ہونا چاہئے۔ بہرحال مشاعرہ ہوا اور خطبہ صدارت سن کر تو لوگ عش عش کر اٹھے۔ انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ جس شخص کو کبھی اسٹیج پر نہیں دیکھا وہ ایسی رواں، جامع اور مدلل تقریر بھی کر سکتا ہے۔ قصہ یہ تھا کہ عظیم عباسی نے تقریر لکھ کر خوب اچھی طرح رٹ لی تھی اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر درجنوں ریہرسل کئے تھے۔ اگر اس وقت کوئی بیچ میں ٹوک دیتا اور یہ تسلسل بھول جاتے تو ساری پول کھل جاتی۔ لیکن خدا نے پردہ رکھ لیا۔ اس کے بعد انہوں نے سنجیدگی سے سوچا کہ جب کوشش کر کے آدمی مقرر بن سکتا ہے تو شاعر کیوں نہیں بن سکتا؟...

۱۹۴۱ء میں ناگپور کی تحصیل گونڈیا کے میونسپل ہائی اسکول میں بطور اردو ٹیچر ان کا تقرر ہو گیا۔ وہاں ہندی اور مرہٹی عام زبان تھی۔ اردو کلاسوں میں دو دو، چار چار سے زیادہ لڑکے نہیں

تھے۔ انہوں نے سوچا کہ مشاعرے کر کے دوسرے لڑکوں میں اردو کا ذوق پیدا کرنا لیکن گونڈیا میں شاعر بھی عنقا تھے۔ صرف ایک تھے اور وہ بھی استاد قسم کے۔ وہ مشاعروں کو کب خاطر میں لاتے تھے۔ آخر انہوں نے از خود شاعری شروع کر اور اسکول میں ایک مشاعرے کا اعلان کر دیا۔ بہت سی غزلیں اور ہزلیں لکھ کر طالب علموں میں بانٹ دیں۔ ان کے تخلص رکھے۔ اور ایک غزل اور ایک ہزل لئے رکھ لی۔

شہر کے لئے یہ بالکل نئی چیز تھی۔ ہندو اور مسلمان دونوں بڑی تعداد میں ہوئے اور اتنے محظوظ ہوئے کہ کئی آدمیوں نے شاعری شروع کر دی۔ دوسرے انہوں نے اپنے ایک دوست سبحان میاں سے تعاون سے گونڈیا جیسی جگہ آل ا کر ڈالا۔ اس کا نتیجہ ایک تو یہ ہوا کہ اسکول میں اردو پڑھنے والوں کی تعداد اور دوسرا یہ کہ عظیم عباسی سکہ بند شاعر بن گئے۔ ویسے عظیم عبدالکریم عباسی کا تحریک سے کوئی تعلق نہیں اس کے باوجود یوم مئی کے جلسوں میں بڑی خوشی سے ش ہوتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ یکم مئی کو پیدا ہوئے تھے اور سمجھتے ہیں کہ ساری د ان کی سالگرہ منائی جاتی ہے۔

اس سوال کے جواب میں کہ "آپ نے کس کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا ہے نے بتایا کہ میں شعر کہتے وقت دو زانو نہیں بیٹھتا اس لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوت اس زمانے کے اساتذہ مثلاً سائل دہلوی، جگر مرادآبادی، صفی لکھنوی، اصغر گو وغیرہ کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کی سعادت پائی ہے۔

ان کے شعر کہنے کے لئے دو شرطیں پوری ہونا لازمی ہیں۔ ایک یہ کہ پیٹ دوسری یہ کہ بھرا حقہ سامنے دھرا ہو۔ بعض لوگ گنگنا کر شعر کہتے ہیں۔ یہ گڑگڑا کر ک عادی ہیں۔ دوپہر اور رات کے کھانے یا پھر صبح اور شام کے ناشتہ کے بعد ان پر طاری ہوتی ہے۔ ہر ڈکار کے ساتھ ایک شعر اترتا ہے اور کھانا اگر دوسرے کے پیٹ بھر کھایا ہو یعنی اس سے پورا انصاف کیا ہو تو دو غزلہ، سہ غزلہ کہہ کر ہی اٹھتے ہیں۔

عظیم عباسی نے ابتدا میں ترنم سے پڑھنے کی مشق کی تھی۔ مگر ہوتا یہ تھا کہ جب یہ گھر پر ترنم کی پریکٹس کرتے تھے تو بیوی جا کر پڑوس میں بیٹھ جاتی تھیں تاکہ ہمسائے ان کی بیگناہی کے شاہد رہیں۔ آخر انہوں نے خود عبرت پکڑی اور پھر تحت اللفظ پڑھنے لگے۔ ان کی شادی کا قصہ بھی عجیب ہے۔ FIRST COME FIRST SERVED کے ایسے قائل تھے کہ جو پہلی لڑکی ہاتھ آئی اس سے شادی کر کے بیٹھ گئے۔ یہ حادثہ ۱۹۳۲ء میں ہوا۔ بچوں کی تعداد اس لئے نہیں بتاتے کہ فیملی پلاننگ کا محکمہ شرمائے گا۔

ایک زمانے میں کراچی میں بحث چلی تھی کہ فولاد کے کارخانے اور مکئی کے کھیت پر شاعری کرنا چاہیئے یا نہیں۔ اس مسئلے پر عظیم عباسی کی رائے ہے کہ فولاد کے کارخانے پر کہی جانے والی نظموں کے اشعار تو تھوڑے سے ہی ہو سکتے ہیں جو سننے والوں کے کانوں کے پردے پھاڑ دیں گے۔ رہے مکئی کے کھیت تو ابھی تو ابنائے آدم گندم ہی سے بدلہ لے رہے ہیں۔ جس نے انہیں جنت سے نکلوایا ہے۔ بعد میں مکئی کا نمبر ہے۔

ان کی شاعری زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ مشہور افسانہ نگار خاتون صدیقہ بیگم سیوہاروی اپنے بھائی کے ساتھ گونڈیا میں رہتی تھیں۔ ان سے بھی برادرانہ تعلق تھے لیکن چونکہ یہ مزاحیہ شاعری کرتے ہیں اس لئے ہر شخص ان سے مذاق کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔ غالباً ۴۵-۱۹۴۴ء کی بات ہے۔ ایک دن یہ ان کے ہاں گئے تو صدیقہ بیگم نے چائے پیش کی۔ انہوں نے سب بھائی بہنوں کو معنی خیز طور پر مسکراتے تو دیکھا مگر کچھ سمجھ نہ سکے۔ چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگائی تو پتہ چلا کہ تیز نمک کی چائے تھی۔ سب نے مل کر قہقہہ لگایا اور یہ خفیف ہو گئے۔ لیکن انہی دنوں ایک طرحی مشاعرہ ہونے والا تھا اور اس کے لئے ہزل کہی جا رہی تھی۔ انہوں نے وہیں طرح میں ایک شعر موزوں کر کے سنایا جس پہ مذاق کا پانسہ پلٹ گیا اور صدیقہ بیگم دوپٹے میں منہ چھپا کر کھسیانی ہنسی ہنستی ہوئی اندر بھاگ گئیں۔ شعر یہ تھا۔

سیکھے ہیں نئے انداز جفا کے چائے نمک کی دیتے ہیں
یعنی نمک اب زخم جگر تک یوں پہنچایا جاتا ہے

عظیم عباسی کو مطالعے کا بڑا شوق ہے ۔ ادبی اور تنقیدی کتابوں میں غرق رہتے ہیں
انہیں اپنے اشعار میں یہ شعر بہت پسند ہے ۔

ہو گئیں یوں تو سب بلائیں تمام
ایک شریک حیات باقی ہے

ویسے ان کی بیگم کو بھی یہ شعر بہت پسند ہے ۔ اور اپنے حسب حال سمجھ کر اکثر پڑھا کرتی ہیں ۔

استاد قمر جلالوی کا یہ شعر ان کا پسندیدہ ہے ۔

موسیٰ سے ضرور آج کوئی بات ہوئی ہے
جاتے میں قدم اور تھے آتے میں قدم اور

آج کل ٹکسالی اور سکہ بند اردو کا چلن جو ختم ہو رہا ہے سے عظیم عباسی مایوس نہیں ہیں ان کا کہنا ہے کہ زبان اپنا چولا بدلتی رہی رہتی ہے ۔ یہ ایک فطری عمل ہے جس سے مفر نہیں ۔
عظیم عباسی نے جبلپور کمشنری کے ضلع دموہ میں ۱۹۰۷ء میں جنم لیا ۔ والد غلام محی الدین پولیس میں تھے اور زیادہ تر باہر رہتے تھے ۔ اس لئے دادا خان بہادر حاجی قاضی علیم ا[illegible] کے سائے میں پرورش ہوئی ۔ وہ سندیلہ شریف کے حضرت وصی علی شاہ کے سجادے تھے ہزاروں آدمی ان کے مرید تھے گویا عظیم عباسی صاحب کے باپ تو ایک تھے لیکن چچا کی تعداد ہزاروں سے اوپر تھی ۔ ان کے دادا کا عرس آج بھی دموہ اور کراچی، دونوں جگہ ہے ۔ دادا اپنے سارے پوتوں کو اپنے کمرے میں سلاتے تھے اور علی الصبح اٹھا کر نماز پڑھاتے تھے ۔ عظیم عباسی نے ابتدائی تعلیم مختلف شہروں میں حاصل کی ۱۹۲۴ء میں انجمن اسلامیہ ہائی اسکول جبلپور سے میٹرک کیا ۔ کرسچین کالج الہ آباد سے انٹر اور الہ آباد یونیورسٹی سے ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۱ء میں بی اے ۔ اور ایم اے اردو میں کیا ۔ زمانہ طالب علمی میں ہاکی اور ٹینس کھیلتے تھے ۔ آج بھی قلم تھامنے کا انداز اسٹک پکڑنے جیسا ہے ۔ اور ایک ہی اسٹروک میں پوری غزل کہنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ بی اے کے پہلے سال میں ہی کانوں میں پرابلم ہو گئی ۔ اور اونچا سننے لگے ۔ اس سے آج تک فائدہ اٹھا رہے ہیں ۔ بیگم بڑبڑایا

ہیں اور ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ کہتے ہیں کہ "خدا کا شکر ہے کہ اس ثقلِ سماعت نے کسی اچھے عہدے پر فائز ہونے سے بچالیا۔ اس طرح آدمیت کے دائرے سے نہ نکلا، ورنہ آج آپ کے سامنے حاضر نہ ہوسکتا۔ تعلیم سے فارغ ہوکر آٹھ نو برس انجمن پریس جبلپور میں سپرنٹنڈنٹ رہے۔ پھر دوسری جنگ عظیم میں چند ماہ آرڈیننس ڈپو میں ملازم رہے۔ لیکن گوراشاہی انگریزی سے گھبرا کر ۱۹۴۱ء میں گونڈیا چلے گئے۔ فروری ۱۹۴۸ء میں وہاں سے بمبئی کے راستے ۱۸ فروری کو کراچی پہنچے۔ زمانہ طالب علمی میں ایک جیوتشی نے ہاتھ دیکھ کر بتایا تھا کہ بچہ سمندر پار کی یاترا تیرے بھوش میں ہے۔ یہ انگلینڈ جاکر اعلیٰ تعلیم پانے کے خواب دیکھتے رہے۔ آخر بمبئی سے کراچی سفر کرنے کے بعد جیوتشی جی کی بات سچی ثابت ہوئی۔ دو مہینے کراچی میں آوارہ گردی کرنے کے بعد حیدرآباد چلے گئے اور ۱۹۵۱ء میں چند دوستوں سے مل کر سٹی کالج قائم کیا جو سب کی بے لوث خدمت کی بنا پر آج سابق صوبہ سندھ کا ایک ممتاز تعلیمی ادارہ ہے یہ ۱۹۷۶ء تک اس ادارے سے وابستہ رہنے کے بعد ریٹائر ہوگئے۔ اب بس شعر کہتے ہیں بچوں پہ رعب جھاڑتے ہیں اور بیوی کی خدمت کرتے ہیں۔ عظیم عباسی مغربی لباس پہنتے ہیں۔

ان کا ایک مجموعہ زخم خنداں۔ ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا تھا۔ ویسے نثر بھی لکھتے ہیں۔ ابتدا میں کئی افسانے لکھے جو ہندوستان کے مختلف رسالوں میں شائع ہوئے۔ کئی ریڈیو ڈرامے لکھے جو دلی، لکھنؤ، بمبئی اور حیدرآباد سے نشر ہوئے۔ اردو زبان ادب کی تاریخ اور ایک ناول کے مسودے ہجر کے جھمیلوں میں ضائع ہوگئے۔ دو کتابوں کے ترجمے بھی کئے جو ۱۹۴۳ء میں فیروز سنز نے شائع کئے تھے۔

عظیم عباسی کو کھانے میں صرف دعوتیں پسند ہیں مگر شرط یہ ہے کہ وہ خود ان کے گھر پہ نہ ہوں۔ اپنی پوری کہانی انہوں نے ایک شعر میں سموکر گویا کوزے میں دریا بند کردیا ہے۔

یہ ہے مختصر داستان عظیم
کہ محفل میں پہنچا، پٹا، آگیا

عظیم عباسی

عکسِ فن

نہ وہ دیکھتے ہیں نہ ہم دیکھتے ہیں
حقیقت میں دونوں ہی کم دیکھتے ہیں

جوڑی کا اپنی اور تو کوئی نہیں عظیم
کشتی لڑیں گے جا کے خلیق الزماں سے ہم

ڈرتے تھے ان کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر
دل کو مگر سکون ملا دھار دیکھ کر

غیر پر وہ پگھل نہ جائے کہیں
کھوٹا سکہ ہے چل نہ جائے کہیں

نکلوا کر بھی جنت سے تعبداب تک نہیں کہ
یہ گندم سے کوئی پوچھے کہ اب اتنے گراں کیوں

ادھار مانگ کے لائے ہیں تیل مٹی کا
بجھا بجھا کے چراغِ وفا جلاتے ہیں

ممکن ہے اس کی بزم میں رونا پڑے مجھے
اب ساتھ لے کے جاؤں گا اک نوحہ گر کو میں

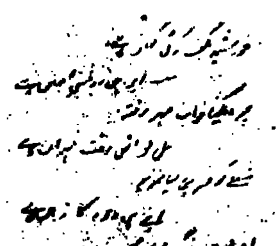
شوہر کی زباں اور ہے بیوی کی زباں اور
روکے کوئی اس کو تو وہ ہوتی ہے رواں اور

عبیداللہ علیم



چاند چہرہ ستارہ آنکھیں

پیدائش ۱۹۳۹ء



عبیداللہ علیم

میں نے پہلے پہل ایک مشاعرے میں سنا تھا۔

ہے سمٹتے ہوئے سائے کی صدا
اٹھ یہ دیوار بھی گر جائے گی

یہ شعر میری طرح جانے کتنے لوگوں نے سنا ہوگا۔ اور اس شعر سے جانے کتنے لوگ محظوظ ہوئے ہوں گے۔ لیکن اس شعر نے مجھے یہ یقین کرنے پر مجبور کر دیا کہ شاعر کی سوچ اور فکر سطحی نہیں ہے۔ اس میں شعور کی گہرائی اور خلوص فن موجود ہے۔

علیم کو یہ تو یاد ہے کہ وہ بھوپال میں پیدا ہوئے لیکن سنہ پیدائش مشکوک ہے کیونکہ اسکول کے رجسٹر میں ان کے بڑے بھائی کا سن پیدائش ۱۹۴۱ء درج ہے۔ جبکہ علیم کا سن پیدائش ۱۹۳۹ء لکھا ہوا ہے۔ ان کے والد سیالکوٹ سے بھوپال جاکر آباد ہوگئے تھے۔ چنانچہ اس اعتبار سے ان کی پدری زبان پنجابی ہے اور مادری زبان اردو علیم زبان کے سلسلے میں بقول خود والدہ سے متاثر ہیں۔

بچپن ہی سے اچھے شعر حفظ کرنے اور پڑھنے کا جنون تھا۔ دو تین غزلیں ۵۸ء میں کہیں۔ مگر باقاعدگی سے ۱۹۵۹ء سے شعر کہنا شروع کئے۔ اس وقت یہ کالج میں سال اول کے طالب علم تھے۔

"کلاسیکل شعراء میں آپ کن سے متاثر ہیں۔"

سخن ور (تذکرۂ شعراء)

عبید اللہ علیم

"میرے اس سوال پر کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر بولے۔

"یہ سوال ایسا ہی ہے جیسے آپ پوچھیں کہ آپ اپنے خاندان میں کس کس سے متاثر ہیں۔ اگر جواب دوں کہ کسی سے نہیں تو عجیب ناخلفی کا احساس ہوتا ہے۔ اگر کہوں کہ امی سے اور ماموں سے تو بہر حال اور لوگوں کے رشتے بھی برقرار رہتے ہیں۔ کیونکہ یہ رشتے شعوری طور پہ توڑنے سے نہیں ٹوٹتے۔ یہی حال کلاسیکل شعراء کا ہے، میرؔ، غالبؔ، یگانہؔ اور فراقؔ میرے پسندیدہ شعراء ہیں اور باقی تمام کا بھی احسان مند ہوں کہ انہوں نے کسی نہ کسی رشتے سے مجھے کچھ نہ کچھ ضرور دیا ہے"

"چلئے یہ تو ہوئی کلاسیکل شعراء کی بات۔ آج کے شعراء میں آپ کن سے متاثر ہیں؟"

"جس شاعر نے دو چار شعر بھی اچھے کہے ہوں۔ میں اس کا احترام خود پہ تصور کرتا ہوں۔ یوں سمجھئے کہ اچھا شعر میرا مشغلہ ہے کوئی بھی لکھے کہیں بھی لکھے اس سے بحث نہیں"۔

"لیکن اس طرح تو فہرست خاصی طویل ہو جاتی ہے"

ہنس کر جواب دیا "اچھا تو آپ سلسلہ مرتب کریں لیکن ان شعراء کی جو میرے دائرۂ تحسین میں سرفہرست ہیں۔ مثلاً اختر الایمانؔ، عزیز حامدؔ مدنی، فیض احمد فیضؔ، ناصر کاظمیؔ، اطہر نفیسؔ، ساچغتائیؔ، جون ایلیاؔ اور احمد ہمدانیؔ، ان سب کا اپنا اپنا منفرد انداز ہے۔ اور میرے خیال میں اردو کی نئی شاعری ان شعراء کے اسالیب سے باہر نہیں ہے"۔

"نئی شاعری کا تذکرہ چلا ہے تو کچھ جدید شاعری کے بارے میں بھی اظہار خیال فرمائیں"۔

"برجستہ بولے، جدید شاعری کے بارے میں نیک خیال ہے"۔

"لیکن اتنے مختصر سے اظہار خیال سے کام نہیں چلے گا"۔

"پھر مجھے عرض کرنے دیں کہ بنیادی طور پہ یہ سوال آپ کو کسی نقاد سے کرنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ عام طور پر نقاد حضرات اس موضوع پہ اظہار خیال کر کے خوش ہوتے ہیں۔ ویسے میرے خیال میں "جدید" کی اصطلاح کو اس عہد نے اپنے احساس کمتری کے باعث جنم دیا ہے شاعری اگر شاعری ہی ہو تو ہمیشہ جدید رہتی ہے اور اگر نہ ہو تو وہ اس لمحے میں بھی قدیم ہوتی ہے جس میں وہ جنم لیتی ہے۔ ہر عہد فن کار کے لئے کسی نہ کسی محرومی کو اپنے ساتھ لاتا ہے۔ فن کار اس محرومی کو کس طرح برتتا ہے اور ذات اور کائنات کے رشتوں میں کیا معنی اور کیا وسعتیں

سخن ور (تذکرہ شعراء) عبید اللہ علیم

پیدا کرتا ہے یہ دیکھنے کی بات ہے ۔ شاعری کی ذات جتنی پیچیدہ و پہ کاری ہوتی ہے ۔ شاعری اتنی ہی تیکھی اور گہری ہوتی ہے ۔ شخصیت کے اعتبار سے میر صاحب کی مثال موجود ہے اور اگر شاعر ذات کا سیدھا سادا اور سپاٹ ہو تو شاعری محض شعوری عمل ہو کر رہ جاتی ہے ریاضت اور مشقت کے پسینے چھوٹتے تو نظر آتے ہیں ۔ شاعری نظر نہیں آتی ۔ قدما میں اگر مثال چاہیئے تو ناسخ موجود ہیں ۔ آج کے شعراء میں مثال کے طور پر بہت مل جائیں گے ۔ کوئی نیا رسالہ اٹھا لیجئے کسی نظم یا غزل پر اچانک ہنسی آجائے گی ۔ تو سمجھ لیجئے شاعر بہت زیادہ ہی جدید ہے ۔ اس عہد میں "جدید" کے معنی جہاں نئے اور تازہ ہیں وہاں مہمل کے بھی ہیں ۔ میرا تعلق شعراء کی اس نسل سے نہیں جو پہلے اور بعد محض تجربہ ہی تجربہ ہے ۔ بلکہ اس نسل سے ہے جو شاعری کی پیدائش کے بعد تجربہ ہیئت اور اسلوب کے بارے میں سوچتی ہے ۔"

وہ چپ ہو گئے تو میں نے پوچھا ۔

"آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ سخت داخلیت پسند شاعر ہیں ۔"

"علیم سنجیدہ ہو کر بولے ۔" یہی بات کچھ میرے بارے میں سچی مشہور ہے ۔ سو مجھے اس سے انکار نہیں ہے ۔ بعض لوگ اس داخلیت کے معنی غلط طور پر محض ذات پسندی کے نکال کر پریشان ہوتے ہیں ۔ میں نفس کی اس منزل کو داخلیت سے تعبیر کرتا ہوں جہاں ذات و کائنات کی دوئی مٹ جائے ۔ گویا نفس ذات نفس کائنات ہو جائے ۔ اس صورت میں کوئی شے خارج میں ظہور نہیں کرتی ۔ بلکہ نفس ذات میں جلوہ گر ہوتی ہے ۔ اور نفس کے اس عالم میں جو شاعری جنم لیتی ہے وہ از خود روح عنصر سے ہم آہنگ ہوتی ہے ۔"

"آپ شاعری میں کس نظریئے کے قائل ہیں ۔"

کتاب ہاتھ سے رکھ کر انہوں نے کہا ۔

"کسی نظریئے کا نہیں ۔ مظہر کا قائل ہوں روح ذات سے روح کائنات جس طرح ظاہر ہو جائے ۔ ویسے بھی میرا خیال ہے کہ نظریوں سے شاعری کم ہی پیدا ہوتی ہے شاعری سے نظریات ضرور تراشے گئے ہیں اگر شاعری کا کسی نظریئے کے لئے ہو تو یہ بہتر ہے کہ آدمی کسی پرائمری اسکول میں حساب پڑھانے کا کام شروع کر دے لیکن کوئی نظریہ اگر

روح ذات بن جائے تو الگ بات ہے۔"

"اپنی زندگی کا کوئی اہم واقعہ سنایئے۔"

"بات سن کر حسب عادت مسکرائے کچھ دیر خاموش رہے پھر کہا۔

"میں اس دور میں حوصلہ ہارے بغیر زندہ ہوں کیا یہ واقعہ اہم نہیں؟ میں حالات چاہے وہ ساز گار ہوں یا ناساز گار انہیں خود پہ چھا جانے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ ان پہ خود چھا جاتا ہوں اسی لئے میں نے کبھی روحانی تنہائی محسوس نہیں کی۔ اگر کبھی کوئی مجھ سے پوچھے کہ خدا کا احساس مجسم کس صورت میں آئے گا تو میں صرف ایک لفظ کہوں گا۔ 'عورت' عورت جو بیوی بھی ہے، ماں ہے، بہن ہے۔ دوست ہے اور محبوبہ بھی۔ مجھے کائنات کا تمام حسن عورت کے وجود میں سمٹا نظر آتا ہے۔ کیونکہ عورت اور مرد۔ دو انسان وہ خالق ہیں جو ایک انسان کی تخلیق کرتے ہیں۔ میں مرد ہوں اس لئے مرد سے مجھے عشق نہیں ہو سکتا۔ لیکن عورت سے عشق میری ذات کی اور میری شاعری کی تکمیل ہے۔ بغیر عشق کے میری آنکھیں، میرا چہرہ، میری روح اور میرا خیال سب نامکمل ہیں۔"

عبیداللہ علیم نے اردو میں ایم اے کیا ہے۔ گیارہ سال تک کراچی ٹیلیویژن میں پروگرام پروڈیوسر تک وابستہ رہے۔ بقول خود "گیارہ سال کی قید با مشقت کے بعد آزاد ہوا ہوں۔" اب اپنا ماہنامہ "نئی نسلیں" شائع کر رہے ہیں جس کے کئی شمارے آچکے ہیں۔

علیم کی نظموں غزلوں کا پہلا مجموعہ "چاند چہرہ ستارہ آنکھیں" ۱۹۷۴ء میں شائع ہو چکا ہے اور اس سال کا آدم جی ادبی انعام بھی حاصل کر چکا ہے۔ دوسرا مجموعہ "ویران سرائے کا دیا" زیر اشاعت ہے۔ میں نے کہا اپنا کوئی پسندیدہ شعر سنایئے۔ تو بولے اپنی پوری شاعری ہی مجھے پسند ہے۔ ورنہ شعر ہی نہ کہتا۔ اور رہا کسی اور کا پسندیدہ شعر تو مجھے دوسروں کے پچیس ہزار اشعار یاد ہیں اور سب پسند ہیں۔ کون سا سناؤں؟ ہاں اس لمحے، میر تقی میر کا جو شعر یاد آ رہا ہے اور اکثر یاد آتا ہے وہ سناتا ہوں۔

ؔ یہ تو اہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

عبیداللہ علیم

عکسِ فن

پگھل رہے ہیں جہاں لوگ شعلۂ جاں سے
شریک میں بھی اسی محفلِ ہنر میں ہوں

وہ ساتھ تھا تو خدا بھی تھا مہرباں کیا کیا
بچھڑ گیا تو ہوئی ہیں عداوتیں کیسی

آپ بھی کیسے شہر میں آکر شاعر کہلائے ہیں علیم
درد جہاں کمیاب بہت ہے نغموں کی ارزانی ہے

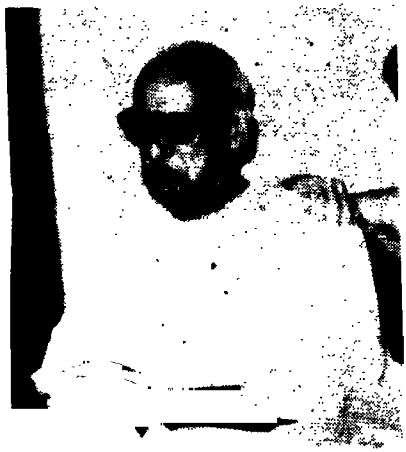
یہ دورِ بے ہنراں ہے، بچا رکھو خود کو
یہاں صداقتیں کیسی، کرامتیں کیسی

اک متاعِ دل و جاں پاس تھی، سو ہار چکے
ہائے یہ وقت کہ اب خود پہ گراں ہیں ہم لوگ

کہاں تک اور بھلا جاں کا ہم زیاں کرتے
بچھڑ گیا ہے تو یہ اس کی مہربانی ہوئی

عندلیب شادانی

نشاطِ رفتہ



پیدائش ۱۹۱۴ء
وفات ۱۹۶۹ء

دیر لگی آنے میں تم کو شکر ہے پھر بھی آئے تو
آس نے دل کا ساتھ نہ چھوڑا ویسے ہم گھبرائے تو

کیوں یہ مہر انگیز تبسم مدِ نظر جب کچھ بھی نہیں
ہائے کوئی انجان اگر اس دھوکے میں آ جائے تو

رسوائی کے ڈر سے کوئی رازِ محبت چھپتا ہے
[illegible] آ بیٹھے ہیں روکیں آنسو دل کے تھکے گر ڈھلکائے تو

جھوٹ ہے سب، تاریخ ہمیشہ اپنے کو دہراتی ہے
اچھا میرا خوابِ جوانی تھوڑا سا دہرائے تو

عندلیب شادانی
۱۰ اکتوبر ۱۹۶۲ء

عندلیب شادانی

مولانا احسن مارہروی مرحوم علیگڈھ ضلع میں ایک نواب صاحب کے یہاں مقیم تھے۔ قصبے میں کوئی طرحی مشاعرہ ہونے والا تھا۔ اس کی تیاریاں تھیں۔ نواب صاحب خود بھی شاعر تھے۔ طے یہ پایا کہ دوپہر کے کھانے کے بعد اپنے اپنے کمرے میں لیٹ کر شعر کہے جائیں گے۔ سہپہر کی چائے پر جب سب اکٹھے ہوئے تو نواب صاحب نے پوچھا کہیئے مولانا۔ کتنے شعر ہو گئے؟ اس پر مولانا نے جواب دیا۔

"ڈیڑھ شعر ہوا ہے۔"

نواب صاحب نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

"ہم نے تو بیس شعر کہہ ڈالے۔"

مولانا کو غصہ آگیا۔ بولے۔

"طبیعت کی موزونیت کا امتحان لینا ہو تو نوکروں کو حکم دیجیے کہ وہ ہم دونوں کو باندھ کر پیڑ پہ الٹا لٹکا دیں اور دونوں کے سر پر تڑاتڑ جوتے پڑتے رہیں۔ اس وقت دیکھیں کس کی طبیعت حاضر رہتی ہے اور کون زیادہ شعر کہتا ہے۔"

واقعی طبیعت کی موزونیت اور حاضر دماغی کا اندازہ شعروں کی تعداد سے نہیں بلکہ اس سے لگانا چاہیئے کہ ضرورت پڑنے پر کس نے فوری طور پر کس پائے کا شعر کہا ہے اس اعتبار سے ہندوپاک میں ڈاکٹر عندلیب شادانی ایک منفرد مقام کے مالک تھے۔

کراچی میں ایک نشست تھی ۔ صدارت اے ۔ ڈی ۔ اظہر کر رہے تھے ۔ انہوں نے کہا ۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ پہلے پڑھنے کو کس سے کہوں ۔ لہذا میں خود ہی پہلے پڑھ دیتا ہوں" عندلیبؔ شادانی نے انہیں روکا اور فی البدیہہ دو قطعہ بند شعر پڑھ دیئے ۔

کوئی پہلے پڑھے شعر یا بعد میں
پست ہو تو بلندی پہ چڑھتا نہیں
جس کا جو مرتبہ ہے رہے گا وہی
کوئی گھٹتا نہیں کوئی بڑھتا نہیں

عندلیب شادانی ۱۹۰۴ء میں سنبھل ضلع مراد آباد یو۔ پی میں پیدا ہوئے ۔ وجاہت حسین نام رکھا گیا یہ بچہ غیر معمولی ذہین تھا ۔ اگرچہ گھر میں سب پڑھے لکھے تھے لیکن کوئی شاعر نہ تھا ۔ اس کے باوجود آپ کی موزونیتِ طبع کا یہ عالم تھا کہ قصبے میں کوئی مشاعرہ ہوا ، دوستوں کی دیکھا دیکھی ۔ انہوں نے بھی شعر کہے اور ڈرتے ڈرتے مشاعرے میں غزل پڑھی ۔ پہلی ہی غزل پر بہت سی داد ملی ۔ اس وقت ان کی عمر صرف گیارہ سال تھی ۔ اس روز انہیں اور دوسروں سب کو معلوم ہو گیا کہ یہ بچہ شاعر بننے کے لئے ہی پیدا ہوا ہے ۔

۱۹۲۳ء میں تعلیم کی غرض سے انہیں لاہور بھیجا گیا ۔ وہاں مولانا تاجور نجیب آبادی کا طوطی بول رہا تھا اور ان کے دم قدم کی برکت سے شہر میں گلی گلی انجمنیں قائم تھیں ۔ یہ دوستوں کے ساتھ ان میں شرکت کیا کرتے اور اگلے ہی سال یعنی ۱۹۲۴ء سے باقاعدہ شاعری شروع کر دی ۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس مشہور غزل گو شاعر نے اپنی شاعری کا آغاز نظم سے کیا ۔ ۲۹ ر جنوری ۱۹۲۴ء کو دیال سنگھ کالج کی بزم ادب کے مشاعرے میں 'تصویر بہار' کے عنوان سے نظم پڑھی ۔ اور مشاعرہ لوٹ لیا ۔ اس کے بعد 'شالامار' کے عنوان سے ایک اور نظم کہی ۔ یہ بھی بڑی مقبول ثابت ہوئی ۔

۲۵ ر مئی ۱۹۲۵ء کو ان کی زندگی میں ایک اہم واقعہ ہوا جس کا اتا پتہ بتانے میں انہیں تامل ہے ۔ بہر حال ہم سوچ سکتے ہیں کہ وہ کس نوعیت کا واقعہ ہوگا کہ اس دن انہوں نے ایک غزل کہی اور بقول ان کے یہی دن ان کی شعری زندگی کے آغاز کا ہے ۔ یعنی

اپنی کیفیات میں ڈوب کر شعر کہنا اسی روز شروع کیا ۔ کسی کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی ۔ خداداد صلاحیت پر مطالعے کے شوق نے جلا کی اور ان کا فن دن دونی رات چوگنی رفتار سے نکھرتا چلا گیا۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی کی زندگی کے دو دور ہیں ۔ پہلا جنوری ۱۹۲۴ء سے اگست ۱۹۲۹ء تک جب انہوں نے بہت لکھا ۔ اور دوسرا جولائی ۱۹۳۴ء سے ۔ گویا پانچ برس وہ خاموش رہے اس دوران البتہ لندن میں ایک خاص واقعہ سے متاثر ہو کر ایک نظم "سینوریتا" کہی تھی ۔ یہ اسپینی زبان کا لفظ ہے جو دوشیزہ کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔

پانچ برس کی معنی خیز خاموشی کے بعد جولائی ۱۹۳۴ء میں اچانک احساس نے انگڑائی لی اور اس کا نتیجہ وہ معرکتہ الآرا غزل ہے جو ہندوپاک میں ہر پڑھے لکھے شخص کی زبان پر ہے ۔ اس کا ایک شعر ہے ۔

گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں
ان ہی کی یاد میری زندگی ہے

عندلیب شادانی کی پہلی شادی ۸ ، فروری ۱۹۴۰ء میں ہوئی پہلی بیوی کے انتقال کے پانچ برس بعد دوسری شادی الہ آباد میں کی ۔

آپ کی شاعری کے موثر ہونے کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ آپ نے ایک شعر بھی ایسا نہیں کہا ۔ جس پر آپ بیتی ہونے کا اطلاق نہ ہو سکے ، ہر شعر اپنے حسب حال کہا اور جذبات میں ڈوب کر کہا ۔

۱۹۲۵ء میں لاہور میں ایم اے کرنے کے بعد آپ حکومت کی جانب سے دہلی کے قریب ایک چھوٹی سی ریاست دوجانہ کے پرنس اقتدار علی خاں کے اتالیق مقرر کرکے بھیج دیئے گئے اس کے بعد ہندو کالج دہلی میں اردو فارسی کے پروفیسر رہے ۸ ، جنوری ۱۹۲۸ء کو آپ ڈھاکہ یونیورسٹی میں لکچرر ہو گئے اور عرصہ تک وہیں پروفیسر اور اردو فارسی شعبے کے سربراہ کی حیثیت سے کام کرتے رہے ۔

کسی زمانے میں آپ نے افسانے بھی لکھے اور ان کا ایک مجموعہ "سچی کہانیاں" کے

عنوان سے شائع ہوا۔ ۱۹۵۱ء میں "نشاطِ رفتہ" کے عنوان سے کلام کا مجموعہ شائع ہوا۔ ایک کتاب "تحقیق کی روشنی میں" پر داؤد ادبی انعام مل چکا ہے۔ اس سے پہلے تحقیقات دور حاضر اور نزل گوئی، نوش و نیش، اور جھوٹا خدا وغیرہ نامی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے علاوہ فارسی کی کئی کتابوں مثلاً انشاء ابو الفضل، چہار مقالہ وغیرہ کا ترجمہ کیا۔ رباعیات بابا طاہر کی شرح لکھی، جدید فارسی بول چال کی ایک لغت تیار کر چکے ہیں۔ ایک کتاب انگریزی میں لکھی ہے جس کا عنوان ہے " جدید فارسی زبان پر فرانسیسی کے اثرات "۔

ڈاکٹریٹ کے لئے آپ کے مقالے کا موضوع تھا "ہندوستان کے مسلم مورخین"۔ عندلیب شادانی نے ۱۹۶۵ء کے بعد سے بہت کم لکھا۔ سال میں ایک آدھ بار جب آپ کی قیام گاہ پر ہی مشاعرہ ہوتا تھا۔ تو نئی غزل کہہ لیتے تھے۔

ہندوستان کے صوبہ بہار میں ایک پروفیسر ہیں، شاہ عطاء الرحمٰن کاکوی۔ انہوں نے عندلیب شادانی پر ایک مضمون لکھا جس کا عنوان ہے ماہتابی شاعر۔ اس عنوان کی توجیہہ انہوں نے یہ کی کہ ان کی تقریباً ہر غزل میں چاند کا لفظ موجود ہے، مزے کی بات یہ ہے کہ اس وقت تک خود انہیں اس کا احساس نہ تھا۔

عندلیب شادانی کو مطالعہ کی جیسی دھن طالب علمی کے زمانہ میں تھی ویسی ہی آخری عمر تک رہی۔ کلیاتِ میر کئی مرتبہ پڑھ چکے تھے۔ لطف کی بات یہ کہ خشک اور بے مزہ کتابیں بھی وہ بڑے انہماک سے پڑھ لیتے تھے۔

شاگرد بنانے سے دلچسپی نہیں تھی لیکن پھر بھی بہت سے شاگرد تھے۔ شاہد احمد دہلوی بھی آپ ہی کے شاگرد تھے۔

ڈاکٹر صاحب سے جب میں نے ان کی مرغوب غذا کے بارے میں پوچھا تھا تو انہوں نے ایک لطیفہ سنا دیا۔ کہنے لگے۔

" نواب محسن الملک نے حیدرآباد سے سرسید کو خط لکھا کہ کوئی اچھا سا باورچی بھیج دو۔ سرسید نے دلی سے ایک باورچی بھیج دیا۔ محسن الملک نے پوچھا۔

" کیا کیا پکانا جانتے ہو؟"

"حضور قورمہ چپاتی"
"کچھ اور بھی پکانا جانتے ہو؟"
"بس حضور قورمہ چپاتی"

نواب صاحب نے بڑی حیرت سے پوچھا کہ کیا تمہیں اور کچھ پکانا آتا ہی نہیں؟ اس پر باورچی نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"حضور بھلے آدمیوں کا کھانا تو قورمہ چپاتی ہی ہے باقی تو امیرزادوں کے چونچلے ہیں۔ ویسے میں آپ کی دعا سے سب کچھ پکالیتا ہوں"

یہ لطیفہ سنانے سے ان کا مقصد یہ بتانا تھا کہ ان کی پسندیدہ غذا بھی قورمہ چپاتی ہی ہے۔ کیونکہ قورمہ چپاتی کھا کر ان کا وزن ۱۲۶ پونڈ رہتا تھا۔ حالانکہ ولایت میں قیام کے دوران ۱۳۶ پونڈ تھا۔ قورمے چپاتی نے دس پونڈ وزن گھٹا دیا۔

عندلیب شادانی کو اپنا یہ شعر بے حد پسند تھا۔

اس نے بھیجا ہے مجھے میری محبت کا خراج
جابجا خط میں ستارے سے نظر آتے ہیں

اور یہ شعر نہ صرف انہیں بلکہ ان کے مداحوں کو بھی بے حد پسند ہے۔ اس شعر کے لئے ڈاکٹر صاحب کہتے تھے کہ سائنٹفک شعر ہے۔

جھوٹ ہے سب تاریخ اپنے کو دہراتی ہے
اچھا میرا خوابِ جوانی تھوڑا سا دہرائے تو

عندلیب شادانی ترنم سے پڑھتے تھے اور مشاعرہ پر چھا جاتے تھے۔ ۶۵ سال کی عمر میں یعنی ۲۹ جولائی ۱۹۶۹ء کو وہ یہ دارِ فانی ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئے۔

عندلیب شادانی

عکسِ فن

کب تک کوئی دل کا خون کرے اچھا ہی کیا تم بھول گئے
اس یاد میں رکھا ہی کیا تھا کچھ آہیں تھیں کچھ آنسو تھے

چوٹ پڑی ہے دل پر تو آہ لبوں تک آئی ہے
یونہی چھن سے بول اٹھنا شیشے کا دستور نہیں!

اک ناتمام خواب مکمّل نہ ہو سکا
آنے کو زندگی میں بہت انقلاب آئے

اپنی بربادی کا تنہا ایک ہی کو رنج نہیں
اپنے کئے پر وہ بھی تھوڑا سا پچھتائے تو

تم نے اپنا نام کیوں لکھا نہیں تصویر پر
میں نے اس پر لکھ دیا حُسنِ ازل کا اقتباس

تصویر میں نے مانگی تھی شوخی تو دیکھئے
اک پھول اس نے بھیج دیا ہے گلاب کا

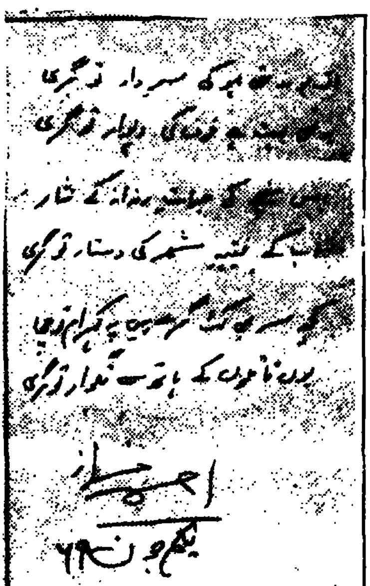
میری رودادِ محبت آہ جیسے کوئی پھول شاخ میں پھوٹا، کلی بن کر کھلا، مرجھا گیا

احمد فراز



درد آشوب
تنہا تنہا
شب خون
نایافت
جاناں جاناں

پیدائش ۱۹۳۱ء



[illegible] ہو کہ سردار تو گری
[illegible] زندگی دیوار تو گری
[illegible] کے شعار
اب کے [illegible] شہر کی دستار تو گری
[illegible] پہ کہرام تو رہا
پر دوستوں کے ہاتھ سے تلوار تو گری

احمد فراز
یکم جون ۶۹

احمد فرازؔ

"احمد فرازؔ کی شاعری اردو میں ایک نئی اور انفرادی آواز کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے سوچنے کا انداز نہایت حساس اور پُرخلوص ہے۔ ان کی شاعری کو صرف کلاسیکی یا صرف رومانی شاعری نہیں کہا جا سکتا بلکہ دورِ حاضر کے لطیف ذہنی ردِعمل کا سچا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ ان کا کلام اردو شاعری کے نئے موڑ کے کئی نازک زاویوں کی لچک اور تھرتھراہٹیں اپنے اندر رکھتا ہے۔"

یہ اقتباس فراقؔ گورکھپوری کی اس رائے سے ہے جو فرازؔ کے شعری مجموعے "دردِ آشوب" میں موجود ہے۔

فرازؔ واقعیُ حساس بھی ہے اور پرخلوص بھی۔ لیکن شاعرانہ لاابالی پن سے بھی اس کی شخصیت مبرا نہیں۔ میری یہ رائے اس پہلی ملاقات کا نتیجہ نہیں جو لاہور کے ایک مشاعرے میں ۱۹۶۸ء میں فرازؔ سے ہوئی تھی۔ اس کالم کے لئے لاہور میں تقریباً سال بھر قبل میں نے فرازؔ صاحب کو سوالنامہ دیا تھا۔ جس کا جواب موصول نہ ہوا لیکن ان کے پڑھنے والوں کے استفسارانہ خطوط موصول ہوتے رہے۔ کسی ایک خط کے جواب میں میں نے لکھا تھا کہ فرازؔ صاحب نے سوالنامے کا جواب اب تک نہیں بھیجا۔ گورنمنٹ کالج پشاور کی ایک طالبہ عصمت آغا نے اس بات کو خصوصی طور پر محسوس کیا اور مجھ سے فراز صاحب کا تعارف حاصل کرنے کی اجازت چاہی مجھے بھلا کیا اعتراض ہوتا۔ عصمت آغا نے اپنے والدِ محترم کے ذریعے ان سے رابطہ قائم

کیا لیکن دو ملاقاتوں میں بھی یہ تعارف مکمل نہ ہو سکا۔ اسی دوران فراز ایک مشاعرے کے سلسلے میں کراچی آئے۔ اب رہائی کہاں ممکن تھی۔ حد درجہ مصروفیت کے باوجود بہر حال انہوں نے وقت نکال ہی لیا اور یوں یہ تعارف پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس سلسلے میں بہر حال مجھے عصمت صا اور فراز صاحب دونوں کا مشکور ہونا چاہیئے کہ دونوں کے تعاون سے اس فرض کی ادائگی ہو

فراز ۱۲ دسمبر ۱۹۳۱ء کو نوشہرہ میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن کوہاٹ ہے لیکن زندگی بیشتر حصہ پشاور میں گزارا۔ اور عرصہ تک پشاور یونیورسٹی میں اردو زبان و ادب کے پیچار ذمہ داری سنبھالتے ہوئے تھے۔

فراز کی شاعری بھی ایک دلچسپ حادثہ کا نتیجہ ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے، جب فرا دسویں جماعت کے طالب علم تھے۔ پشاور میں کپڑوں کی سیل تھی انگلش کپڑا ان دنوں بڑے مہنگا تھا۔ فراز کے والد اپنے بڑے بیٹے کے لئے ایک سوٹ کا انگلش کپڑا خرید لاتے اور ان کے لئے کشمیرہ جو ان دنوں عام تھا۔ فراز کی حساس طبیعت یہ امتیاز برداشت نہ کر سکی۔ چنانچہ انہوں نے بقول خود یہ شعر گڑھ کر اس کپڑے کے ساتھ نتھی کر کے وا صاحب کے سرہانے رکھ دیا ہے

جب کہ سب کے واسطے لائے ہیں کپڑے سیل سے
لائے ہیں میرے لئے قیدی کا کمبل جیل سے

یہ شعر نہیں ایک چنگاری تھی جو ننھے ذہن میں سلگ اٹھی تھی پھر قدم قدم پہ طبقا امتیاز سامنے آتے رہے اور چنگاری شعلہ بنتی گئی۔ جذبات و حالات کی تلخی نے احسا کو اس بری طرح جھنجھوڑا کہ اس دور کی ان کی پوری شاعری ایک مکمل چیخ ایک فغاں ا ایک فریاد بن کر اردو ادب کے ایوانوں میں گونجتی پھری۔

امیر شہر فقیروں کو لوٹ لیتا ہے
کبھی بہ حیلۂ مذہب کبھی بنام وفا

فراز کی زندگی ایک جہد مسلسل ہے۔ اس کا عکس ان کی شاعری میں قدم قدم پہ ملتا ۱۹۵۱ء میں تلاش معاش انہیں کراچی لے آئی۔ ان دنوں کراچی ریڈیو سے چراغ حسن حسرت

مرحوم نے قومی پروگرام شروع کیا تھا۔ اس پروگرام کے لئے ہر علاقے سے ایک ایک نمائندہ لیا گیا تھا۔ سرحد کی نمائندگی احمد فراز نے کی تھی۔ یہ پروگرام سال بھر سے زیادہ نہ چل سکا۔ چنانچہ فنکاروں کی چھٹی کر دی گئی۔ فراز پھر پشاور آ گئے، تعلیم از سرِ نو شروع کی اور غالباً ۱۹۵۴ء میں بی اے کیا، پھر پشاور ریڈیو میں پروگرام پروڈیوسر ہو گئے۔ اس کے بعد اردو اور فارسی میں ایم اے کیا اور پشاور یونیورسٹی سے والد کے ریٹائرڈ ہونے کے بعد خود پشاور یونیورسٹی سے منسلک ہو گئے۔

آپ کے خاندان میں آپ کے علاوہ بھی کسی نے شعر و سخن میں دلچسپی لی یا تنہا آپ کی . . .
میری بات کاٹ کر وہ ہنس کر بولے۔

"ایک بھائی نے شاعری شروع کی تھی وہ سپاہی بن گئے اور میں جو اس دنیا سے بے تعلق رہا یہ تہمت میرے ہی سر آئی۔"

لطف کی بات یہ ہے کہ فراز کی مادری زبان پشتو ہے۔ لیکن ان کے شعر کی زبان اردو ہے، اس کی وجہ بتاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "میرے والد صاحب سید محمد شاہ برق کوہاٹی (آغا برق) نے بھی اردو اور فارسی میں شعر کہے میں بھی انہی کے نقش قدم پر چلا۔ میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ گو ان کا مجموعہ کلام چند دشواریوں کے سبب شائع نہ ہو سکا لیکن ان کے فارسی کلام کا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ میں جب بی اے کا طالب علم تھا۔ ان دنوں میرا مجموعۂ کلام "تنہا تنہا" شائع ہو چکا تھا۔ انہی دنوں والد صاحب کی غزل کا ایک پرزہ مجھے کہیں سے مل گیا۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ کسی وقت بیٹھ کر یہ کلام محفوظ کر لیں لیکن جیسا کہ بزرگوں کا شیوہ ہے کہ بچوں کو فروتر سمجھتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ "تم غلط نقل کرو گے۔ یہ کام میں خود انجام دوں گا۔ لیکن جب تدریسی مصروفیات تھیں اور اب زمینداری کی۔ چنانچہ مجموعۂ کلام مرتب کرنے کی نوبت نہ آئی۔ اور پھر بھی ایک ادیب یا شاعر کے لئے اپنی کتاب چھاپنا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔"

یہ مسئلہ اپنی جگہ نہایت اہم ہے۔ چنانچہ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فراز صاحب نے بتایا کہ یہ پبلشرز کے بنائے ہوئے چند طریقے ہیں کہ ادیب یا شاعر کو کبھی اس کا موقع

نہ ملے کہ وہ منافع حاصل کرے۔ ہمارے ملک کے بعض مسائل ایسے ہیں جن پر آج تک کسی کو غور کرنے کی فرصت نہیں ملی جبکہ ثقافت اور ادب ہمارا قومی ورثہ ہیں۔ اس ضمن میں حکومت پر بھی کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ ہمارے ملک میں ادیبوں کی ایک دو انجمنیں ہیں۔ رائٹرز گلڈ نے محنت اور جدوجہد کر کے آدم جی سے لے کر نیشنل بنک تک کئی انعامات کے ذریعہ فن کاروں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اسی طرح خلوص اور سنجیدگی سے کوئی کام شروع کیا جائے تو مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ ورنہ فی الوقت تو صورتحال یہ ہے کہ وہ ادیب جو صرف اپنے اثر و رسوخ سے چھپ چھپا گئے لیکن جنہوں نے فن کے لئے محنت نہیں کی اُن کا نام تو تاریخ میں کسی طرح آجاتا ہے۔ برعکس اس ادیب کے جس نے سالہا سال محنت کی اور محض ہماری بے توجہی کا شکار ہو کر رہ گیا۔ مثال کے طور پر داغ کے شاگردوں میں محمد عمر قضا بھی تھے۔ نہایت ہونہار اور قابل۔ داغ کا رنگ جس کامیابی سے ان کے ہاں ملتا ہے اور شاگردوں کے ہاں نہیں ملتا۔ ان کی زندگی کے آخری ایام پشاور میں گزرے۔ انتقال ہوئے سولہ سال سے زیادہ عرصہ گزرا لیکن ہم میں سے کتنے ہیں جو ان کا نام جانتے ہیں۔ کتنی ادبی انجمنیں ہیں جنہوں نے ان کے کلام کو محفوظ کرنے کی طرف توجہ دی ہے۔ صرف یہی نہیں ہم اپنی نئی نسل کو جس طرح تعلیم دے رہے ہیں وہ طریقہ بھی سم قاتل سے کم نہیں۔ ہمارے نصاب میں اس قدر کمزوریاں ہیں کہ طالب علم اپنے ادب اور اپنی زبان کے مطالعے سے خوف کھاتا ہے۔ حالانکہ "ادب" سے زیادہ دلچسپ شے پڑھنے کے لئے کوئی نہیں لیکن ہمارے بچے اس سے بھاگتے ہیں۔ کامک اور درآمدی گھٹیا ادب البتہ فروغ پا رہا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم خوشامد پسند اور خوشامد پرست ہیں۔ زہر کو زہر سمجھ کر بھی ہم اسے امرت کہہ کر نہ صرف خود کو دھوکہ دیتے ہیں بلکہ یہ زہر اپنے ہاتھوں اپنی نسل کے رگ و پے میں بھی سرایت کر رہے ہیں۔ کالج اور یونیورسٹی کے نصاب کے علاوہ مختلف طریقے سے پرانے سیاست دانوں کا ذکر کچھ اس انداز میں آتا ہے گویا ہم اپنی تاریخ کو خود مسخ کر رہے ہیں۔ جیسے "فرینڈز ناٹ ماسٹرز" اس کے کچھ حصے نصاب میں ٹھونسے گئے تھے اب کوئی بتائے کہ اس کی ضرورت کیا تھی؟ کیا

ادب کے سارے خزانے ختم ہو گئے کہ اب ان کھوٹے سکوں سے کام چلانے کی نوبت آگئی۔"
چائے آچکی تھی۔ کیتلی سے اٹھتی ہوئی بھاپ نے اس ایک لمحے میں کئی تصویریں بنا ڈالیں
آخری تصویر منصور کی تھی جسے حق بات کہنے کے جرم میں دار پہ کھینچ دیا گیا تھا۔
میں نے سوچا "وہ دور تو ختم ہو گیا۔ لیکن منصور ہر دور میں زندہ رہا اور رہے گا۔"
چائے پیتے ہوئے میں نے پوچھا۔
"فراز صاحب کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ اردو کا حلیہ تیزی سے بگڑتا چلا جا رہا ہے"۔
اس کی وجہ ؟"
جواب میں انہوں نے فرمایا کہ پاکستان کے کسی بھی علاقے میں بنیادی طور پہ کوئی ایک زبان نہیں بولی جاتی۔ قدرتی طور پہ جب دوسری زبانیں بولی جائیں گی تو اردو کا حلیہ تو از خود بگڑے گا اور بھئی زبان کوئی بھی ہو۔ اس کا دامن اتنا وسیع ضرور ہونا چاہئے کہ وہ دوسری زبانوں کے الفاظ سمیٹ سکے اپنا دائرہ اور وسیع کرے۔ مثال کے طور پہ۔ ایک لفظ ہے "کل" یہ ماضی اور مستقبل کے لئے استعمال ہوتا ہے (بدقسمتی سے ہماری قوم کا کردار بھی یہی رہا ہے کہ وہ ماضی کو بھی مستقبل سمجھتی ہے) پشتو زبان میں گزرے ہوئے کل کے لئے لفظ "پرون" استعمال کیا جاتا ہے۔ سندھی زبان میں آنے والے کل کو "سبھاڑیں" کہتے ہیں۔ تو جب ہم انگریزی کے الفاظ اپنی زبان میں شامل کر سکتے ہیں (جیسا کہ سر سید، حالی اور شبلی نے بھی کیا ہے) تو اپنی علاقائی زبانوں کے الفاظ کیوں نہیں سمو سکتے۔ ؟ اپنے ملک کا کھدر پہننے میں بھلا کیسی جھجھک ؟ زبان کے فروغ کے لئے ایسی خوب صورت پیوند کاریاں تو ازحد ضروری ہیں۔
" اچھا فراز صاحب اپنا کوئی پسندیدہ شعر سنایئے۔"
بے ساختہ بولے "غزل کا یہ شعر ایک تجربہ ہے۔ ہو سکتا ہے اپنا تجربہ خود کو پسند ہو اور دوسرے کو نہ ہو پھر میں کس تجربہ کو کس تجربے پہ فوقیت دوں ؟
"کسی اور کا پسندیدہ شعر... ؟"
" اس سلسلے میں بھی انتخاب مشکل ہے لیکن مرزا عبدالقادر بیدل کا یہ شعر قابل تعریف ہے۔

وضع ایں بحر سخت بے پرواست
ورنہ ہر قطرہ قابل گہر است

احمد فراز نے شعر بھی کہے ہیں اور نثر بھی لکھی ہے۔ ریڈیو کراچی اور پشاور سے وہ جن دنوں وابستہ تھے بے شمار مضامین لکھے۔ پانچ چھ منظوم ڈرامے بھی تخلیق کیے۔ ویسے ان کا جی چاہتا ہے کہ فرصت ملے تو ناول لکھیں۔ بقول ان کے یوں بھی ہمارے ہاں اردو زبان کے اچھے ناول بہت کم ہیں۔ عصمت چغتائی، خدیجہ مستور اور قرۃ العین اور غلام عباس سے متاثر ہیں۔ خدیجہ مستور کا ناول آنگن اور عبداللہ حسین "اداس نسلیں" انہیں خاص طور پر پسند ہیں۔

احمد فراز آج کل پاکستان نیشنل سینٹر اسلام آباد میں ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہیں۔ ان کے کلام کے مجموعے درد آشوب اور تنہا تنہا کے بعد نایافت، شب خون اور جاناں جاناں شائع ہو چکے ہیں۔ آخری مجموعہ ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا ہے۔ ان کی چند نظموں کا یوگوسلاوین زبان میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے جو کتابی شکل میں موجود ہے۔

احمد فراز

عکسِ فن

سبھی کو جان تھی پیاری سبھی تھے لب بستہ
بس اک فرازؔ تھا ظالم سے چُپ رہا نہ گیا

خوابوں میں خواب اس کے یادوں میں یاد اس کی
نیندوں میں گھُل گیا ہو جیسے کہ رتجگا سا

ہم دشت تھے کہ دریا، ہم زہر تھے کہ امرت
ناحق تھا زعم ہم کو جب وہ نہیں تھا پیاسا

اس موسم میں گلدانوں کی ریت گئی
لوگو! اب پھولوں کو آتشدان میں رکھنا

میں تو ہر طرح کے اسباب ہلاکت دیکھوں
اے وطن کاش تجھے اب کے سلامت دیکھوں

رفتہ رفتہ یہی زنداں میں بدل جاتے ہیں
اب کسی شہر کی بنیاد نہ ڈالی جائے

فضل احمد کریم فضلی



چشمِ غزال
نغمۂ زندگی

پیدائش ۱۹۰۶ء



فضل احمد کریم فضلی

جب تک افسر رہے ایک شاعرانہ سرخوشی طاری رہی اور اب جبکہ شاعر ہیں افسرانہ رکھ رکھاؤ کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ یہ فضل احمد کریم فضلی ہیں۔ جنہوں نے غزل کے مزاج کو نہ صرف اچھی طرح سمجھا ہے بلکہ اس کی روایات کو آگے بھی بڑھایا ہے۔

فضلی ۱۹۰۶ء میں اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ خاندان الہ آباد کا رہنے والا تھا۔ وہیں پلے بڑھے الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے کیا اور پھر ولایت بھیج دیئے گئے۔ خاندان علم دوست تھا۔ ان کے والد خان بہادر سید محمد فضل رب صاحب خود پائے کے شاعر تھے اور فضل تخلص کرتے تھے اسی نسبت سے انہوں نے اپنے لئے فضلی تخلص پسند کیا۔

عام گھرانوں میں بچوں کے کانوں میں گلفام شہزادے پریزاد شہزادی اور سامری جادوگر کے نام پڑتے ہیں۔ لیکن یہ اسی عمر میں غالب، ذوق، داغ، اکبر اور اقبال سے متعارف ہوئے، ان کے والد اکثر شعر کہتے تھے تو ذہن میں محفوظ رکھتے تھے اور بعد میں ان سے لکھواتے تھے۔ ظاہر ہے جس بچے کو غزلوں کا املا لکھنے کو ملے اس کی زبان کیوں نہ غزل پر ہی کھلے؟ الہ آباد میں ان کے وسیع مکان کے ایک حصہ میں سید ماجد علی ماجد بطور کرایہ دار رہتے تھے، وہ الہ آباد کے سکہ بند شاعر تھے۔ ان کے ہاں اور خود فضلی صاحب کے والد کے ہاں ہندوستان کے تمام مشاہیر شعراء کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ صفی لکھنوی، ظریف لکھنوی، اثر لکھنوی اور جگر مرادآبادی بھی شامل تھے۔ اس سارے ماحول اور پس منظر کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے بارہ سال کی

عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا۔ شروع میں جو کہا والد کو دکھایا۔ انہوں نے اصلاح تو دی مگر حوصلہ افزائی نہیں کی۔ ہمیشہ یہ ہدایت کی کہ پہلے تعلیم مکمل کر لو، اس کے بعد شاعری کرنا۔ لیکن سمجھانے اور نصیحت کرنے سے کسی کی شاعری چھوٹتی ہے جو ان کی چھوٹ جاتی؟ انہوں نے پہلے ماجد صاحب کو اپنا کلام دکھایا اور اس کے بعد صفی لکھنوی سے اصلاح لی۔ اسی اثناء میں ان کا ولایت جانا ہوا۔ وہاں استاد کہاں میسر آتا! نتیجہ یہ ہوا کہ خود اعتمادی پیدا ہوئی اور اپنے کلام پر خود اصلاح دیتے رہے، اور یہی ان کی شاعری کے حق میں اچھا ہوا۔ ولایت سے لوٹ کر بنگال میں ایک ممتاز عہدے پر ان کا تقرر ہوا۔ ملازمت کی مصروفیت کے دوران شاعری کا جوش کچھ ٹھنڈا رہا اور اس کے بعد کسی کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنا ان کی طبیعت نے گوارا نہیں کیا۔ لیکن فضلی صاحب اپنی شاعری سے اب تک پوری طرح مطمئن نہیں۔ کہ ؏

"ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں"

کے مصداق وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی شاعری اپنے شباب کو نہیں پہنچی ہے۔ نہ جانے پہنچے گی یا نہیں، وہ مزاجاً اور شاعری کے اعتبار سے بھی اپنے آپ کو عہدِ طفولیت میں تصور کرتے ہیں۔

اس سوال کے جواب میں کہ ترقی پسند تحریک میں شامل ہونے سے عام شعراء کے فن میں کس حد تک نکھار آیا، فضلی صاحب نے بتایا کہ ہمارے ہاں ایسا کم ہوا ہے کہ کوئی شخص پہلے اچھا شاعر ہو اور اس کے بعد ترقی پسند تحریک میں شامل ہوا ہو۔ زیادہ تر تو یہی ہوا۔ کہ ابتداء ترقی پسند شاعری سے کی گئی اور بعد میں فن کی طرف توجہ دی گئی۔ گویا ترقی پسند شاعری کا زمانہ مشق کا زمانہ رہا۔ بلکہ دو تین مثالیں تو ایسی ہیں۔ (انہوں نے نام بتانا مناسب نہ سمجھا) کہ ترقی پسند تحریک میں شمولیت کے بعد شاعر فن اور مواد، دونوں کے اعتبار سے انحطاط کا شکار ہو گیا۔ ان کا کہنا ہے کہ کسی شاعر سے یہ مطالبہ کرنا بنیادی طور پر غلط ہے کہ وہ اپنے فن کا موضوع فلاں چیز کو بنائے۔ موضوع کے انتخاب کا دارومدار محض فن کار کے اپنے مزاج اور افتادِ طبع پر ہے۔ جتنا بڑا فنکار ہو گا

اتنی ہی اس کے کلام میں آفاقیت اور ابدیت ہوگی۔ لیکن یہ بات فطری زیادہ ہے اور اکتسابی کم فضلی صاحب کی رائے میں ہر فنکار کی تخلیق میں اس کے اپنے ماحول کا عکس ضرور ہوتا ہے شاعر کا اپنا ماحول زمان و مکان کے وسیع تر ماحول سے جتنا ہم آہنگ ہوگا اس میں اتنی ہی وسعت ہوگی۔ یہاں تک کہ اپنے عروج پر پہنچ کر اس کی حدیں آفاقیت وابدیت کے کناروں کو چوم لیں گی اس موقع پر انہوں نے اپنا ایک شعر سنایا۔

ع اپنے ہی دل کا دھڑکنا تو سبھی سنتے ہیں
ہے مری نبض تو اوروں کے بھی دل کی دھڑکن

انہوں نے امیر مینائی کے مصرعے پر مصرعہ لگا کر بھی اسی قسم کی بات کہی۔

ع اہل ہنر کے دل میں دھڑکتے ہیں سب کے دل
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

میں نے سوال کیا کہ آیا آپ بڑے مشاعرے پسند کرتے ہیں۔ جن میں ہزاروں سننے والے ہوں یا گنے چنے سامعین کے سامنے پڑھنے کو ترجیح دیتے ہیں؟ اس کے جواب میں انہوں نے کہا:۔

"مشاعرے ہماری تہذیب اور آداب معاشرت کے مظہر رہتے ہیں۔ آج کل مشاعروں کا وہی حال ہے جو ہماری تہذیب کا ہے۔ میں بڑے مشاعروں میں جانا ضرور چاہتا ہوں مگر محض رنگ محفل دیکھنے۔ ان میں پڑھنا نہیں چاہتا۔ میں مشاعروں کا شاعر ہوں نہ میری شاعری مشاعروں کے لئے موزوں ہے۔ اس لئے بڑے مشاعروں میں بہت کم پڑھتا ہوں البتہ گنے چنے خوش ذوق سامعین ہوں تو کئی کئی غزلیں سنا دیتا ہوں۔"

ویسے میری اپنی رائے یہ ہے کہ فضلی صاحب کی زبان سے یہ الفاظ ان کی کسرنفسی اور طبیعت کی انکساری نے کہلوائے ہیں کہ وہ مشاعروں کے شاعر نہیں۔ واقعات اس کی نفی کرتے ہیں۔ مثلاً یہی ایک واقعہ لیجئے۔

۱۹۴۰ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس کلکتہ میں ہو رہا تھا خان بہادر رضا علی وحشت نے جن کے نام سے برصغیر کا ہر پڑھا لکھا شخص مانوس ہے بخاص طور

انہیں بھی استقبالیہ کمیٹی میں شامل کیا۔ پروگرام یوں بنا کہ پہلے دو اجلاس ہوئے جن میں مسلم زعماء نے تقریریں کیں۔ پہلے اجلاس میں وحشت کے ایک شاگرد قمر صدیقی نے نظم پڑھی۔ دوسرے اجلاس میں فضلی صاحب کو مجبور کیا گیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی نظم پڑھی۔ جس کا پہلا شعر تھا۔

سناتی ہے مجھ کو عجب اک کہانی
نہ ایسی نئی ہے نہ ایسی پرانی

دوسرے دن مشاعرہ تھا بڑے بڑے مشاہیر اور مشاعرہ باز قسم کے شاعر اکٹھے ہوئے تھے اس زمانے میں حفیظ جالندھری کا طوطی بول رہا تھا۔ ان کا مخصوص ترنم ان کے کلام کو دو آتشہ بنا دیتا تھا۔ اس روز بھی وہ مشاعرے پر چھا گئے اور ایک کے بعد دوسری غزل سناتے رہے حتیٰ کہ بیاض ختم ہو گئی لیکن سامعین کا اصرار جاری رہا۔ قاعدے سے حفیظ کے بعد مشاعرہ ختم ہو جانا چاہیئے تھا لیکن لوگ ابھی تشنہ تھے۔ آخر خان بہادر رضا علی وحشت نے فضلی صاحب کو کھڑا کر دیا۔ انہوں نے میر حسن کی بحر میں چار سو شعر کی مثنوی آکسفورڈ سنائی جس میں وہاں کے ماحول کی عکاسی کی گئی تھی۔ مشاعرے کا قاعدہ ہے کہ چڑھتا ہوا کلام ہو تبھی سندِ قبولیت پاتا ہے ورنہ پڑھنے والا اپٹ جاتا ہے۔ ان کی مثنوی نے پورے مشاعرے کو ہلا کر رکھ دیا اس واقعے کے بیس برس بعد مغربی پاکستان میں سید ضمیر جعفری نے انہیں بتایا کہ حفیظ آپ کے بڑے معترف ہیں ان کا کہنا ہے کہ ان کے بعد مشاعرہ لوٹ لینا فضلی ہی کا کام تھا۔

جدید شعراء کے کلام میں جو ابہام پایا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں فضلی صاحب کی رائے ہے کہ ابہام انہی کے ہاں پایا جاتا ہے۔ جن کا اپنا ذہن الجھا ہوا ہوتا ہے یا پھر جو لوگ یورپ اور امریکہ کی جدید مبہم شاعری سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ اچھے شعر کی تعریف ان کے نزدیک یہ ہے کہ جو سنتے ہی دل میں اتر جائے اور جسے بعد میں پڑھنے پر بھی ایک نیا لطف آئے۔ شعر کہنے کے لئے کوئی بات نہ ہو آدمی کیوں شعر

کہے ؟ اگر محض شعر کہنے کی غرض سے شاعری کی جائے تو اس کا مطلب اپنا اور دوسروں کا وقت خراب کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ فن پر عبور حاصل کئے بغیر کوئی فن کار نہیں بن سکتا اور چند مستثنیات کو چھوڑ کر یہ درجہ بڑی کاوش اور ریاض کے بعد ملتا ہے۔ عرصے تک خون جگر کی پرورش کرنی پڑتی ہے۔ یہ نہیں کہ کا اور لے دوڑے اس سلسلے میں انہوں نے امیرؔ مینائی کا ایک شعر سنایا۔

امیرؔ اک مصرعہ تر تب کہیں صورت دکھاتا ہے
بدن میں خشک جب شاعر کے ہوتا ہے لہو برسوں

میں نے سوال کیا کہ آج کل پاکستان میں کتنے شعراء ہیں جو فن کی کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں ؟ اس کے جواب میں انہوں نے کہا "میں اپنے معاصرین کے بارے میں اظہار خیال نامناسب سمجھتا ہوں۔ یہ کام تو مستقبل کے ناقد کا ہے اور تاریخ بتائے گی کہ کون زندہ رہتا ہے اور کون مرجاتا ہے"۔

فضلی صاحب نثر بھی لکھتے ہیں۔ کوئی دس سال ہوئے ان کا ایک ضخیم ناول "خون جگر ہونے تک" اردو اور انگریزی میں شائع ہوا تھا۔ اس کا پس منظر دوسری جنگ عظیم کے بنگال کا ہے اور وہاں کی معاشرت، سیاست اور معیشت کی بنیاد پر انہوں نے ان حالات کی عکاسی کی ہے۔ جن کے نتیجے میں بنگال کا مشہور قحط پڑا تھا۔ اس کے بعد وہ ایک اردو ناول لکھ رہے تھے۔ جو دوسری جنگ عظیم کے بعد سے برصغیر کی تقسیم تک کے ماحول پر مبنی تھا۔ جس کا نام انہوں نے "سحر ہونے تک" تجویز کیا تھا۔

اس کے بعد آزادی سے لے کر اب تک کے پاکستان کے حالات پر مشتمل تیسرا ناول لکھنے کا ارادہ بھی تھا۔ جس کا نام انہوں نے "سحر ہونے کے بعد" تجویز کیا تھا۔ یہ نام انہوں نے اپنے ہی اس شعر سے اخذ کیا ہے۔

اے دل بہت دعائے سحر مانگتا ہے تو
مانا سحر بھی ہوگی، لیکن سحر کے بعد ؟

فضلی صاحب شاعری کے لئے آسان زبان استعمال کرنے کے قائل ہیں، ان کا کہنا

ہے کہ موٹے موٹے مشکل الفاظ تو محض بیساکھیاں ہیں۔ اور جو شاعر اپنے فن کے بل
نہیں چل سکتا وہ کلام کو مؤثر بنانے کے لئے ان بیساکھیوں کا سہارا لیتا ہے۔
کل فضلی صاحب شاذونادر ہی کسی مخصوص محفل میں دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں۔
ایک فلم چراغ جلتا رہا بھی بنائی تھی۔ جس نے فلم انڈسٹری کو کئی کامیاب فن کار دیے۔
ان کا ناول "سحر ہونے تک" اردو ڈائجسٹ" کے ادارے نے کتابت کرا کے رکھا
توقع ہے کہ جلد شائع ہو جائے گا۔ کلام کے دو مجموعے "نغمۂ زندگی" ۱۹۴۰ء میں ا
۵۲ء میں "چشم غزال" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ "جمالِ غزل" مرتب کر کے رکھا

فضل احمد کریم فضلی

عکسِ فن

بُھلا دیا مجھے ظالم نے عادتاً بھی مگر
وہ بات جس سے کہ یاد آؤں مجھ میں تھی بھی نہیں

گرم رو راہِ طلب میں کوئی ہوتا ہے اگر
ہو کڑی دھوپ بھی تو چھاؤں گھنی لگتی ہے

مَیں جو حالات سے ہوتا ہوں پریشاں فضلی
اس کا باعث تو مری کم نظری لگتی ہے

حُسن ہر شے میں ہے گر حُسن نگاہوں میں ہو
دل جواں ہو تو ہر اک شکل بھلی لگتی ہے

دل نہ مانے اگر تو کیا کیجیے
پھر وہی رہ گذر ہے کیا کہیے

کچھ بھی ان سے مجھے نہیں کہنا
بات بس اس قدر ہے کیا کہیے

ان کے شایانِ شان جو ڈھونڈی نذر
کھُل گیا میں ہوں کس قدر نادار

عشق گو سب سے ہے بڑا آزار
زندگی ہے بغیر عشق کے بار

فیض احمد فیض



پیدائش ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء

کون بے رنگ ہوئی رنج و تعب سے پہلے
اور اب سے پہلے
کس گھڑی کون سے موسم میں یہاں
خون کا قحط پڑا
گل کی شہ رگ پہ کڑا
وقت پڑا
سوچنے دو
اک ذرا سوچنے دو
یہ بھرا شہر جو اب وادیٔ ویراں بھی نہیں

فیض احمد فیض

دست صبا
نقش فریادی
زنداں نامہ
شام شہر یاراں
دست تہ سنگ
سر وادیٔ سینا

فیض احمد فیض

یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے

فیض کی یہ نظم چھپی تو پاکستان و ہندوستان کے ادبی حلقوں میں ایک ہنگامہ مچ گیا۔ کچھ نے ان کی بلند خیالی کی داد دی تو کچھ یہ کہتے سنے گئے کہ نظم مہمل ہے۔ ہماری سمجھ میں اس کا ایک لفظ نہیں آتا۔ یہاں بحث نظم سے نہیں بلکہ اس سے ہے کہ یہ مقام فیض کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں کہ جس کی ایک نظم دو ملکوں میں تہلکہ برپا کر دینے کا باعث بن جائے۔

لینن انعام یافتہ فیض احمد فیض ۱۹۱۱ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں علمی اور ادبی محفلوں کا بڑا چرچا تھا۔ لہٰذا ممکن نہ تھا کہ یہ ہونہار نوجوان اس طرف توجہ نہ کرتا۔ اسکول کے زمانے میں ہی شعر کہنے شروع کر دیئے تھے اور تھرڈ ایئر تک پہنچتے پہنچتے باقاعدہ شاعر بن گئے۔

عام طور پر جب گھر کے بزرگوں تک یہ بات پہنچ جاتی ہے کہ صاحبزادے شعر کہنے لگے ہیں تو کچھ بزرگ اسے بالکل ان معنوں میں لیتے ہیں کہ صاحب زادے کے دشمن چرس پینے لگے ہیں۔ اور پھر وہ ہنگامہ برپا ہوتا ہے کہ خدا کی پناہ۔

ہمارے بیشتر شاعروں کو اس کڑے امتحان سے گزرنا پڑا ہے۔ لیکن فیض صاحب اس سے صاف بچ گئے اس لئے کہ والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ گھر کے بزرگوں میں محض عورتیں تھیں

اور عورتیں اس زمانے میں بھی شعر کہنے اور چرس پینے میں امتیاز کر سکتی تھیں۔

دوران تعلیم ہی فیض اس عالمگیر ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو چکے تھے جو روس سے نکل کر ساری دنیا میں پھیل گئی تھی۔ ان کی شاعری میں طبقاتی شعور ابتدا سے موجود تھا۔ جوشیلی طبیعت فطری ذہانت اور اس شعور کے بعد محض فنی نکھار کی کمی تھی جو سالک۔ پطرس اور مجید ملک جیسی دلنواز ادبی شخصیتوں کی توجہ نے پوری کر دی اور یوں سیالکوٹ کا یہ نوجوان اس صدی کا عظیم شاعر بن گیا۔

فیض کے بارے میں کچھ لوگوں کو بڑی غلط فہمیاں ہیں۔ کچھ کہتے ہیں وہ تھک گئے ہیں کچھ کو شکایت ہے کہ ترقی پسند تحریک کے سلسلے میں ان کا رویہ مثبت نہیں رہا ہے لیکن خود فیض صاحب کا خیال ہے کہ یہ آگ ابھی بجھی نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ پوری تحریک بے عملی کا شکار ہو گئی اور راکھ کی تہوں نے انگاروں کو دبا دیا۔

فیض، ادب برائے زندگی کے سختی سے قائل ہیں بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ ادب برائے معاشی مساوات کے قائل ہیں۔ ان کے خیال میں ہر ادیب ایک مخصوص حلقے کو متاثر کر سکتا ہے اور بہت سے ادیب اور شاعر مل کر دنیا کے تمام مسائل کو سلجھا سکتے ہیں ادیبوں اور شاعروں کو اپنی قوت کا احساس کرنا چاہئے اپنے فرض کو پہچاننا چاہئے اور مل جل کر کام کرنا چاہئے۔ فیض صاحب کے خیال میں ادیب اور شاعر کا کام سچائی اور صداقت کا اظہار کرنا اور ظلم اور زیادتی کے خلاف آواز اٹھانا ہے جو ادیب اور شاعر ایسا نہیں کرتے وہ اپنے فن اور قاری دونوں کے ساتھ انصاف نہیں کرتے۔

ادب میں جمود کے بارے میں فیض صاحب کی رائے ہے کہ اس سلسلے میں ہمیں ہمیشہ غیر مطمئن رہنا چاہئے، یہاں ایسی کوئی حد ہے ہی نہیں جہاں پہنچ کر انسان مطمئن ہو جائے۔

فیض احمد نے سرینگر کے پر فضا ماحول میں ۱۹۴۰ء میں ایک بدیسی خاتون ایلس سے شادی کی تھی۔ ان کی بیگم شاعری کے محاسن کو بڑی حد تک سمجھتی ہیں۔ اکثر آپس میں شاعری کے موضوعات پر تبادلہ خیال بھی ہوتا ہے۔ ان کی دو بیٹیاں ہیں۔ فیض اور ایلس فیض، دونوں نے مل کر اپنی بچیوں کی تربیت ایسی کی ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔

میرے اس سوال کے جواب میں کہ آیا ترقی پسند ادب میں کوئی ٹھہراؤ آگیا ہے فیض صاحب نے بتایا کہ اس کے ذمے دار ادیب اور شاعر نہیں بلکہ ہمارے حالات ہیں پھر بھی ہمیں آج بھی اچھی اچھی چیزیں پڑھنے کو مل جاتی ہیں ۔

فیض صاحب ۱۹۶۸ء میں ہارون کالج کے پرنسپل تھے ۔ پہلے بھی درس و تدریس ہی ان کا پیشہ رہا ہے ۔ ان کا کہنا ہے کہ آج ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ تعلیم کا ہے کالج میں ایسے طالب علم کثرت سے آتے ہیں ۔ جن کے والدین کی آمدنی صرف سو روپے ہے اس کے باوجود ان کے دل میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی لگن ہے اور ہر قیمت پر علم حاصل کرنا چاہتے ہیں ۔ لیکن ہمارا نظام تعلیم ایسا ہے کہ انہیں روزگار کے بجائے بے کاری ملتی ہے ۔

ہندوستان میں مخدوم تھے اور پاکستان میں فیض ترقی پسند تحریک کے دو بڑے ستون رہے ہیں ۔ مخدوم نے کہا تھا ۔

؎ ہجوم شوق سر رہگذار کب سے ہے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

فیض کہتے ہیں :۔

؎ گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

غرض دونوں عمر بھر کی پر خلوص کاوشوں کا سرمایہ لئے اس نئی سحر کا انتظار کر رہے تھے ۔ جس کے بارے میں شکیل بدایونی نے ان الفاظ میں اپنے شکوک کا اظہار کیا تھا کہ :۔

نئی صبح پر نظر ہے مگر آہ یہ بھی ڈر ہے
کہ یہ صبح رفتہ رفتہ کہیں شام تک نہ پہنچے

اور پھر مظفر شاہجہانپوری نے بھرے مشاعرے میں شکیل کو مخاطب کر کے اس کا جواب دیا کہ :۔

قبل آغاز ہی انجام کا ڈر ہوتا ہے
دور اندیشی بڑا تنگ نظر ہوتا ہے

مخدوم اب اس دنیا میں نہیں لیکن فیض احمد فیض بقید حیات ہیں اور ترقی پسند تحریک کی نظریں اب بھی ان کی جانب ہیں۔ کیونکہ فیض نے ایک اپنی عمر عزیز کا ایک طویل حصہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے گذارا "صلیبیں میرے دریچے کی" ان کے انہی خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے جیل سے ایلس فیض اور اپنے دوستوں کو لکھے تھے۔

اس کے علاوہ فیض کے مجموعہ کلام نقش فریادی، دست صبا، زنداں نامہ، سر وادی سینا، میزان اور مضامین، انٹرویو اور تقریروں کا مجموعہ "متاع لوح و قلم" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ فیض کے ایک انگریز دوست وکٹر کیرنن نے "پوئمس بائی فیض" کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے۔ جس میں فیض کی ۳۹ نظموں کے تراجم ہیں۔ اس فیض اور ان کی شاعری کا تعارف بھی ہے جو ۴ مارچ ۱۹۵۰ء کو ایڈنبرا میں لکھا گیا تھا۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ہندوستان میں چھپا۔ پہلا پاکستانی ایڈیشن ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۷۱ء میں یونیسکو نے یہ کتاب شائع کی تو اس میں تراجم کا اضافہ کیا گیا۔ اس طرح نظموں کی کل تعداد ۵۴ ہو گئی۔

ایک سوال کے جواب میں فیض صاحب نے بتایا کہ اساتذہ میں انہوں نے بہت ذوق و شوق سے اگر کسی کو پڑھا تو وہ غالب ہیں۔ اس کے بعد اسیری کے زمانے میں سودا، نظیر، انیس اور دیگر شعراء کا بھی مطالعہ کیا۔ اپنے ہم عصروں میں انہیں ن م راشد مجاز، مخدوم اور علی سردار جعفری نے خاصا متاثر کیا۔ جب میں نے ان سے۔ . . . .
حضرت جوش ملیح آبادی کے بارے میں پوچھا تو بولے ان کے پاس جو قدرت کلام ہے اس میں کوئی شک نہیں اور غالباً قدرت کلام کی وجہ سے وہ بہت پرگو ہیں اور یہ سب بڑے شاعروں کے ساتھ ہوتا ہے کہ وہ اپنے خالص یا کم خالص تجربات میں احتیاط نہیں برتتے۔ جوش صاحب کے پاس بہت اچھی چیزیں بھی ہیں اور بہت ایسی کہ سطح تو ان کی ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ لیکن اس سطح میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو کہ خالص تجربے کی

چیزیں ہیں لیکن بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو محض زور کلام کا نتیجہ ہیں۔

• کیا اس عہد میں شاعری کے دو اہم ستون آپ اور جوش نہیں؟ جواب میں فیض صاحب ہنس کر بولے۔ دو سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں اور اس کا تعین تو آنے والا وقت کرے گا۔"

"یہ بتایئے فیض صاحب کہ نظریئے کے بغیر بڑی شاعری ممکن ہے یا نہیں؟" فیض صاحب نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ "نظریئے کی اصطلاح کے بارے میں بہت سے مغالطے ہیں۔ نظریئے کے یہ قطعی معنی نہیں کہ شاعر ایک ٹکے بندھے اصول، فلسفے، تھیوریز یا سیاست کا کوئی مربوط اور منظم نظام ذہن میں رکھ کر شعر کہے لیکن یہ ممکن ہے کہ شعر کا تجربہ یا کوئی بھی تجربہ کسی نہ کسی نظریئے کے ساتھ وابستہ ہو۔ ایک ہی بات کو آپ کئی نقطۂ نظر سے دیکھ سکتے ہیں۔ آپ کو ایسا کوئی بڑا فنکار چاہے وہ شاعر ہو، ادیب، موسیقار یا مصور نہیں ملے گا جس کے ذہن میں اپنے گرد و پیش کے متعلق کچھ تاثر، کوئی احساس یا کوئی نظریہ نہ ہو یا اس کا فن کسی احساس اور تجربے پر منحصر نہ ہو۔ اچھے شعر، دلکش لے، اور اشتعال انگیز تحریر یا اس کے بغیر جنم نہیں لیتی۔ ایسا کوئی شخص جس کا کوئی نظریہ نہ ہو یا اسے یہ احساس نہ ہو کہ وہ جس دنیا میں رہتا ہے وہ کیسی ہے لوگ کن مسائل سے دوچار ہیں، انسانیت کس راہ پر جا رہی ہے اور بنی نوع انسان کے لئے کیا کرنا چاہیئے وہ انسان ذی شعور نہیں ہو سکتا اور نہ ہی بڑا فن کار۔"

فیض احمد فیض آج کل پاکستان میں نہیں لیکن وہ جہاں بھی ہوں اپنے فن کی روشنی سے اندھیروں کا سینہ فگار کرتے رہیں گے۔

فیض احمد فیضؔ

عکسِ فن

وہ دن کہ کوئی بھی جب وجۂ انتظار نہ تھی
ہم ان میں تیرا سوا انتظار کرتے رہے

انہیں کے فیضؔ سے بازارِ عقل روشن ہے
جو گاہ گاہ جنوں اختیار کرتے رہے

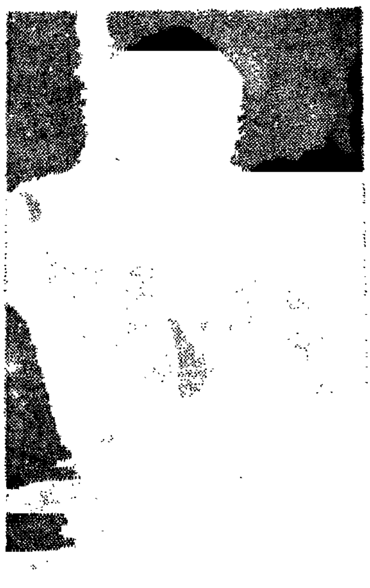
مِٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کرو گے
منصف ہو تو اب حشر اٹھا کیوں نہیں دیتے

ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں، ہر روز نسیمِ صبحِ وطن
یادوں سے معطّر آتی ہے، اشکوں سے منوّر جاتی ہے

بربادیٔ دل جبر نہیں فیضؔ کسی کا!
وہ دشمنِ جاں ہے تو بھلا کیوں نہیں دیتے

وہ جو اب چاک گریباں بھی نہیں کرتے ہیں
دیکھنے والو کبھی ان کا جگر تو دیکھو!

قابل اجمیری



خونِ رگِ جان
دیدۂ بیدار

پیدائش ۱۹۳۱ء
وفات ۱۹۶۲ء

قابل اجمیری

یہ قابل اجمیری ہیں جن کی زندگی بھرپور امنگوں اور حوصلوں سے شروع ہوئی اور محرومیوں اور مایوسیوں میں گھر کر ختم ہو گئی۔ وہ زندگی سے محبت مانگتے رہے مسرت سکون اور آسودگی کی خواہش انہوں نے کی لیکن زندگی ان سے رفتہ رفتہ دور کھنچتی چلی گئی۔ ایسا آخر کیوں ہوا...؟ اس سوال کا جواب تو وقت نے اسی وقت دے دیا تھا۔ جب قابل زندہ تھے۔ موروثی مرض دق انہیں ورثے میں ملی اور مفلسی کا بجھا ہوا چراغ حالات نے ان کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ جسے وہ اپنے ہمت اور شاعری سے روشن کرتے رہے۔ لیکن یہ چراغ زیادہ عرصے نہ جل سکا اور قابل خون تھوکتے تھوکتے تھک گئے تو پھر یہ چراغ روشن نہ رہ سکا اور ۲۷ اگست ۱۹۶۲ء کے دن ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔

قابل اجمیری کا اصل نام عبدالرحیم تھا ہندوستان کے ضلع اجمیر کے قصبہ چرلی میں ۲۷ اگست ۱۹۳۱ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد تقسیم ہند سے قبل تعمیرات کی ٹھیکیداری کا کام کرتے تھے۔ تیز جھلستی ہوئی دھوپ میں گھنٹوں کھڑے رہ کر کام کرواتا اور نگرانی کرنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ چنانچہ اس کے مضر اثرات ان کی صحت پہ پڑے اور وہ دق جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے۔ اس زمانے میں دق کا کوئی مؤثر علاج دستیاب نہیں ہوا کرتا تھا چنانچہ ۱۹۳۸ء میں جب قابل سات سال کے تھے ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس صدمے سے قابل کی والدہ بھی جانبر نہ ہو سکیں اور چند دنوں بعد

وہ بھی منہ موڑ گئیں۔ قابل کے چھوٹے بھائی شریف کو یہ مرض ورثے میں ملا اور ۱۹۴۷ء میں وہ بھی لقمۂ اجل ہو گئے۔ قابل کی پرورش ان کے دادا امیر بخش نے کی۔ انہیں محلے کے گرد و پیش میں علمی ماحول ملا۔ قابل کے مکان کے عقبی دروازے کے سامنے حضور خواجہ معین الدین چشتیؒ کی وہ عظیم الشان درگاہ تھی۔ جس میں جامعہ شاہجہانی اور مدرسہ نظامیہ جیسے بلند پایہ تعلیمی اداروں علم کی روشنی پھیلا رہے تھے۔ قابل نے اپنا لڑکپن اسی درگاہ شریف کے علمی، ادبی اور روحانی ماحول میں گذارا۔ انہوں نے قوالیوں کی صورت میں داغ کی غزلیں، بیدم کی نعتیں، سعدی، حافظ شیرازی اور حضرت سیدنا غوث الاعظم اور حضرت امیر خسرو کا روح پرور کلام اتنی بار سنا کہ انہیں نہ صرف کلام حفظ ہو گیا بلکہ شاعر بنانے کا موجب بھی بن گیا۔ ساتھ ہی جامعہ ازہر کے فارغ التحصیل عالم اور خطیب عبدالرحمن عرب کی شخصیت کی محبت کا فیض تھا کہ قابل نے نو سال کی عمر میں درس قرآن مکمل کر لیا۔ دس سال کی عمر میں صرف و نحو پر عبور حاصل کر لیا اور تیرہ سال کی عمر میں وہ مدرسہ نظامیہ کے ثانوی کی تعلیمات مکمل کر چکے تھے۔

قابل نے اپنی شاعرانہ زندگی کا اہم واقعہ سناتے ہوئے کہا تھا کہ ۱۹۴۰ء میں سجادہ نشین درگاہ شریف اجمیر کی سالانہ محفلِ سماع میں ایک بزرگ پر جذب کی ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ وہ تقریباً بے ہوش ہو گئے، قابل اور ان کے دوست کسی نہ کسی طرح ان کا پتہ معلوم کر کے بزرگ کو ان کے گھر چھوڑنے گئے۔ وہاں جا کر پتہ چلا کہ وہ ارمان اجمیری تھے۔ تب قابل نے مستقلاً ان کے پاس آنا جانا شروع کر دیا۔ ارمان اجمیری خود اچھے شاعر تھے چنانچہ قابل نے ان سے متاثر ہو کر شعر گوئی شروع کر دی اور ان سے اپنے کلام پر اصلاح لینے لگے۔ بزمِ ارمان کے تحت جو ہفتہ واری نشستیں ہوا کرتی تھیں انہوں نے بھی قابل کی شاعری کو ایک نئے موڑ سے آشنا کیا۔ دوسری شخصیت مولانا معینی عربی کی تھی جو جیّد عالم اور تفسیر حدیث کے بلند پایہ محقق تھے اور حیدرآباد دکن میں عربی ادبیات اور تاریخ کے ایک ممتاز پروفیسر تھے۔ جب وہ اجمیر تشریف لائے اور انجمن ترقی اردو کے صدر بنے تو قابل ان سے متعارف ہونے کے بعد ان کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے

بڑی محنت سے قابل کو عروض و بیان کی کتابیں پڑھائیں۔ رفتہ رفتہ قابل کے کلام میں پختگی چلی گئی۔ مولانا کی معیت میں قابل نے پہلی دفعہ آل انڈیا مشاعرے میں شرکت کی۔ اس مشاعرے میں ہندوستان کے مشہور شعراء جگر مرادآبادی، ماہر القادری، حفیظ صہبائی، ساغر نظامی اور سیماب اکبرآبادی شریک تھے۔ یہ مشاعرہ معینیہ اسلامیہ ہائی اسکول کے احاطہ میں منعقد ہوا تھا۔ اس مشاعرے سے قابل کی شخصیت پہلی بار منظرِ عام پر آئی۔ ان کے کلام پر اساتذہ نے داد و تحسین کا اس قدر فراخ دلی سے مظاہرہ کیا کہ ان کی شخصیت ایک شاعر کی حیثیت سے تسلیم کر لی گئی۔ ایک موقع پر جگر مرادآبادی نے ان کے کلام پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ "قابل کے کلام سے ان کی انفرادیت ظاہر ہے اور یہی خصوصیت شاعر کے لئے اہم تر ہے۔ میں نے جب پہلی بار ان کا کلام انہی کی زبانی سنا تو حقیقتاً بہت متاثر ہوا۔ خیالات اور جذبات کے ساتھ ساتھ طرزِ بیان بھی شگفتہ اور پاکیزہ تغزل کا حامل ہے۔"

قابل تقسیم کے بعد پاکستان آ گئے۔ لیکن ناسازگار حالات نے انہیں زندگی کے عذابوں سے دوچار کر دیا۔ اس کا اثر قابل کی صحت پر پڑا اور وہ خود کو سنبھالتے ہوئے کوئٹہ سینی ٹوریم جا پہنچے۔ ۱۹۶۰ء میں وہاں انہیں ایک غم گسار دوست ملا۔ یہ نرگس تھیں۔ کوئٹہ سینی ٹوریم کی نرس جو بعد میں قابل کی رفیقۂ حیات بن گئیں۔ نرگس کی رفاقت نے قابل میں ایک بار پھر زندگی کی تلخ کامیوں سے لڑنے کا حوصلہ پیدا کر دیا۔ لیکن رنج کے خوگر نہ ہو سکے ورنہ بقولِ غالب ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

والی صورتِ حال ہوتی۔ لیکن قابل رنج و الم کا شکار ہو گئے۔ اگر انہیں ٹی بی وراثت میں نہ ملتا تو وہ غمِ دوراں کا مقابلہ کر لیتے لیکن مفلسی اور بیماری ہوں تو اچھے اچھے کا حوصلہ جواب دے جاتا ہے۔ پھر قابل تو ایک حساس شاعر تھے وہ یہ کہتے بھی رہے کہ

جنم جنم کے اندھیروں کو دے رہا ہے شکست
وہ اک چراغ کہ اپنے لہو سے روشن ہے

اور

جی رہا ہوں اس اعتماد کے ساتھ
زندگی کو مری ضرورت ہے

زندگی کی بے وفائی سے تھک کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔ ان کی موت کے بعد ان کے دوستوں نے مجلسِ یادگار قابل قائم کی اور ایک کل پاکستان مشاعرے کا انتظام کیا۔ جس کی امداد سے قابل اجمیری کا ایک مجموعہ "دیدہ بیدار" شائع ہوا۔ اس کتاب کا مقدمہ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے لکھا۔ پھر "طالب علم ڈائجسٹ مطبوعات" کے تحت محسن بھوپالی اور محمد حسین قریشی کی کوششوں سے قابل اجمیری نمبر شائع کیا گیا۔ یہ سب کچھ ایک شاعر کی زندگی میں ہوتا تو اسے شاید جینے کا حوصلہ مل جاتا لیکن اردو زبان کے شاعر کو اپنی زندگی میں اپنی خواہشات کی تکمیل کے ذرائع کم ہی میسر آتے ہیں۔

قابلؔ اجمیری

عکسِ فن

رُکا رُکا سا تبسم جھکی جھکی سی نگاہ
تمہیں سلیقۂ بیگانگی کہاں آیا

بے کسی ڈھونڈتی ہے اک ساحل
حوصلے چاہتے ہیں سو طوفان

تمہیں خود چاکِ گریباں کا شعور آجائے گا
تم وہاں تک آ تو جاؤ ہم جہاں تک آگئے

آج وہ کاتبِ تقدیر بنے بیٹھے ہیں
جن کے سینے میں گدازِ غمِ فردا بھی نہیں

یہ ظالم زمانہ دکھائے گا کیا کیا
تری آنکھ بھی آج نم دیکھتے ہیں

مقاماتِ فکر و نظر کون دیکھے
یہاں لوگ نقشِ قدم دیکھتے ہیں

کوئی احسان کر کے قابلؔ پر
دوستی کی سزا نہ دے جانا

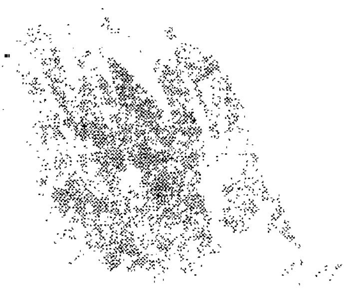
کیوں بجھ گئے چراغ ستاروں کو کیا ہوا
رات اتنی مختصر تو نہ تھی انتظار کی!

راحتوں سے گریز غم سے فرار
بعض لمحے عجیب ہوتے ہیں

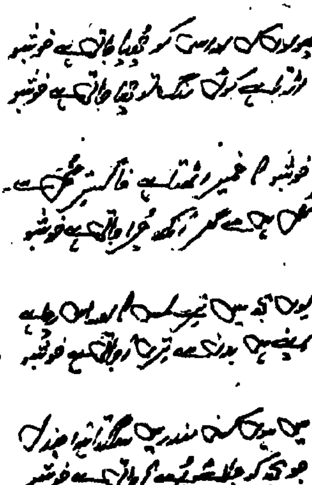
کوئی وعدہ نہیں اُمید نہیں
پھر مجھے انتظار سا کیوں ہے

قتیل شفائی





پیدائش ۱۹۱۹ء



گجر

جل ترنگ

روزن

مطربہ

ہریالی

قتیل شفائی

"مرغ کا قورمہ، کھڑے مصالحے کا سالن، سرسوں کا ساگ، رنگموں بریانی، بالائی کے پراٹھے..."

معاف کیجئے یہ کسی ہوٹل کے کھانوں کی فہرست نہیں ہے بلکہ ان مخصوص ڈشوں کے نام ہیں جو اپنے رنگ کے منفرد شاعر قتیل شفائی کو پسند ہیں۔ یہ ذوق انہیں اپنے والد سے ملا ہے اور ان میں کچھ ڈشیں وہ خود بھی ماہرانہ چابکدستی سے تیار کر لیتے ہیں۔

قتیل ۱۹۱۹ء میں یعنی پہلی جنگ عظیم کے دوران ہری پور ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ گھر میں کوئی شاعر نہ تھا لیکن یہ جب بھی کوئی اچھا شعر سنتے تو جی چاہتا کہ کاش یہ میرا کہا ہوا ہوتا۔ ۳۲ء سے یعنی صرف تیرہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیئے تھے۔ لیکن یہ تخلص ۳۳ء میں اختیار کیا۔ ابتدائی زمانے کا ایک شعر ہے۔

گنگناتی ہوئی آتی ہیں فلک سے بوندیں
کوئی بدلی تری پازیب سے ٹکرائی ہے

ابتدا میں گھر والوں سے چھپ کر شاعری ہوتی رہی لیکن جب ایک نظم کہنے پر اسکول میں ایک کتاب انعام میں ملی تو والد نے جن کا نام فیروز خاں صاحب تھا، بہت شاباشی دی اور جب وہ اسکول کی بزم ادب کے سیکریٹری چنے گئے تو والد صاحب نے ان کی پوری کلاس کو دعوت دی۔ یہاں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ۶۲ء میں جب قتیل شفائی

سٹرز گلڈ مغربی پاکستان ریجن کے سیکریٹری ہوئے تو ان کی والدہ نے ہری پور کے اسی مکان میں ان کے دوستوں کو دعوت دی۔

قتیل ابتدا میں شفا صاحب سے اصلاح لیتے رہے۔ مزے کی بات یہ کہ ان کے ہیڈ ماسٹر خواجہ محمد اشرف غالباً انہیں غیرت دلانے کے لئے اکثر کہا کرتے تھے کہ تم کبھی شاعر نہیں بن سکتے اس کے تیس برس بعد جب قتیل ایک مشہور و معروف شاعر کی حیثیت سے بنوں کالج کے مشاعرے میں بلائے گئے تو خواجہ محمد اشرف صاحب وہاں پرنسپل تھے۔ انہوں نے قتیل کو یہ واقعہ سنایا اور بتایا کہ میں یہ اس لئے کہتا تھا کہ تم ضد میں آکر زیادہ محنت اور کوشش کرو۔ اس واقعے کی یاد سے دونوں آبدیدہ ہو گئے۔

قتیل نے ابتدائی تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول ہری پور میں حاصل کی۔ اس کے بعد والد صاحب کی ناگہانی وفات نے ان کا تعلیمی سلسلہ منقطع کر دیا لیکن قدیم و جدید کلاسیکی ادب اور وسیع مطالعے سے انہوں نے یہ کسر پوری کر لی۔ شفا صاحب کے بعد انہوں نے احمد ندیم قاسمی کو اپنا رہنما بنایا اور ان سے مشورہ لیتے رہے۔ میں نے ان سے سوال کیا کہ آپ نے اردو غزل کو ایک نیا رنگ بخشا ہے۔ آپ کے الفاظ کے چناؤ میں جو خاص قسم کی نغمگی ہے وہ کیسے پیدا ہوئی؟

اس کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ میں نے ابتداء ہی میں محسوس کر لیا تھا کہ ہجوم میں گھر جانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا اس لئے ایک مخصوص لہجہ اور ایک خاص رنگ اختیار کرنے کی کوشش کی۔ اپنے خیال کو مترنم الفاظ میں اس طرح ڈھالنے کی کوشش کی کہ قاری میرے شعر کو بیسیوں شعروں میں پہچان سکے۔ انہوں نے کہا اساتذہ کی زمینوں میں اچھا شعر کہہ لینا اور بات ہے اور خود اپنے رنگ میں شاعری کرنا بالکل الگ بات ہے

میں نے سوال کیا کہ کچھ لوگوں کے خیال میں ہندی بحروں میں بعض اردو بحروں سے زیادہ مٹھاس ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟ اس کے جواب میں قتیل شفائی نے کہا۔

"میں ایسے لوگوں سے متفق ہوں کیوں کہ جہاں تک نغمگی کا تعلق ہے، ہندی بحروں میں تنوع بہت ہے۔ ہندی شاعری میں اردو کے مقابلے میں کئی گنا ایسی بحریں

موجود ہیں جو بظاہر اردو عروض کے قواعد سے انحراف کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن جن لوگوں کی نظر ہندی شاعری پر ہے وہی امتیاز کر سکتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ اردو کے مشہور شاعر پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق ایسی کچھ بحروں کے ماہر ہیں لیکن ہندی اوزان سے ناواقف ہونے کی بنا پر کچھ نقاد ان کے اشعار کو وزن سے خارج سمجھتے ہیں۔ ایسے نقادوں کی نظر سے اگر ہندی کے بعض مخصوص اوزان کے گیت گزریں تو یقیناً ان کی سمجھ میں کچھ نہ آئے۔ کیونکہ ہندی اوزان کی تقطیع اردو عروض کے تحت نہیں کی جاسکتی۔

قتیل شفائی نے فلمی گیت لکھنے میں بھی منفرد مقام حاصل کیا ہے اور اس سلسلے میں اب تک کئی ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کے فلم میں چلے جانے سے ادب کو نقصان پہنچا یا نہیں؟ ظاہر ہے فلمی مصروفیات کی بنا پر ادبی تخلیقات پر کم توجہ دے سکتے ہوں گے۔ اس کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ میں نے فلمی نغموں میں بھی ادبی معیار برقرار رکھا ہے اس لئے ادب کو نقصان پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہوں نے کہا کہ میرے فلم میں آنے کے بعد جو ادبی مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ وہ بھی ادب کے قاریوں میں مقبول ہوئے۔

قتیل نے اپنی پہلی فلم "تیری یاد" سے لے کر جو ۱۹۴۸ء میں بنی تھی تازہ ترین اپنی ذاتی فلم "قصہ خوانی بازار" تک ادب کو فلم میں شامل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے ہندوستان اور پاکستان کے بیشتر نامی گرامی فلمی شاعروں نے قتیل کی بعض تخلیقات کی تقلید ہی نہیں بلکہ سرقے کی حد تک نقل کی ہے۔ قتیل کے فلم میں آنے سے پہلے محض تک بندی کو فلمی شاعری سمجھا جاتا تھا۔ یہ قتیل کی ہی ذات تھی جس نے فلمی نغموں کا معیار بلند کر دیا تھا کہ وہ باقاعدہ ادب کا ایک جز بن گئے۔

یہ بات کم لوگ جانتے ہیں کہ قتیل شفائی نظم کے علاوہ نثر بھی لکھتے رہے ہیں۔ ان کے افسانے تقسیم ہند سے قبل اور آزادی کے بعد بھی "ساقی" اور دوسرے ممتاز جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ قتیل کا محبوب ترین مشغلہ کیا ہے تو میں یہی کہوں گی کہ مجموعے ترتیب دینا اور چھپوانا۔ اب تک ان کے حسب ذیل مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

(۱) "مغرب زدہ" (مثنوی) جو ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی تھی اور اب نایاب ہے۔

(۲) "ہریالی"۔ ابتدائی گیتوں کا مجموعہ جو پہلی مرتبہ ۴۲ء میں شائع ہوا اور اب تک تین ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

(۳) "گجر" شعری مجموعہ۔ پہلی مرتبہ ۵۰ء میں شائع ہوا اور اس کے بعد سے اس کے پانچ ایڈیشن پاکستان میں اور سات ایڈیشن ہندوستان میں شائع ہو چکے ہیں۔ جو ایڈیشن پبلشروں نے چوری سے چھاپ ڈالے ہوں وہ اس کے علاوہ ہیں۔

(۴) جلترنگ۔ شعری مجموعہ۔ پہلی بار ۵۵ء میں شائع ہوا۔ اب تک دو ایڈیشن پاکستان میں اور کئی ایڈیشن ہندوستان میں شائع ہو چکے ہیں۔

(۵) روزن۔ شعری مجموعہ پہلی بار ۵۵ء میں شائع ہوا۔ اب تک دو ایڈیشن پاکستان میں اور کئی ایڈیشن ہندوستان میں شائع ہو چکے ہیں۔

(۶) جھومر۔ گیتوں کا مجموعہ۔ ۶۰ء میں پہلا ایڈیشن پاکستان میں چھپا اور دوسرا زیر طبع ہے۔ اس دوران ہندوستان میں چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

(۷) "مطربہ"۔ ایک موضوعی نظموں کا مجموعہ جو پاکستان میں ۶۵ء میں شائع ہوا اور اس کے بعد یہاں دو ایڈیشن چھپ گئے۔ ہندوستان میں فی الحال ایک ہی ایڈیشن شائع ہوا ہے (غالباً یہ موضوع وہاں زیادہ مقبول نہیں) قتیل شفائیؔ کو اس مجموعے پر ۶۵ء کا آدم جی انعام ملا اور اسی سال نیشنل بک سینٹر کی جانب سے بہترین آرائش کا انعام بھی دیا گیا۔

(۸) "رنگ رس"۔ گیتوں کا مجموعہ۔

(۹) "گفتار"۔ غزلوں اور نظموں کا مجموعہ۔

(۱۰) "سلولائیڈ کے جنازے"۔ فلمی صنعت سے متعلق طنزیہ نظموں کا مجموعہ۔

(۱۱) سنگم۔ پنجابی نظموں کا اردو منظوم ترجمہ زیر ترتیب تھا۔

قتیل شفائی سے میں نے سوال کیا کہ مشاعروں کے سلسلے میں آپ نے پورے برصغیر کے دورے کئے ہیں۔ آپ کے خیال میں کہاں کے سامعین زیادہ مؤدب اور باذوق ہیں۔ انہوں نے اس کا جواب دے کر مجھے چونکا دیا اور غالباً آپ کو بھی حیرت ہوگی۔ کہنے لگے:

"میں نے ہندوستان و پاکستان کے تقریباً تمام اہم شہروں میں منعقدہ مشاعروں میں شرکت کی ہے اور کرتا رہتا ہوں لیکن شعر سننے کا جو سلیقہ میں نے مدراس (جنوبی ہند) کے لوگوں میں پایا وہ کہیں اور نظر نہیں آیا۔"

قتیل ان شاعروں میں سے ہیں کہ اگر کوئی اردو شاعری کے جدید دور پر ایمان نہ لاتا ہو تو اسے قتیل کا کلام دکھا دیں اور وہ فوراً ان کے نام کا کلمہ پڑھنے لگے گا۔ روایتی شاعری کرنے والے جب دعویٰ کرتے ہیں کہ روایتی شاعری بے جان نہیں ہے تو ثبوت میں قتیل کی غزل پیش کرتے ہیں اور جب شاعری کے جدید اسکول سے تعلق رکھنے والوں پر کوئی حملہ ہوتا ہے تو وہ بھی قتیل کو ہی ڈھال کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ترقی پسندوں کا مشاعرہ ہو یا ان لوگوں کا جو اپنے آپ کو ترقی پسند کہلانا پسند نہیں کرتے، قتیل دونوں جگہ نظر آتے ہیں۔

ان کی طبیعت میں بڑی سادگی اور انکسار ہے اس لئے کسی کو شاگرد نہیں بناتے۔ اگرچہ بعض لوگ محض عقیدتاً اپنے آپ کو ان کا شاگرد ظاہر کرتے اور اس پر فخر کرتے ہیں لیکن واقعہ یہی ہے کہ ان کا کوئی باقاعدہ شاگرد نہیں ہے۔ قتیل ہمہ اوقات ادبی تخلیقات میں مصروف رہتے ہیں۔ اس سے وقت بچتا ہے تو فلمی نغمے لکھتے ہیں لیکن بقول ان کے اس وقت بھی ان کے ذہن پر ادبی چھاؤں ہوتی ہے۔

جیسے کوئی شاعر اچھا شعر کسی باذوق انسان کو سنانے کے لئے بیتاب رہتا ہے۔ اسی طرح قتیل دوستوں کو اچھے اچھے کھانے کھلانے کے لئے بے چین رہتے ہیں مگر باذوق ہونے کی شرط یہاں بھی لگی ہوئی ہے۔ لوگ ان کی دعوت قبول کرتے ہوئے دو مرتبہ سوچتے ہیں۔ کیونکہ کھلانے کے بعد وہ اچانک پوچھ بیٹھتے ہیں۔

اچھا بتائیے اس قورمے میں کون کون سے مصالحے ڈالے گئے تھے؟"

قتیل شفائی

عکسِ فن

بہت دنوں سے نہیں اپنے درمیاں وہ شخص
اُداس کر کے ہمیں چل دیا کہاں وہ شخص

آپ کے ہوتے دنیا والے میرے دل پر راج کریں
آپ سے مجھ کو شکوہ ہے خود آپ نے بے پروائی کی

ماتم سرا بھی ہوتے ہیں کیا خود غرض قتیل
اپنے غموں پہ روتے ہیں لے کر کسی کا نام

ایسا ہوا کہ جرم انا الحق کئے بغیر
سُولی پہ چڑھ گئے کئی لعل ماؤں کے

مَیں تیرے لمس کا شیدائی ہوں مگر صرف اتنا
پھُول کو جیسے ہوا چھُو کے گذر جاتی ہے

صدمے جھیلوں جان پہ کھیلوں اس سے مجھے انکار نہیں
لیکن تیرے پاس وفا کا کوئی بھی معیار نہیں

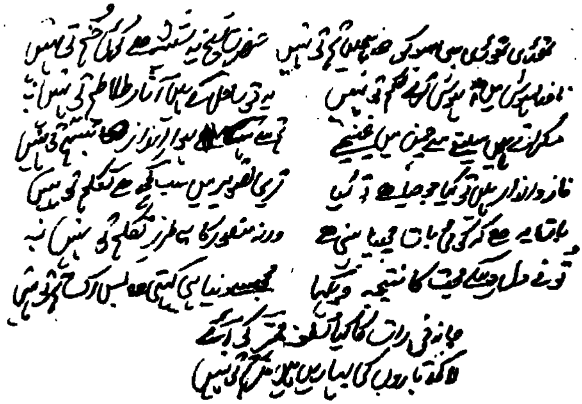
مَیں نے پھولوں سے منایا نہ کبھی جشنِ بہار
اپنے داغوں ہی سے گلرنگ میرا سینہ ہے

قمر جلالوی



اوجِ قمر
رشکِ قمر
تجلیاتِ قمر

پیدائش ۱۸۸۷ء
وفات ۱۹۶۸ء



قمر جلالوی

نام: سید محمد حسین۔ تخلص: قمر۔ سنہ ۱۸۸۷ء میں قصبہ جلالی میں پرورش پائی۔ ان کے لد سید غلام سجاد حسین علی گڑھ کے قصبہ جلالی کے چند گنے چنے رئیسوں میں سے ایک تھے۔ ان کل خاندان رسالدار اور رسالدار میجر تھا۔ چونکہ جائداد کافی تھی۔ لہٰذا اُن کی اعلیٰ تعلیم ضروری نہیں بی گئی۔ چنانچہ گھر پر ہی عربی فارسی اور اردو کی تعلیم دی گئی۔ ان دنوں جلالی میں ادبی فضا عروج تھی۔ استاد قمر نے اسی فضا میں پرورش پائی۔ بچپن ہی سے طبیعت موزوں تھی اور کچھ قدرت ودیعت بھی۔ چنانچہ چار سال کی عمر میں ہی گفتگو میں مصرعے موزوں کرنا شروع دیا۔ اپنے بچپن کا قصہ سناتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ محلے کے چند ہم عمر لڑکوں کے اتھ مکتب جا رہے تھے۔ انہوں نے ایک کیڑا اڑتے دیکھا تو دوستوں سے پوچھا کہ یہ یا ہے؟ جواب ملا "بھنورا" آپ نے اسی وقت کہہ دیا ؎

؎ تو سب سے اچھا ہے اس واسطے رکھا یہ نام
لے آج سے تو بھنورا خطاب لیتا جا

سنہ ۱۸۹۵ء میں جب اُن کی عمر آٹھ سال کی تھی انہوں نے پہلی غزل کہی۔ جس کا مطلع اور طلع انہیں زندگی بھر یاد رہا۔

؎ جیسا کہ مجھ کو عشق ہے اس گلبدن کے ساتھ
بلبل کو بھی نہ ہوگا وہ شاید چمن کے ساتھ

؎ جاں اب کے بچ گئی تو قمر عہد بھی یہ ہے
اب دل لگائیں گے نہ کسی سیم تن کے ساتھ

اس زمانے میں جلالی میں طرحی مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ دوسرے شعراء میر انعام حسین انعام، میر امیر احسن امیر، میر آل محمد عطا وغیرہ کو انہوں نے اپنا کلام دکھایا تو انہوں نے بچہ سمجھ کر کلام دیکھے بغیر ہی انہیں لوٹا دیا۔ پھر جب انہوں نے مشاعروں میں پڑھنا شروع کیا تو اساتذہ بھی دنگ رہ گئے۔ اور وہ سارے شعرا بعد کو ان کے شاگرد ہو گئے۔ انہوں نے بہر حال حضرت امیر مینائی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ ۱۹۰۵ء میں جلالی سے علی گڑھ آ گئے۔ یہاں ان کے ہزاروں کی تعداد میں شاگرد ہوئے۔ ۲۹ء میں شادی ہوئی۔ ایک بیٹی کنیز فاطمہ ہیں جو انہی کے ساتھ رہتی تھیں۔ تقسیم کے بعد استاد ہجرت کرکے ۱۱ ستمبر ۱۹۴۷ء کو پاکستان آ گئے۔ یہاں بھی ان کے سینکڑوں کی تعداد میں شاگرد ہیں۔ جن میں اعجاز رحمانی، سرور کانپوری، حافظ بریلوی اور رضا جلالوی قابلِ ذکر ہیں۔ رضا جلالوی کے کلام میں استاد کا رنگ جھلکتا ہے۔

استاد کی خدمات کے صلے میں صدر پاکستان ایوب خان نے ان کے لئے ۵۹ء سے تا زیست ماہانہ ڈیڑھ سو روپیہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔

ان کے پسندیدہ اشعار مندرجہ ذیل ہیں:۔

حمد

خشکی و تری پہ قادر ہے آسان مری مشکل کر دے
ساحل کی طرف کشتی نہ سہی کشتی کی طرف ساحل کر دے

نعت

سوچتی ہے دل میں دنیا مصطفےٰ کو دیکھ کر
وہ مصور کیسا ہوگا جس کی یہ تصویر ہے

غزل

چمن میں روتی ہے شبنم اب اس کلی کے لئے
خزاں نے جس کو اجازت نہ دی ہنسی کے لئے

قمر جلالوی

چھپا رہے ہیں وہ منہ مرے اشک پیہم سے
پناہ مانگتا ہے آفتاب شبنم سے

استاد قمر سے سندھ میں ہونے والے مشاعروں میں بڑا ساتھ رہا۔ خصوصاً جیکب آباد نواب شاہ اور میرپور خاص کے مشاعروں میں تو خصوصی مجلسیں جمتی تھیں۔ مجھے یاد ہے جیکب آباد کے مشاعرے میں ہم اور رابعہ نہاں کاظمی صاحب کے گھر ٹھہرے تھے۔ مشاعرہ ختم ہوا اور ہم گھر پہنچے۔ صبح جلد اٹھنے کی عادت تھی۔ استاد بھی آگئے تھے۔ ہم لوگ انگیٹھی کے گرد بیٹھے تھے۔ رابعہ نہاں استاد کو چلغوزے چھیل کر دیتی جا رہی تھیں۔ بحث ہو رہی تھی اصنافِ سخن پر۔ استاد کو سجع کہنے میں کمال حاصل تھا۔ مجھ سے کہنے لگے کہ سجع کہنا سیکھ لو۔ پھر انہوں نے رموز و اوقاف بتائے اور میرے نام کا سجع اس طرح نکالا۔

"ترے رخ کے مقابل ہوا سلطانہ مہر"

میرے لئے کہا ہوا استاد قمر کا یہ سجع ہمیشہ کے لئے میرے ذہن میں محفوظ ہوگیا۔ اس میں ذرہ بھر بھی شبہ نہیں کہ استاد مشاعرے لوٹ لیا کرتے تھے۔ زیادہ تر مشاعرے انہیں کی صدارت میں ہوا کرتے تھے۔ خنک راتوں کا پچھلا پہر استاد مرحوم کا کلام اور پھر ان کے ترنم میں۔ اللہ اللہ ۔۔ حاضرینِ محفل پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہوجاتی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے روح جسم سے کھنچتی جا رہی ہو۔ ان کے یہ اشعار کبھی نہیں بھلائے جا سکتے۔

؎ اب آپ کے مرے گھر تک قدم نہیں آتے
یہ وہ سزا ہے دیا تھا جو ہاتھ جوڑ کے دل

٭

؎ وہ کیا ہیں آج ان کے فرشتے بھی آئیں گے
وعدے کی شب نہیں ہے یہ دن ہے حساب کا

٭

؎ جنوں تو ایک بڑی چیز ہے محبت میں
فدا سے اشک سے راز آشکار ہوتا ہے

قمر جلالوی

استاد نے معاش کے حصول کے لئے بہت جتن کئے لیکن گردش روزگار نے چین نہ لینے دیا۔ مشاعرے کی آمدنی گذارے کے لئے ناکافی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں دردِ دل کے ساتھ غمِ روزگار کی بھی تصویر جگہ جگہ موجود ہے۔ انہوں نے ایک طویل عمر پائی۔ اکیانوے سال کی عمر میں ۲۴ر اکتوبر ۱۹۶۸ء کو کراچی میں یرقان کے مرض میں مبتلا ہوکر انتقال فرمایا۔

ان کے شاگرد جو کراچی میں ہیں ان میں سے دو خاصے مشہور ہیں۔ ستر دہلوی اور اعجاز رحمانی، انہوں نے ہی بھاگ دوڑ کرکے ان کی وفات کے بعد ان کا مجموعہ کلام چھپوایا۔ زندگی میں انہیں اس کی حسرت ہی رہی۔ ناقدرشناس معاشرے کی ایک پہچان یہ بھی ہے۔ شیخ شوکت علی اینڈ سنز نے پہلے ان کے مرثیوں، سلاموں اور رباعیات کا ایک مجموعہ "غمِ جاوداں" شائع کیا۔ اس کے بعد 'اوجِ قمر' اور 'رشکِ قمر' کے نام سے ان کی غزلوں اور قطعات کے مجموعے شائع کئے۔ شیخ شوکت علی ہی ان کا مدحیہ کلام منقبت نعت اور قصائد "عقیدتِ جاوداں" کے نام سے شائع کر رہے ہیں۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ استاد قمر میر تقی میر کے دبستان کے آخری شاعر تھے۔ انہیں اپنی زندگی ہی میں میرِ ثانی کا لقب مل گیا تھا۔ وہ بنیادی طور پر خلوت کے شاعر تھے لیکن حالات نے انہیں جلوت کا شاعر بنا دیا تھا۔ اپنے تخلص کا استعمال انہوں نے اس مقطع میں کس خوبی سے کیا ہے ؎

؎ تمہارے چاند سے رُخ کی قسم میں ہی ہوں قمرؔ
جگر کا داغ دکھا دوں جو اعتبار نہ ہو

زمانے کے ساتھ ساتھ اور بھی شعراء آئیں گے لیکن استاد قمر کا خلا کبھی پُر نہ ہو سکے گا۔

قمر جلالوی

عکسِ فن

چاندنی رات کا کیا لطف قمر کو آئے
لاکھ تاروں کی بہاریں ہیں مگر تم تو نہیں

تخلیق کلام سے عیاں ہے
اردو مری مادری زباں ہے

نتیجہ بھی کیا ایسی بزمِ عدو سے
نہ تم دیکھتے ہو نہ ہم دیکھتے ہیں

یہ کوئی موت میں ہے موت ہم غریبوں کی
کفن ملا تو میّسر مزار ہو نہ سکا

طے ہوتا ہے وعدۂ محبّت
دونوں کی نگاہ درمیاں میں ہے

آنکھ کے آنسو پہ دل گھبرا گیا
خیر ہو کشتی میں پانی آگیا

نہ کیوں روئیں قسمت پہ اہلِ گلستاں
دعائیں غریبوں کی خالی گئی ہیں

ماهرالقادری

فردوس
محسوسات ماہر
جذبات ماہر



پیدائش ۱۳۲۶ھ
وفات ۱۹۷۸ء

یکے در سایۂ شاخ صنوبر نغمہ می زد
کہ برگ گل بہ قدر زحمت صد خار [illegible]
کسے داند بوقت صبح بر قطرۂ شبنم
[illegible]

مترجمہ :-

ایک شخص شاخ صنوبر کے سایہ میں گا رہا تھا۔ یہ کہ پھول کی پتی بہت سے کانٹوں کی زحمت کے بعد ہاتھ آتی ہے
کون جانے کہ صبح کے وقت اوس کی ہر بوند پر، سورج کی کرن رقص کرتی ہے یا کانپتی ہے

ماہر القادری

مشاعرہ جب عین شباب پر تھا۔ اناؤنسر نے ایک شاعر کا نام پکارا۔ شاعر اسٹیج پر آیا اور تحت اللفظ مصرع پڑھا تو سامعین نے شور مچایا۔

ع "ترنم سے ہوگی، ترنم سے ہوگی"

جس پر شاعر نے مسکراتے ہوئے بڑے ہی نفیس ترنم میں غزل شروع کر دی۔ اور پہلے ہی شعر سے داد ملنا شروع ہو گئی۔

یہ تقریباً ہر مشاعرے میں ہوتا تھا اور لوگ ماہر القادری کا کلام ان کے خاص ترنم ہی میں سننے کی ضد کرتے تھے۔

ماہر کا نام منظور حسین ہے جس کے عدد ۱۳۲۴ ہوتے ہیں اور یہی ان کا ہجری سن پیدائش ہے۔ ماہر انہوں نے تخلص رکھا۔ سلسلہ قادریہ سے وابستہ ہونے کی بنا پر ماہر القادری مشہور ہوئے۔ آپ ضلع بلند شہر یو۔ پی کے رہنے والے تھے۔ والد محمد معشوق علی ظریف تخلص کرتے تھے لیکن ظریفانہ اشعار کے بجائے نعت اور حمد کہا کرتے تھے۔

ماہر القادری نے علیگڈھ میں تعلیم پائی اور اس کے بعد بھی سنجیدگی سے مطالعہ جاری رکھا۔ اور خاص طور سے عربی ادب کا بھی مطالعہ کیا۔ حیدر آباد دکن میں انہوں نے پندرہ سال گزارے۔ نواب بہادر یار جنگ کے جلسوں میں ان کی نظم ضرور ہوتی تھی۔

۱۹۳۳ء میں جب سہ روزہ مدینہ بجنور کے دفتر سے روزنامہ مدینہ جاری ہوا تو

ماہر القادری

ماہر بھی ادارہ تحریر میں شامل تھے۔ اسی میں بچوں کے رسالے غنچہ کے مدیر بھی رہے۔
مختصر عرصہ کے لئے ماہر فلمی دنیا میں بھی پہنچے اور اگرچہ جلد ہی کامیابی کی راہیں ہموار ہو چلی تھیں لیکن ان کا دل اچاٹ ہو گیا اور نومبر ۱۹۴۸ء میں پاکستان آگئے اور دو سال بعد انہوں نے ماہنامہ فاران جاری کیا۔ جسے وہ اپنی زندگی تک باقاعدگی سے نکالتے رہے۔ ماہر اور فاران دونوں ایک دوسرے کے لئے اس طرح لازم وملزوم ہو چکے تھے۔ کہ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور ہی ناممکن ہے۔
ماہر مشاعروں کے سلسلے میں برصغیر کے تمام بڑے شہروں کا دورہ کر چکے تھے۔ ان کی بعض غزلوں اور سلاموں نے زبردست شہرت پائی۔ مثلاً:۔

'ہر ذرہ دل بن جاتا ہے ہر چیز نظر ہوتی ہے'۔
'مستی نواز شوخی انداز کافرانہ'
اور 'سلام اس پر کہ جس نے بیکسوں کی دستگیری کی'

خاص طور پر ان کا یہ سلام لاکھوں کی تعداد میں چھپ کر تقسیم ہو چکا ہے۔
ماہر القادری تقریباً دو درجن کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ محسوسات ماہر، لغات ماہر، جذبات ماہر، ذکر جمیل' ان کی نظموں اور غزلوں کے مجموعے ہیں۔ دُرِ یتیم' آنحضرتؐ کی سیرت پاک کے بارے میں ایک کتاب ہے جسے ناول کے طرز پر لکھا گیا ہے" کاروانِ حجاز' سفرنامہ ہے۔ کانچ ہاؤس اور جب میں جوان تھی' رومانی ناول ہیں۔
اردو کے علاوہ ماہر فارسی بھی بے تکان لکھتے تھے۔ ان کا فارسی کلام ایران کے متعدد جرائد میں بڑے اہتمام سے شائع ہوتا رہا ہے۔
ماہر القادری روایتی شاعروں کی طرح اپنے لباس وغیرہ کی طرف سے بے پرواہ نہیں رہتے تھے۔ شیروانی پہنتے تھے اور کاجل بڑے اہتمام سے لگاتے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اصلی گھی اہتمام سے کھاتے تھے۔ جو بطورِ خاص رحیم یار خاں سے ان کے لئے مہیا کیا جاتا تھا۔

یہ ۱۲ مئی ۱۹۷۸ء کی بات ہے۔ جدہ (سعودی عرب) میں ایک مشاعرہ تھا۔ جس میں دوسرے

شعراء کے ساتھ ماہر بھی مدعو تھے۔ مشاعرہ کا پہلا دور ۱۰½ بجے شروع ہوا۔ اور ۱۲½ بجے ختم پھر ایک گھنٹہ کا وقفہ ختم ہوا اور دوسرے دور کا آغاز محترمہ وحیدہ نسیم صاحبہ نے اپنے کلام سے کیا۔ پھر رحمان کیانی آئے۔ اور جس ترتیب سے مشاعرہ کا پہلا دور شروع ہوا تھا، اسی ترتیب سے معزز شعراء کو پڑھنے کے لئے بلایا جا رہا تھا۔ پہلے دور میں جب ماہر القادری صاحب کو مائیک پر تشریف لانے کی دعوت دی گئی تو انہوں نے فرمایا کہ طبیعت تو کل ہی سے کچھ ایسی چل رہی تھی کہ خیال تھا کہ شاید مشکل ہی سے مشاعرہ میں آسکوں مگر بہر حال اب پہنچ ہی گیا۔ اس وقت کسی کو کیا معلوم تھا کہ ماہر صاحب آ تو گئے ہیں مگر جانا اب ان کے بس میں نہیں ہے۔ دوسرے دور میں ماہر صاحب سے جمنا کے کنارے والی نظم سنانے کی فرمائش ہوئی مگر انہوں نے انکار کرتے ہوئے "کراچی نامہ" کے عنوان سے نظم سنائی اور اس طرح کراچی اور اہل کراچی کو آخری بار یاد کیا۔ اس کے بعد وہ نعت سنانا چاہتے تھے کہ کموڈور علوی صاحب جو اسٹیج سیکریٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے انہوں نے یہ کہہ کر روک دیا کہ تیسرا دور نعتوں کا شروع ہوگا۔ نعت اسی میں پیش فرمائیں مائک سے ماہر صاحب واپس چلے گئے۔ دوسرے دور کے آخری اور مشہور شاعر ابو الاثر حفیظ جالندھری اپنا کلام سنا رہے تھے۔ سامعین ان کا کلام مزے لے لے کر سن رہے تھے۔ خوب داد مل رہی تھی۔ انہوں نے اپنے شعر کا پہلا مصرعہ پڑھا اور فرمایا کہ اس میں لفظ "بھی" پہ اہل زبان حضرات ذرا غور فرمائیں۔ مصرعہ تھا۔

ؔ بہشت میں بھی ملا ہے مجھے عذاب شدید

اور پھر دوسرا مصرعہ پڑھنے سے پہلے ماہر صاحب کی طرف خاص طور پہ متوجہ ہوئے اور فرمایا۔ ماہر صاحب! ملاحظہ ہو۔

ؔ بہشت میں بھی ملا ہے مجھے عذاب شدید
یہاں بھی مولوی صاحب ملے ہیں ہمسائے

بس شعر کا پڑھنا تھا کہ ماہر صاحب کے جذبۂ ایمانی کو جیسے للکارا گیا ہو۔ ایک شعلہ کے مانند ماہر صاحب اپنی نشست سے اٹھ کر مائیک پہ آئے اور پورے جذبۂ ایمانی کے

ساتھ حفیظؔ صاحب کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر سامعین کو بتایا کہ
"یہ صاحب غلط جگہ پہنچ گئے"

بس یہ کہہ کر اپنی نشست پر پورے اطمینان سے بیٹھے بھی نہ تھے کہ ملک الموت نے انہیں ان کے مولائے اعلیٰ سے ملا دیا۔ پشت کی جانب گر پڑے۔ ٹانگیں لمبی ہو گئیں۔ اسٹیج پر ڈاکٹر نیازی صاحب دوڑ کر پہنچے اور نبض پر ہاتھ رکھا۔ پھر دل کی حرکت سننے کی کوشش کی۔ دو گولیاں منہ میں ڈالیں۔ مصنوعی طور پر سانس پہنچانے کی کوششیں کیں مگر

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے اپنا کام تمام کیا

فوراً اسپتال پہنچایا گیا۔ آکسیجن لگائی، مصنوعی سانس دینے کی کوشش کی۔ دل میں ایک انجکشن پیوست کیا گیا مگر ماہر تو اب اپنے رب سے ملاقات کر رہے تھے۔ منہ میں جو دو گولیاں دی گئی تھیں، ویسے ہی رکھی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر نیازی اور ڈاکٹر عبدالغنی نے ماہر کی موت کا اعلان انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر کیا۔ فوراً طے پایا کہ کراچی میں ورثاء سے اجازت لے لی جائے کہ یہاں دیارِ حرم میں دفنایا جائے۔ راؤ اختر صاحب نے سفارتخانہ کے ابرار صدیقی صاحب کے ساتھ مل کر بھاگ دوڑ کی۔ افضال صاحب نے ٹیلیکس کا مضمون تیار کیا۔ میت کو کولڈ اسٹوریج میں رکھوا دیا گیا۔ راؤ اختر صاحب نے کراچی میں فون پر مولانا ظفر احمد انصاری سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ پھر کراچی سے ماہر صاحب کے ورثاء کی طرف سے پیغام ملا کہ انہیں دیارِ حرم ہی میں دفنا دیا جائے۔ اب اتنا وقت نہ تھا کہ جمعہ کی نماز حرم میں ملے۔ فیصلہ کیا گیا کہ مغرب کی نماز کے بعد حرم کعبہ میں نماز جنازہ پڑھوائی جائے۔ نماز کے بعد بڑی تیزی کے ساتھ میت کو جنت المعلیٰ لے جایا گیا۔ تمام راستے باآواز بلند کلمہ شہادت و کلمہ توحید کا ورد ہوتا رہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ آسمانوں سے فرشتے میت کو کاندھا دینے کے لئے اتر آئے ہیں۔

قبرستان پہنچے، قبر بالکل تیار تھی، مدرسہ صولتیہ کے شمیم صاحب نے بڑی محبت سے قبرستان کے اس احاطہ میں کہ جس میں مدرسہ صولتیہ کے اکابرین دفن ہیں، ماہر مرحوم کے لئے جگہ

نکلوائی ۔ وہ بتا رہے تھے کہ دیکھئے اس احاطہ میں یہ پہلی قبر مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے ۔ دوسری قبر مولانا رحمت اللہ صاحب بانی مدرسہ آرام فرما رہے ہیں ۔ تیسری قبر میں حضرت مولانا عبدالحق صاحب شیخ الرسائل، مولانا حبیب اللہ صاحب لاہوری اور مولانا سلیم صاحب مدفون ہیں اور یہ چوتھی قبر ہے جس میں پہلے سے دو بزرگ موجود ہیں اور اب جناب ماہر القادری صاحب ولد معشوق علی صاحب کو یہ شرف حاصل ہو رہا ہے کہ قیامت تک کے لئے وہ ان بزرگان دین کے ہمسایہ رہیں ۔ ماہر کی قسمت کا عروج سب کو رشک آ رہا تھا ۔ سب کی زبان پہ کلمہ کا ورد جاری تھا ۔ مولانا شمیم صاحب بہت محبت سے ماہر مرحوم کو دفنا رہے تھے ۔ قبر پہ پتھر رکھ دیئے گئے ۔ مٹی دی گئی اور یوں ماہر کی دیار حبیب میں دفن ہونے کی برسوں کی آرزو پوری ہو گئی ۔

ماہرالقادری

عکسِ فن

یوسفی گر نہیں ممکن تو زلیخائی کر
ان سے پیدا کوئی تقریبِ شناسائی کر

گذرے ہوئے شباب کی بس یاد رہ گئی
اور یاد بھی کہ جیسے فریبِ خیال ہو

سب مرے حالِ پریشاں کا اڑاتے ہیں مذاق
اے غمِ دوست مری حوصلہ افزائی کر!

پہلی نظر تھی دل کا مول
اب آنسو کے موتی رول

شاید وہ پھر آ جائیں
کہتے ہیں دنیا ہے گول

ظلم کا بدلہ پیار سے دے
کنکر لے کر ہیرے تول

دنیا کیا اُمیدیں کیا
پیتل پر چاند کا جھول

ماہرؔ ان کا کیا کہنا
اچھی صورت میٹھے بول

دل کی خلش سے تاب و تواں زندگی میں ہے
غم تھا اگر نہ ہے تو یہ جینا محال ہو!

محسن احسان

پیدائش ۱۹۳۳ء



یہ ستمبر ۱۹۶۹ء کی بات ہے۔ کراچی ٹیلیویژن کی طرف سے منعقد کئے جانے والے مشاعرے میں جب محسن احسان مائک کے سامنے آئے تو پچھلی قطار سے آواز آئی۔

"کیا پشاور کے تمام شاعر ایسے ہی خوب صورت ہوں گے؟"

"ہاں احمد فراز بھی تو ہے۔"

میں نے پیچھے مڑکر دیکھا۔ لیکن اندازہ لگانے میں کامیابی نہیں ہوئی کہ آواز کون سی قطار سے ابھری تھی اور اتنی حسرت سے کہنے والا کون تھا۔

پشاور کے شعراء خوب صورت ہیں یا نہیں۔ یہاں اس سے بحث نہیں لیکن بلاشبہ محسن احسان کے اشعار میں بھی حسن ہے اور ان کی باتوں میں بھی۔ میں نے پوچھا۔

"آپ کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا؟"

بولے۔" زندگی میں تین چیزوں کی بڑی تمنا رہی ہے۔

میں نے کہا وہ کیا؟"

کہنے لگے

"خوبصورت لباس پہنوں

خوبصورت گھر میں رہوں

اور

خوبصورت لوگوں سے ملوں"

لیکن وہ جو ہم رکھتے تھے اک حسرتِ تعمیر سو ہے"
بے اختیار ان کے اس جواب پر داد دینے کو دل چاہا لیکن گفتگو نثر میں ہو رہی تھی۔ چنانچہ میں نے پوچھ لیا۔
"کیا آپ نثر بھی لکھتے ہیں۔؟"
"جی ہاں، اور بعض اچھے مضامین کی شعر کی طرح داد بھی حاصل کی ہے"۔
"ہاں آپ محسن احسان کیوں کر کہلائے؟ یہ سوال ابتدائی تھا لیکن خیر۔ درمیان میں پوچھ لینے میں بھی کوئی حرج نہیں تھا" سوال پوچھ کر میں نے قلم سنبھالا تو بولے۔
"لکھئے۔ احسان الٰہی میرا نام ہے۔ تخلص محسن ہے۔ ان دونوں کے امتزاج نے احسان محسن سے اُلٹ پھیر کر کے محسن احسان بنادیا۔ احسان الٰہی اس لئے تھا کہ کئی بہنوں کے بعد پیدا ہوا اور ہمارے معاشرے میں لڑکی کے بعد لڑکا جنم لے تو اللہ میاں کا احسان ہی ہوتا ہے"۔
"پیدا کب ہوئے اور کہاں؟"
"۱۵ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو پشاور کے ایک خوش حال گھرانے میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم بھی پشاور میں ہی حاصل کی۔ اسکول کے زمانے میں ایک ہندو استاد ماسٹر روشن لال کی تعلیمی استعداد نے بڑا خوشگوار اثر ذہن پر ڈالا۔ کچھ مجبوریاں اور مشکلات تھیں کہ میں تعلیمی سلسلہ جاری نہ رکھ سکا لیکن جلد ہی احساس ہوگیا کہ مجبوریاں ذہنی آوارگی کی طرف زیادہ راغب کر رہی ہیں چنانچہ گردش ایام کو پیچھے کی طرف لوٹانے کا تہیہ کرتے ہوئے انگریزی ادبیات میں ایم اے کرلیا۔ اسکے بعد اسلامیہ کالج پشاور کے شعبہ انگریزی میں تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران ڈاکٹر مظہر علی خاں اور ایک انگریز خاتون پروفیسر مس ہار بائل نے بڑا متاثر کیا۔ میں ان کے نقش قدم پر چل کر اپنے طالب علموں کو وہ علم وشعور دینے کا خواہشمند ہوں جو میں نے اپنے ان اساتذہ سے حاصل کیا ہے۔ انگریزی ادب میں ایم اے کرنے کے بعد محسوس ہوا کہ ہم ابھی صدیوں پیچھے ہیں۔ اردو کا دامن تنگ نہیں لیکن ہم نے اس میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں کیا۔ ادب کی موجودہ رفتار میرے نزدیک قابل اطمینان نہیں۔ میرا یہ شعر اس بے اطمینانی کا جواب ہے۔

؎ یہ بدنصیبیٔ عہدِ ادب بھی دیکھ ذرا
ہجومِ اہلِ قلم میں ادیب کوئی نہ تھا

کیونکہ ہمارا پورا دور غالب یا اقبال جیسی قد آور شخصیت کی نمائندگی نہیں کرسکتا۔ نہ ہی جدید دورِ شاعری سے مجھے بحیثیت ایک شاعر اور ادیب کے اطمینان ہے۔ یہ لوگ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہیں، انٹ شنٹ کہتے ہیں۔ انٹ شنٹ سے مراد اس قسم کی باتیں جنہیں وہ خود بھی نہیں سمجھتے کہ کیا کہہ رہے ہیں گو کہتا کچھ اور چاہتے ہیں۔ پھر طرّہ یہ کہ خود ہی عظیم ہونے کے دعویدار بنتے ہیں۔ انہیں اپنے اور قاری کے درمیان رشتہ استوار کرنے کا سلیقہ نہیں آتا۔ سلیقہ میں نے اس لئے کہا کہ شعر سلیقے کا محتاج ہے اور جو بات سلیقے سے کہی جاتی ہے قاری کے دل میں اترتی ہے۔ میں شعر کے سلسلے میں۔

"از دل خیزد و بر دل ایزد"

کا قائل ہوں۔

"شاعری میں پرانی علامتیں کب تک استعمال ہوتی رہیں گی؟"

"اس سوال کے جواب میں انہوں نے لمحے بھر کو سوچا پھر بولے "سب سے پہلی بات تو یہ کہ علامتیں فرسودہ نہیں ہوئیں۔ فرسودگی کا خیال ہی غلط ہے۔ فیض کے یہاں پوری جدیدیت کے ساتھ ان کا استعمال ہوا ہے فیض کو آج کا نمائندہ شاعر کہا جاتا ہے۔ ان کی چھاپ نئے لکھنے والوں پہ اتنی گہری ہے کہ وہ اس اندھی تقلید میں اپنا انفرادی رنگ بھی کھو بیٹھے ہیں۔ حالانکہ یہ علامتیں ہماری زندگی سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ ان اقدار کے ساتھ مناسبت رکھتی ہیں۔ جو ہماری زندگی اور ہماری روایات کا جزو ہیں۔ اگر ہم مشرقی روایات و حجاب کو زندہ دیکھنا چاہتے ہیں تو ہم ان علامات کو اپنے اشعار کے دائرے سے یک قلم خارج نہیں کرسکتے۔ ہمیں ماضی کو حال کی کڑیوں کے ساتھ جوڑ کر مستقبل کی تعمیر کرنا ہے"۔

"یہ بتلایئے محسن صاحب یا احسان صاحب کہ آج کل غزل میں جو نت نئے تجربے ہو رہے ہیں کیا وہ کامیاب ہیں؟"

اس سوال کے جواب میں انہوں نے کہا "میرے خیال میں غزل کے نت نئے تجربے انتہائی

ناکامیاب ثابت ہوئے ہیں۔"

"پھر آپ شعر و ادب کی ترقی کے لئے کچھ تجاویز پیش کرسکیں تو ۔۔۔" میں نے قصداً جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

انہوں نے فرمایا: "شعر و ادب کی ترقی کے لئے سب سے بڑی ضرورت تعلیمی ترقی اور ادبی ذوق کی نشوونما ہے۔ اگر تعلیم یافتہ ادبی ذوق سے بہرہ ور طبقے کا تناسب بڑھ گیا تو یقیناً شعر و ادب کی ترقی کی رفتار بھی بڑھے گی۔ لائبریریوں (عمدہ کتابوں سے مزین) اور ادبی اداروں کی فراوانی ادبی مجالس کا انعقاد، ریڈیو اور ٹیلیویژن جیسے بااثر اداروں سے اعلیٰ پروگرام کی پیشکش صحیح ادبی ذوق کے پروان چڑھنے میں معاون ثابت ہوسکتی ہیں۔ میرے خیال میں زبان و ادب کو نقصان پہنچانے میں سستے جاسوسی ناول، ڈائجسٹ، جرائم کی کتب اور روزناموں کے ادبی ایڈیشنوں نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔"

اصناف سخن میں محسن احسان کی محبوب صنف "غزل" ہے اور فراق کے اس مقولے پر ان کا ایمان ہے کہ

؎ "شاعری ادب کا عطر ہے اور
غزل اس عطر کا عطر ہے"

محسن احسان

عکسِ فن

صوفیِ شہر مرے حق میں دُعا کیا کرتا
خود تھا محتاجِ عطا، مجھ کو عطا کیا کرتا

تری نگاہ سے اوجھل سہی مگر محسن
خزاں کا عکس بھی آئینۂ بہار میں تھا

مَیں ایک عمر کے بعد آج خود کو سمجھا ہوں
اگر رُکوں تو کنارا، چلوں تو دریا ہوں

بُلندیوں سے میری سمت دیکھنے والے
مرے قریب تو آ، مَیں بھی ایک دنیا ہوں

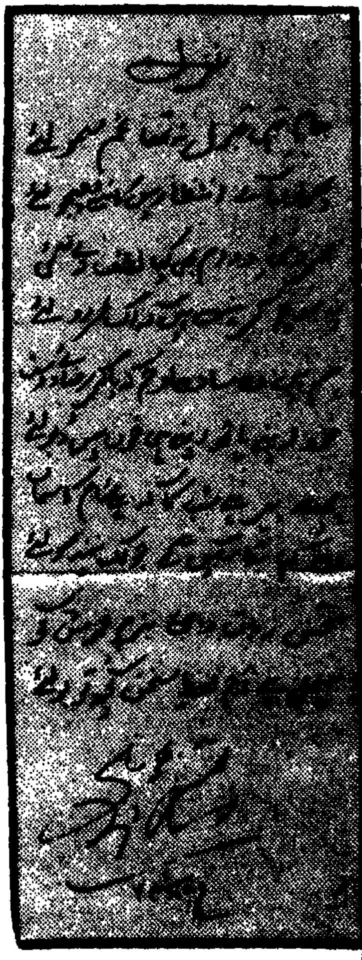
محسن احسان کی اس سادہ دلی کے صدقے
دُھوپ میں ڈھونڈتا پھرتا ہے مزا چھاؤں کا

دُور رہ کے بھی ہے ہر سانس میں خوشبو تیری
مَیں مہک جاؤں جو تُو پاس بلا لے مجھ کو

اگر ہے مقتلِ جاناں کا رُخ تو اے محسن
ذرا ٹھہر کہ ترے ساتھ مَیں بھی چلتا ہوں

محسن بھوپالی





غزل

پیدائش ۱۹۳۲ء

جستہ جستہ
نظمانے

محسنؔ بھوپالی

؎ نیرنگیٔ سیاستِ دوراں تو دیکھیے
منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

قیامِ پاکستان کے بعد کہے جانے والے اشعار میں جو شعر سب سے زیادہ مشہور ہوا ہے وہ یہ ہے اور اس کے شاعر ہیں محسنؔ بھوپالی۔ غالباً سب سے پہلے سردار عبدالرب نشترؔ نے آرام باغ کے ایک جلسے میں یہ شعر پڑھا تھا۔ محسنؔ بھوپالی صاحب کے حافظے کے مطابق یہ جلسہ ۵۰ء میں ہوا تھا۔

نام عبدالرحمان، ۲۹؍ستمبر ۲۲ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے اور وہیں الیگزنڈرا ہائی اسکول میں نویں تک تعلیم پائی۔ ان کے والد محکمہ ڈاک میں تھے ۴۷ء میں لاڑکانہ آگئے اور اُن کے ساتھ محسنؔ بھی منتقل ہوگئے۔ محسنؔ کی شاعری کی عمر تقریباً وہی ہے جو پاکستان کی ہے۔ پہلی غزل کا مطلع تھا۔

؎ جو تم نے گلستاں میں صورت دکھادی
تو گل ہنس پڑے اور کلی مسکرا دی

ساحرؔ عباسی کراچی سے ایک جریدہ 'ربط' نکالتے تھے۔ اس کے اگست ۴۹ء کے شمارے میں یہ غزل شائع ہوئی۔ ابتدا میں محسنؔ کو مزاحیہ شاعری سے دلچسپی تھی ۴۹ء سے ۵۲ء تک چاند (لاہور)، نمک دان (کراچی) اور نقاد (کراچی) وغیرہ میں ان کا مزاحیہ کلام شائع

ہوتا رہا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ سنجیدہ کلام بھی نورجہاں، نقاد اور افکار کی زینت بنتا رہا۔

محسن بھوپالی نے ۱۹۵۰ء میں لاڑکانہ سے میٹرک اور ۱۹۵۴ء میں این۔ای۔ڈی۔ انجینیرنگ کالج کراچی سے میکینکل انجنیرنگ میں ڈپلوما حاصل کر کے محکمہ تعمیرات میں ملازمت کرلی۔ آج کل وہ کراچی میں محکمۂ تعمیرات میں اسسٹنٹ انجنیئر ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں انہوں نے شوکت عابدی، صہبا رضوی اور شفیق قادری کے تعاون سے بزم ادب قائم کی۔ جو آج بھی موجود ہے۔ انہی دوستوں کے مشورے سے انہوں نے اپنا تخلص بھی تبدیل کیا۔ شروع میں زیبا بھوپالی کے نام سے لکھتے تھے۔ بعد میں اپنے عزیز دوست محسن حنفی کی یاد میں محسن بن گئے (محسن حنفی بھوپال میں اب بھی ہیں)۔

محسن بھوپالی بعض دوسرے شاعروں کی طرح "بے استادے" نہیں ہیں۔ شروع میں صہبا رضوی سے مشورہ لیا۔ پھر ۱۹۵۹ء میں سیماب اکبرآبادی سے اور پھر ان کے ایما پر ان کے شاگرد صبا متھراوی سے دو سال اصلاح کی۔ ان کا سرمایۂ کلام ڈیڑھ سو غزلوں، ساٹھ نظموں اور کوئی ڈھائی سو قطعات پر مشتمل ہے۔ نظمیں ۱۹۵۴ء سے کہنا شروع کیں اور اب زیادہ تر غزلیں اور قطعات ہی کہتے ہیں۔

۱۹۶۲ء میں حیدرآباد میں قابل اجمیری کی یاد میں مجلس یادگار قابل قائم کی گئی۔ محسن تین سال تک اس کے کنوینر رہے اور اس ادارے کے تحت قابل اجمیری کے دو مجموعے "دیدۂ بیدار" اور "خونِ رگِ جاں" شائع کئے۔

محسن بھوپالی رائٹرز گلڈ کے بنیادی ممبر ہیں۔ پچھلے تین سال سے وہ صوبہ سندھ مجلس عاملہ کے منتخب رکن بھی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ لوگ اچھا ادب پیدا نہ ہونے پر گلڈ کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں حالانکہ رائٹرز گلڈ اچھا یا برا ادب پیدا کرنے کی ذمہ دار نہیں ہے۔ یہ تو محض ادیبوں کی ٹریڈ یونین ہے۔ جس کا مقصد ان کے حقوق کا تحفظ اور اس کے لئے قانونی امداد فراہم کرنا، نیز ضرورت پڑنے پر ان کی یا ان کے اعزا کی مالی امداد کرنا ہے۔

محسن فکری طور پر ہمیشہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے ہیں۔ مجاز اور مخدوم سے بہت متاثر ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنا پہلا مجموعہ "شکستِ شب" مجاز سے منسوب

کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ترقی پسند ادب آج بھی عوام میں مقبول ہے۔ محسن صا
کے سلسلے میں سابق مشرقی پاکستان اور پاکستان کے مختلف شہروں کا دورہ کرتے ر
ہیں اور یہ رائے تجربے کے بعد قائم کی گئی ہے۔ ان کے خیال میں ادب میں گھٹن
وجہ یہ ہے کہ معاشرے کے صنعتی اور مشینی ہوجانے سے عام لوگوں میں تنہائی
احساس بڑھ گیا ہے۔ ادیب چونکہ عوام کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس لئے یہ احساس
تحریر میں جھلکنے لگا ہے۔ پچھلے چند سال میں جو شاعری سامنے آئی ہے اس
بے حد الجھاؤ، ابہام اور گنجلک اشاریت ہے جس کی وجہ یہی ہے۔ ان کا کہنا
کہ مشق سخن اور فن کار کے ذاتی تجربے اس گھٹن سے نکلنے کے سلسلے میں شاعر
رہنمائی کر سکتے ہیں۔ یہاں محسن بھوپالی کی رائے بعض دوسرے دانشوروں سے مختلف
ہے جو اس گھٹن کو موجودہ اقتصادی نظام کی پیداوار بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب
تک یہ نظام نہیں بدلے گا۔ گھٹن، مایوسی اور تنہائی کا احساس بڑھتا ہی جائے گا۔
محسن بھوپالی کو شکایت ہے کہ اردو کو قومی زبان بنانے کے سلسلے میں خلوص سے کام
ہو رہا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اردو کی ترقی کے بجائے چند افراد کی ضروریات اور مصلحت
کو مدنظر رکھا جا رہا ہے۔ پرانی کتابوں اور کلاسیکی ادب کو عام کرنے اور نئی نسل کو انھیں
پڑھنے کی ترغیب دلائے بغیر یہ کام ہوتا نظر نہیں آتا۔ محسن بھوپالی کی سب سے بڑی خو
یہ ہے کہ شاعری میں نام کر جائیں اور ادب کی تاریخ میں انہیں بھی ایک مقام حاصل۔
ان کی ایک کوشش یہ بھی ہوتی ہے کہ اچھے شعراء کے شعری مجموعے بہر طور شائع ہوں۔
اس سلسلے میں وہ دامے درمے قدمے سخنے کبھی پیچھے نہیں رہتے۔
وہ سادہ زندگی گذارنے کے عادی ہیں۔ لباس میں بش شرٹ پتلون اور سوٹ پہنا
کرتے ہیں۔ کھانے میں انہیں نان اور قورمہ سب سے زیادہ پسند ہے۔ چنانچہ
بے تکلف دوست کے ہاں دعوت ہو تو احتیاطاً یاد دلا دیتے ہیں۔ طبیعت میں سا
بے انتہا ہے۔ وہ دوستوں کے لئے ایک دردمند اور خلوص سے بھرا ہوا دل پہلو
رکھتے ہیں۔ محسن نے زندگی کے کئی سرد و گرم تھپیڑے کھائے لیکن ہمت نہ ہاری یہ

محسن بھوپالی

کی مسلسل جد و جہد کا ہی نتیجہ ہے کہ آج وہ ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہیں ۔

اب تک ان کے تین شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں ۔ "شکستِ شب" (نظمیں، غزلیں قطعات ۱۹۶۱ء) "جستہ جستہ" (قطعات ۱۹۶۹ء) "نظمانے" (منظوم افسانے ۱۹۷۵ء) ان کا شعری مجموعہ "ماجرا" زیرِ طبع ہے ۔

گذشتہ چند برسوں میں کتابوں کی تقریب اشاعت کا چلن عام ہو گیا ہے لیکن یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی ۔ کہ پاکستان میں سب سے پہلے ان کے شعری مجموعے "شکستِ شب" کی تقریب اشاعت ۲۵ نومبر ۱۹۶۱ء کو حیدر آباد سندھ میں زیرِ صدارت زیڈ ۔ اے ۔ بخاری منعقد ہوئی تھی ۔

ان کی ذاتی لائبریری میں اردو کے بیشتر شعری مجموعوں اور شعراء کی تصاویر اور گروپ کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے ۔ پچھلے ۲۵ برسوں کے اہم واقعات اور ادبی اور ثقافتی خبروں کے اخباری تراشوں کی بیش قیمت فائلیں بھی ان کے پاس محفوظ ہیں ۔

☆

محسن بھوپالی

عکسِ فن

نیرنگیٔ سیاستِ دوراں تو دیکھئے
منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے!

جاہل کو اگر جہل کا انعام دیا جائے
اس حادثۂ وقت کو کیا نام دیا جائے
میخانے کی توہین ہے رندوں کی ہتک ہے
کم ظرف کے ہاتھوں میں اگر جام دیا جائے

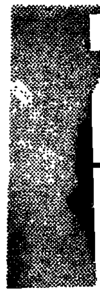
منحصر اہلِ ستم پر ہی نہیں ہے محسن
لوگ اپنوں کی عنایت سے بھی مر جاتے ہیں

دیکھا نگاہ بھر کے تو بینائی چھن گئی
سورج تھا آئینے میں کہ چہرہ انا کا تھا

جو حال پہ تنقید کی جرأت نہیں رکھتے
ماضی پہ تمسخر کا انہیں حق بھی نہیں ہے

صحرا کی امانت ہوں سرِ کنجِ بہاراں
بیٹھا ہوں بلاوا مرا جب تک نہیں آتا

محشر بدایونی



شہرِ نوا
غزل دریا



پیدائش ۱۹۲۶ء

دی گردشیں اتنی کوزہ گر نے
مٹی ہی تو تھے بکھر گئے ہم

ناگہاں بام سے ایک ناوک چلا
شہر میں پھر جو چلی ہے رسم ستم

پتھر ہی سے ایک شکل ڈھالی
پتھر ہی سے پھر وہ توڑ ڈالی

مجھے بھی ساتھ ہی لے لو مگر نہیں یارو
میں سست قدم ہوں تمہارا سفر بگاڑوں گا

آج ہی دیکھے تھے لہراتے ہوئے خواب اسیروں نے بھی
گھومتے حلقے نظر زنجیرِ پا میں آئے ہیں

چمن میں جو ذرا جب تیز ہوا چبھتے ہیں رگوں میں کانٹے سے
سو بار خزاں آئی ہوگی مگر اس بار ہوئی

اس انتظار سے بھی ہم گزر چکے اب تو
جس انتظار میں انسان مر بھی جاتا ہے

محشر بدایونی
۲۵- نومبر ۱۹۶۷ء



محشر بدایونی

کسی زمانہ میں بدایوں کا نام پورے برصغیر میں پیڑوں کے لئے مشہور تھا۔ لوگ بدایوں کے پیڑے تحفے کے طور پہ دور دور لے جاتے تھے۔ لیکن بدایوں کی مٹی میں جو مٹھاس ہے وہ پیڑوں کے علاوہ وہاں کے شاعروں کے کلام میں بھی اُبھرتی اور سخن شناسوں کے کانوں میں رس گھولتی رہی ہے۔ فانی بدایونی اور شکیل بدایونی نے جس خطے کو حیات جاوید بخشی اس میں مئی ۱۹۲۶ء میں ایک ہونہار بچے نے جنم لیا۔ والدین نے فاروق احمد نام رکھا۔ شاعری گھر کی لونڈی تھی۔ شعر و سخن گھٹی میں پڑے تھے۔ والد مورخ بدایونی تاریخ گوئی میں ملکہ رکھتے تھے۔ پھوپھا عیش بدایونی امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ چچا شاد بدایونی احسن مارہروی کے چہیتے شاگردوں میں سے تھے۔ بڑے بھائی منور بدایونی کراچی میں ہیں اور اپنی شعری تخلیقات پر صدر سے تین بار انعام حاصل کر چکے ہیں۔ مشہور طنز گو شاعر دلاور فگار ان کے پھوپھی زاد بھائی ہیں۔ غرض یہ کہ محشر بدایونی کا خاندانی پس منظر خاصہ بھاری بھرکم ہے۔

محشر بچپن میں مزاحیہ اشعار کہہ کر ساتھیوں کا دل خوش کیا کرتے تھے۔ والدہ کے انتقال کے بعد بڑی بہن نے پالا تھا۔ وہ اکثر تکیئے کے غلافوں پر کاڑھنے کے لئے ان سے شعر لکھوا کر کڑھواتی تھیں۔ انہوں نے تکیئے کے لئے خود بھی کئی شعر کہے جواب انہیں یاد نہیں لیکن بدایوں کے ممتاز گھرانوں میں اب بھی تکیوں پر چل رہے ہیں۔

پہلی غزل گیارہ سال کی عمر میں کہی۔ شہر میں طرحی مشاعرہ تھا۔ اس زمانے میں بھی

فانی بدایونی کا کلام مطالعے میں رہتا تھا۔ چنانچہ اس ذہین بچے کی غزل کا شعر تھا۔

ایک زنجیر سی رکھی ہے کفن کے اندر
ہو نہ ہو ہے یہی میت ترے دیوانے کی

ابتدا میں محشر کا رجحان نظم گوئی کی طرف تھا۔ ہر صنف میں شعر کہتے حتیٰ کہ مرثیے کی نازک راہیں بھی طے کیں۔ یہ بھی غالباً فانی سے عقیدت کا نتیجہ تھا۔ پھر ۱۹۴۳ء میں شکیل بدایونی نے انہیں دہلی بلوا لیا وہاں سپلائی کے محکمے میں ملازم ہو گئے بعد میں خاتونِ مشرق کے ایڈیٹر رہے۔ اس زمانے میں آگرہ گئے اور تاج محل کے صحن میں بیٹھ کر نظم کہی جو بہت مشہور ہوئی اس کے دو شعر ہیں۔

اللہ میں یہ تاج محل دیکھ رہا ہوں
یا پہلوئے جمنا میں کنول دیکھ رہا ہوں

یا تاج قرینے سے ابھی رکھ کے زمیں پر
سویا ہے کوئی بادشہِ وقت یہیں پر

محشر کا پہلا بڑا مشاعرہ سہارنپور کا آل انڈیا مشاعرہ تھا جس کی صدارت صفی لکھنوی نے کی اور اس وقت کے تقریباً سارے مشاہیر شعراء اس میں شریک تھے۔ یہ مشاعرہ بھی طرحی تھا اور محشر کا یہ شعر حاصل مشاعرہ قرار دیا گیا۔

پژمردگیٔ گل پہ ہنسی جب کوئی کلی
آواز دی خزاں نے کہ تو بھی نظر میں ہے

اس مشاعرے کے بعد انہوں نے غزل پر توجہ دینا شروع کر دی اور پاکستان آنے کے بعد نظمیں کہنا تقریباً بند کر دیں۔ شروع میں تخلص راحت رکھا تھا لیکن اس سے ذوق کی تسکین نہ ہو سکی لہٰذا محشر بن گئے۔ انہوں نے سائل دہلوی۔ نوح ناروی، صفی لکھنوی سیماب اکبرآبادی، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی اور گوپی چند امن کی صحبت میں رہے۔ جس نے ان کے فن کو جلا بخشی۔ کسی کے شاگرد نہیں رہے لیکن اساتذہ سے بہت کچھ سیکھا۔

محشر جب نظم لکھتے تھے تو مشاہدے پر زیادہ زور دیتے تھے۔ یعنی دریا پر نظم لکھی تو دریا کے کنارے بیٹھ کر ہی لکھی اس لئے وہ تصویر کشی میں بڑے کامیاب رہے ہیں۔ ایک نظم میں غروبِ آفتاب کا منظر پیش کیا ہے۔ اس کا ایک مصرعہ ہے۔

جھاڑیوں کی تاجپوشی کر رہا ہے آفتاب

۱۹۶۱ء میں کراچی میں والد کے انتقال کے بعد انہوں نے ہر طرف گہرا سناٹا اور تاریکی محسوس کی ماں کا سایہ تو پہلے ہی سر سے اٹھ چکا تھا۔ اس کے بعد سے ان کا رنگ بدل گیا اور انفرادی احساس کے بجائے ایک اجتماعی زندگی کا رنگ ان کے اشعار میں رچ بس گیا۔ بعض ناقدین نے اس دور کو شاعری کے نئے موڑ سے تعبیر کیا

۱۹۶۳ء میں ان کی غزلوں کا مجموعہ "شہرِ نو" شائع ہوا۔ اس میں پروفیسر ممتاز حسین کا مقدمہ لائق مطالعہ ہے۔ محشر شعر کہنے کے لئے کسی وقت کے پابند نہیں نہ اہتمام کے قائل۔ بس طبیعت مائل ہونا شرط ہے۔ چند سال پہلے وہ ترنم سے پڑھتے تھے لیکن جب سے تحت میں پڑھنے کا نیا موڑ آیا ہے وہ بھی ترنم چھوڑ بیٹھے ہیں۔ وہ کسی چہرے سے کبھی متاثر نہیں ہوتے ویسے ہر شے سے متاثر ہوئے ہیں۔ پتھر میں بھی انہیں حسن نظر آتا ہے ان کی شاعری کے لوازمات دریا، کوہ، بیابان اور شہر ہیں کلام کا اندازہ ان اشعار سے ہوتا ہے۔

کس کی نظر میں گل کے یہ پہلو
روتا رنگ بلکتی خوشبو

؂

کوئی نہیں جو ہلکا کر دے بارِ سفر مجھ تنہا کا
دوش پہ ہے امروز کا بوجھ اور سر پہ قرض ہے فردا کا

محشر ادب میں ابھرنے والی نئی نسل کی صلاحیتوں کے معترف ہیں لیکن ساتھ ہی اس کے شاکی بھی ہیں کہ ان کے ہاں ٹھہراؤ پایا جاتا ہے۔ ان کے خیال میں نوجوان شاعر اساتذہ کا مطالعہ نہ کر کے بڑی غلطی کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بغیر نظم و ضابطے کے نہ زندگی

مل ہوتی ہے نہ ادب اور یہ نظم و ضابطہ ہمیں کلاسیکی ادب سے ہی مل سکتی ہے۔

ان کی شادی عزیزوں میں ہی ہوئی۔ تین لڑکیاں ہیں۔ اپنی بچیوں کے لئے انہوں نے س طور سے نظمیں کہیں جن کا مجموعہ "بین باجے" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ بچوں کے ئے دو اور کتابیں "شاعر نامہ" اور "سائنس نامہ" بھی لکھیں۔ پہلی کتاب میں شاعروں اور سری میں سائنس دانوں کا منظوم حال ہے۔ شاعر نامہ پر ۱۹۶۲ء میں انجمن ترقی اردو نے یک ہزار روپے کا انعام دیا تھا۔

محشر بدایونی کو اپنے یہ دو شعر بہت پسند ہیں۔

نہ جاؤ گھر کے شب افروز روزنوں پہ کہ لوگ
دیا مکان میں جلتا بھی چھوڑ جاتے ہیں

سایہ طلب گئے جدھر بولے اُٹھے وہیں شجر
آئے ہو اب مسافرو جب ہمیں دھوپ کھا گئی

محشر ریڈیو پاکستان کے رسالے "آہنگ" کے مدیر ہیں۔ عجیب اتفاق ہے کہ ان شاعری اور زندگی کا بھی بڑا جزو 'آہنگ' ہی ہے۔

محشر کے کلام کا تازہ مجموعہ "غزل دریا" کے نام سے مارچ ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا ہے۔ اسے وں نے اپنے والد کے نام منسوب کرتے ہوئے یہ شعر تحریر کیا ہے۔

مٹی کی عمارت سایہ دے کر مٹی میں ہموار ہوئی
ویرانی سے اب کام ہے اور ویرانی کس کی یار ہوئی

محشر کے ایسے ہی اشعار دیکھ کر جناب شان الحق حقی نے لکھا ہے کہ "بعض بعض غزلیں جو ر نے کہہ دیں کاش میں نے کہی ہوتیں۔ ایسی غزلوں سے اس دور میں غزل کی آبرو قائم رہی ہے۔ بعض شعر تو دل میں اٹک کر رہ گئے ہیں۔ شعر کے پیچھے دیوان نذر کر دینے کی جو روایت لی ہے۔ ان اشعار کو دیکھ کر کچھ غلط نہیں معلوم ہوتی کہ یہ واقعی اردو غزل کے منفرد اشعار ہیں۔"

محشر بدایونی

عکسِ فن

کرے دریا نہ پُل مسمار میرے
ابھی کچھ لوگ ہیں اس پار میرے

اک سلطے سے آس تھی سکوں کی
اب وہ بھی گیا اُداس کر کے

پھولوں کے شہر اور بگولوں کے رقص
آنکھوں کو یہ دور بھی تھا دیکھنا

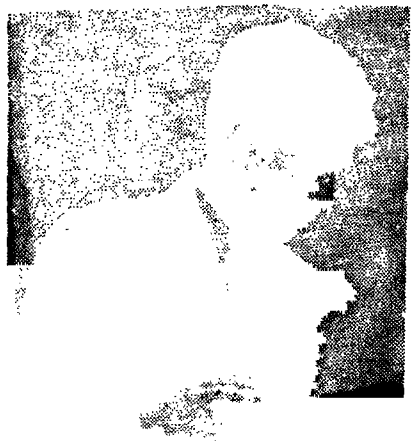
چاہے اس امتحاں میں بازو بھی ٹوٹ جائیں
کھولے جو در اُڑان کے، پرواز اسی کی ہے

محشر وہ کیا دلوں کی لگی کو بجھائیں گے
جن کو گھروں کی آگ تماشا دکھائی دے

لب ہوں اتنے نہ حرف سے بے راہ
کیا خبر پوچھ لیں وہ حال کہاں

صبح ہوئی کہ لے چلا روزیِ روز کا سوال
گو ہمیں نگل گئی پھر بھی نہ سلسلہ گیا

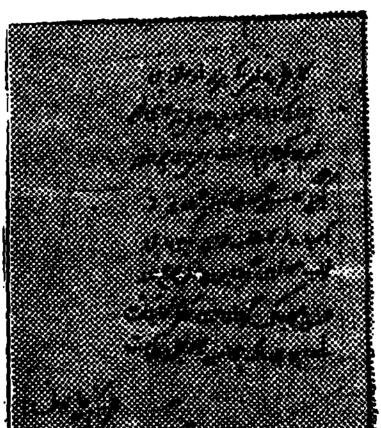
عزیز حامد مدنی



دشتِ امکاں

چشمِ نگراں

پیدائش ۱۹۲۴ء



عزیز حامد مدنی

آج کے شاعر کا سلسلہ اس غرض سے شروع کیا گیا تھا کہ لوگ اپنے جانے پہچانے شاعروں کو زیادہ قریب سے جاننے اور پہچاننے لگیں، کالموں کی تنگ دامانی نہ تو کسی کے کلام کے بھرپور تنقیدی جائزے کی اجازت دیتی تھی نہ اس کوزے میں سوانح عمری جیسے دریا بند کئے جا سکتے تھے۔ پھر بھی میری ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ ہر شاعر کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم ہو جائیں نیز ان سے جو سوالات کئے جائیں ان کے جوابات شاعر کی ادبی، سیاسی، معاشرتی اور داخلی زندگی کے بہت سے پہلوؤں کو اجاگر کریں۔ زمانہ مستقبل کے سوانح نگار اور ناقدین کے سامنے یہ تحریر موجودہ دور کی داخلی اور خارجی کیفیات کی آئینہ دار ثابت ہو۔ بلکہ موجودہ دور کے شعراء کے حالات اور واقعات بھی محفوظ ہو جائیں۔

"آج کا شاعر" (جو کہ عنوان ہے) اسے مراد آج کی بزم کا شاعر ہے نہ کہ آج کے دور کا۔ اس لئے کہ آج کے شاعر کا تعین بہرحال مستقبل کے فن کار قارئین اور ناقدین کریں گے۔

اس سلسلے میں جب عزیز حامد مدنی صاحب کا نام میرے سامنے آیا تو لوگوں نے بتایا کہ وہ تو انٹرویو کے نام سے ہی چڑتے ہیں۔ یہی بات پروفیسر مجتبیٰ حسین صاحب کے لئے بھی کہی گئی تھی۔ مجھے فخر بھی ہے اور خوشی بھی کہ میرے استاد محترم نے میری التجا پر حوصلہ شکنی نہیں کی۔ اور چونکہ مدنی صاحب کے علم وفضل کے چرچے بھی سنے تھے لہٰذا ۱۸ ستمبر ۱۹۶۸ء

کے وسط میں میں نے ان سے رابطہ قائم کیا۔ انہوں نے پہلا سوال یہی کیا۔

"کیا کیجئے گا انٹرویو لے کر؟"

"اخبار میں چھاپیں گے۔" میں نے جواب دیا۔

"اچھا، چھاپ لیا پھر؟"

"پھر کیا؟" لوگ پڑھیں گے۔"

"پھر کیا ہوگا؟"

مدنی صاحب کے اس جواب سے مجھے ان کی بے نیازی کا اندازہ ہوگیا۔ لیکن میں نے جب دلائل سے انہیں قائل کیا تو بولے "اچھا نومبر میں دیکھیں گے۔"

دو ماہ بعد! اور وہ بھی دیکھیں گے۔ لاحول ولا قوۃ۔ بارہ سال کی اس صحافتی زندگی میں بھاڑ تو نہیں جھونکی تھی۔ میں نے بھی اپنے صحافتی گر آزمائے۔ لیکن وہ بھی عزیز حامد مدنی تھے۔ کھسکے بھی تو صرف ایک ماہ پیچھے یعنی اکتوبر کے پہلے ہفتے میں۔ خیر صاحب اکتوبر کے پہلے ہفتے میں حاضری دی تو فرمایا۔

"جشن اصلاحات منا رہا ہوں۔ ۲۰ اکتوبر کے بعد۔"

میں نے سوالنامہ انہیں پکڑا دیا کہ آپ اس عرصے میں جوابات لکھ کر رکھئے گا۔ میں ۲۸، ۲۹ اکتوبر کو حاضر ہوں گی۔ شومئی تقدیر اکتوبر کے آخری ہفتے میں بیماری کا حملہ ہوا اور میں مقررہ تاریخ کو بارگاہ مدنی میں حاضر نہ ہو سکی۔ ۳۱ اکتوبر کو پہنچی تو آپ نے فرمایا۔

"غلطی آپ کی ہے۔ میری نہیں۔ آپ مقررہ تاریخ کو تشریف نہیں لائیں لہذا اب تو..."

میں نے بات کاٹ کر کہا "حضور کیا فرق پڑ جائے گا۔ دو دن بعد ہی۔ آپ نے جوابات تو لکھ رکھے ہوں گے۔ وہ عنایت کر دیں۔"

کہنے لگے "خیر جانے دیجئے۔ اور۔ اب آپ اسے چھوڑ ہی دیں۔"

انہوں نے دل میں سوچا ہوگا کہ اس طرح گھبرا کر یہ عاجز آ جائے گی اور پیچھا چھوڑ دے گی۔ لیکن یہاں تو اپنے پیش رو صحافیوں سے یہ سیکھا تھا کہ "صحافی کبھی مایوس نہیں ہوتا" ایک

بزرگ صحافی کا یہ قول بھی مجھے یاد تھا۔

"ایک اچھے صحافی کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اپنے کام میں جب دشواری محسوس کرے تو اس کی تکمیل کے لئے اپنی جد و جہد اور تیز کر دے۔"

چنانچہ طیش کو بالائے طاق رکھ کر میں نے بڑی ملائمت سے کہا۔ "چائے تو میں احتجاجاً نہیں پیوں گی۔ اب آپ فرمائیں کب حاضر ہو جاؤں؟" انہیں بھی اب ہتھیار ڈالتے ہی بنی۔ فرمایا "۱۷ دسمبر کو۔"

چنانچہ ۱۷ دسمبر ۱۹۷۵ء کو میں جا پہنچی۔ آفتِ ناگہانی کو سر پہ دیکھ کر مدنی صاحب حیرت زدہ تھے۔ "آپ واقعی آگئیں۔!"

"جی جناب"۔ میں اب تک کھڑی تھی۔

"تشریف رکھئے۔ تشریف رکھئے۔ میں واقعی ہار گیا۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا "میں نے سوچا تھا کہ آپ ..."

"نہیں آئیں گی۔" میں نے جملہ اچک لیا۔ "لیکن بہرحال اب تو آ ہی گئی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ پہلے چائے تو پیجئے۔" چائے آچکی تھی۔ میں نے کہا۔

"بس جناب! پہلے کام۔ آپ کو علم ہوگا میں پچھلی بار احتجاجاً چائے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔" میں نے قلم نکالا۔

"نہیں صاحب! اب تو ہم نے مان لیا نا۔ آپ صحیح معنوں میں صحافی ہیں۔ بھئی واللہ۔" مدنی صاحب تعریف کرتے رہے لیکن ہاتھ مَل مَل کر۔ اور پھر کہا۔

"لیکن میری بھی ایک شرط ہے۔"

"اب بھی کچھ باقی رہ گیا ہے۔" مجھے الجھن ہونے لگی۔ لیکن وہ نرمی سے بولے۔

"نہیں۔ دیکھئے نا۔ بس اتنی سی بات ہے کہ بجائے سوالات کا جواب دینے کے ہم عصرِ حاضر کی شاعری پہ گفتگو کریں گے۔ جس میں کئی سوالات کے جواب خود ہی آجائیں گے۔"

میں نے اس کو غنیمت سمجھا اور قلم سنبھال کر بیٹھ گئی۔ مدنی صاحب نے جو کچھ کہا وہ پیشِ خدمت ہے۔ اس میں ان کے خیالات کے ساتھ ساتھ ان کے خد و خال دیکھنے کی بھی

کوشش کیجئے اور اگر یہ خدوخال دھندلے نظر آئیں یا سرے سے نظر ہی نہ آئیں تو مجھے موردِ الزام نہ گردانئے۔ مدنی صاحب نے کہنا شروع کیا۔

"عہدِ حاضر کے سارے فکری ماحول کو جن چند آدمیوں نے متاثر کیا وہ، ڈارون، آئن اسٹائن، مارکس اور فرائڈ ہیں۔ عہدِ حاضر جسے ہم اپنی سہولت کے لئے اس صدی کے ۷۵ سال کہہ سکتے ہیں۔ تین سو سالہ دورِ سائنس کا ایک قطعہ ہے۔ یہ تین سو سالہ دورِ سائنس، گلیلیو کی تحقیقات سے شروع ہوتا ہے۔ یہ ارسطو کی فکر کی ایک گمشدہ کڑی تھا۔ ارسطو کی فکر کا بنیادی جز یا عنصر تلاش، اور جستجو تھا، چنانچہ یہ فکر تین سو سال پہلے جب دوبارہ شروع ہوئی تو اس کا مرکز عمل تجربہ گاہیں اور رصدگاہیں تھیں۔ جب اس فکر کے عملی مظاہر کا الحاق معاشرے کی ضرورتوں کو پورا کرنے لگے تو اس کا ایک اندرونی مزاج بھی بننے لگا۔ رفتہ رفتہ اس فکر کی طاقت کو تمام صاحبانِ فکر نے تسلیم کیا۔ اس کے حلقۂ تاثر میں آکر اخلاقی، سیاسی اور معاشی رشتے بدلنے لگے۔ معاشرے کی تنظیم کا ڈھانچہ کچھ اور ہو گیا۔ معاشی تصورات بدل گئے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے گھر سے لے کر میدانِ جنگ تک تمام پرانی روشیں بدل دیں۔ تغیر کے تیز گھومنے والے پہیئے کی گردش نے فرد اور جماعت دونوں کو یکساں متاثر کیا۔

میں نے سوال کیا کہ آپ کی رائے میں اس تغیر نے مشرق کو کسی حد تک متاثر کیا اور ادب میں اس تغیر کا قطعی آغاز کب محسوس ہوا۔؟

مدنی صاحب نے جواب دیا۔

غالباً صدیوں تک مشرقی علوم کے عملی تجربات سے محروم رہنے کے سبب یہ سب چیزیں ہمارے ہاں نسبتاً دیر سے آئیں۔ اسی لئے عام طور پہ یہ کہا ہے کہ عہدِ حاضر کی فکر مغربی ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے کہ اس فکر کی بہت سی بنیادی باتیں علومِ مشرق سے اخذ نہیں کی۔ جدید ادب جنتری کی کسی خاص تاریخ سے شروع نہیں ہوتا۔ غالباً اس کا کوئی ایک مرکز بھی نہیں ہے۔ مگر بالآخر انسانی فکر کی ایک نہ ایک سطح نمائندہ [illegible]

ہے۔ ان میں سے ایک "پیرس" ہے۔ پیرس میں ۱۹۰۹ء میں ایک ادبی ماہنامہ "فگارو" ۲۰ ار ۲۰ فروری کی اشاعت میں وہاں کے ایک شاعر نے ایک مضمون بدلتے ہوئے معاشرے سے متاثر ہوکر لکھا۔ میرانیٹی اور اس کے ہم نواؤں کی فکر میں اس تغیر کی علامتی کیفیات موجود تھیں جو باوجود جغرافیائی اور وقت کے فاصلے کی بنا پر WITMAN اور BAUDLEIR کے ہاں موجود تھی۔ میرانیٹی نے چند بنیادی اشارات اپنے مضمون میں کئے تھے جو ہنوز بہت دلچسپ ہیں اس کا ایک اقتباس ہمارے قارئین کے لئے کچھ نامناسب نہ ہوگا۔

(ترجمہ) "طاقت ورضدی برقیاتی اجرام کے زیر اثر گردلیں اور
سلیجوں کا تموج شبانہ حریص ریلوے اسٹیشن جو دھواں نگل
رہے ہیں اور کارخانے جو اپنے دھوئیں کے بادلوں میں آویزاں
ہیں مجھ سے بہت نزدیک ہیں۔"

۱۹۰۹ء سے ۱۹۶۹ء تک پچاس سال کا عرصہ گذرا ہے۔ میرانیٹی کے نفس مضمون کی مماثلت ان پچاس سالوں کی ادبی اور فکری کیفیت میں ملتی ہے۔ اس سے فرانس، انگلستان، امریکہ، اسپین اور عہد حاضر میں اس برصغیر کی شاعری کا پس منظر جو سائنس اور ٹیکنالوجی کی دنیا کا پیدا کردہ ہے، صاف نمایاں ہے۔ تغیرات کی رفتار بعض جغرافیائی حدود تک پہنچتے پہنچتے نسبتاً آہستہ رو ہو جاتی ہے۔ اس لئے ہماری شاعری میں ایسے فکری عناصر کا اثر جو عہد حاضر کا شعوری اثر نہایت ہی فکر انگیز صورت میں اقبال کے ہاں موجود ہے بہر کیف جدید شاعری دو جنگوں کے درمیان پلنے والی دو مختلف نسلوں کا کارنامہ ہے ان کی عمروں، فکر اور گروہ میں کوئی خطِ فاصل کھینچنا ادوار کے قائم کرنے کا طریقہ تو ہو سکتا ہے لیکن یہ اپنی جگہ درست طریقہ نہیں ہے ایک دور کی فکر دوسرے دور تک پہنچتی ہے دوسرے دور کی فکر اس سے آگے بڑھتی ہے جدید فکر کی فضا سائنس اور ٹیکنالوجی کی دنیا اور شعر و ادب کا ماحول کوئی الگ الگ چیزیں نہیں رہ گئیں ہیں۔ شعری وجدان میں اتنی سکت ہونی چاہیئے کہ وہ ان چیزوں کو اپنے اندر سمیٹ سکے۔ ادب کی یہ ہمہ گیر اور وسعت کوئی نئی چیز بھی نہیں ہے۔ فردوسی کے شاہنامے میں اس کے اپنے دور کی "سلیح جنگ"

کے مختلف اوزار کا تذکرہ ان کا علامتی استعمال اور ان کا سارا ماحول موجود ہے ۔ غالب جب کلکتہ پہنچے تو ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کی بندرگاہ کا ساز و سامان دیکھ کر انھوں نے جو تاثر لیا وہ ان کی تقریظ "آثار الصنادید" میں موجود ہے ۔ ان مثالوں سے مراد یہ ہے کہ معاشرہ اور اس کے قواعد ہر دور میں اس دور کی ایجادات اور انکشافات پر منحصر ہوتا ہے پہلے پہل یہ بات صاحبان فکر کو ذرا بری سی لگی ۔ مگر آج ہر آدمی جانتا ہے کہ زندگی کے بنیادی تصورات کو فزکس نے، ریاضی نے اور کیمسٹری نے بدل دیا ہے ۔ اگر آپ موجودہ اردو شاعری کی طرف آیئے تو ایک دور کو تو آپ کو وہ ملے گا جو اس برصغیر میں اول اول پیدا ہوا ۔ یہ دور عہدِ غالب سے لے کر عہد اقبال تک پھیلا ہوا ہے ۔ سرسید احمد خاں کی بہت سی باتیں ہر چند کہ وہ نسبتاً نرم زبان میں ہیں ۔ آنے والے دور کی طرف اشارہ کرتی ہیں ۔ اس کے بعد کے دور میں جوش ملیح آبادی سامنے آتے ہیں اس دور کے سارے لکھنے والے جن میں مختلف زبانوں اور مختلف عمروں کے لکھنے والے سائنسدان، سیاست داں صحافی سبھی کا مرکزی کام سیاست کے کٹہرے میں تھا ۔ اس دور کے ابتدائی مراحل میں بزرگ شعراء اقبال اور ٹیگور تھے ۔ اور انتہائی مراحل میں ایک ہجوم تھا جس میں ہم سب تھے ۔ اس دور کے درمیانی حصے میں جو راشدؔ اور فیضؔ سے شروع ہوتا ہے اور ہم سب کو ایک قافلے کی صورت میں سمیٹتا ہے ۔ ادب کے مورخین اور نقاد اسے پرکھ سکتے ہیں اس درمیانی دور کے لکھنے والوں کا نصف حصہ دورِ حکمرانی میں تھا اور نصف دورِ آزادی میں اس کے بعد کا دور جو میرے اپنے نزدیک ۱۹۶۸ء میں شروع ہونا چاہیئے ۔ کیونکہ ہمارا عہدِ آزادی اب بیس سال کا ہوا جس کے ساتھ ایک نئی نسل اپنی فکر لے کر سامنے آئی ہے ۔ بالکل نئے لکھنے والوں کی عمر بیس سال کے اندر ہونی چاہیئے ۔ ہم سب ان کی فکر کے منتظر ہیں ۔ اس جگہ میں ایک بار پھر ایک فرانسیسی (جس کو میں جدید شاعری میں مرکزی حیثیت دیتا ہوں) ۔ ایلیچ فائسٹ عہدِ جدید کا ایک بے حد منفرد اور بے مثال شاعر تھا ۔ اگر اسے جدید شاعری کے ہر دور میں یاد کیا جاتا ہے تو اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اس کی فکر نے ہر زبان کے لکھنے والے کو متاثر کیا ہے ۔ اسی شاعر کے چند اشعار پہ میں

سمجھتا ہوں کہ یہ گفتگو تکمیل کو پہنچ جائے گی۔

(ترجمہ) :- "ہم جو ہر جگہ مبہمات کی تلاش کرتے ہیں آپ کے دشمن نہیں ہیں۔ ہماری جدوجہد یہ ہے کہ آپ کو وسیع اور نادیدہ عالموں سے آشنا کریں جہاں آگہی کے ایسے پھول کھلتے ہیں۔ جنہیں ہر شخص چن سکتا ہے۔

جہاں ان دیکھے رنگوں کی جوت چمکتی ہے جہاں ہزاروں ناقابلِ تسخیر پیکروں کا ہجوم ہے۔ جنہیں حقیقت کا روپ دینا ہے۔

ہم سے ہمدردی کرو! ہم جو ہمیشہ "نامحدود" اور مستقبل کی سرحدوں پہ برسرِ پیکار ہیں۔

ہم سے ہمدردی کرو۔ ہماری بھول اور ہمارے گناہ۔

"تمہاری ہمدردی کے مستحق ہیں"

اس تعارف کے آخر میں اتنا اور بتا دوں کہ میرا نیٹی کے مضمون کے اقتباس اور اپولونائر کے اشعار کا خوب صورت اور دل کی گہرائیوں تک اتر جانے والا ترجمہ جناب عمر مہاجر نے وہیں بیٹھے بیٹھے منقوش میں کر دیا۔ میں اس کے لئے ان کی شکر گزار ہوں۔ عزیز حامد مدنی ریڈیو پاکستان اسلام آباد سے وابستہ ہیں۔ ان کے طبع شدہ مجموعہ کلام کا نام 'دشتِ امکاں' ہے۔ 'نخلِ گماں' ان کے زیرِ طبع مجموعے کا نام ہے۔

عزیز حامد مدنی کا سن پیدائش ۱۹۲۴ء ہے۔

عزیز حامد مدنی

عکسِ فن

فراق سے بھی گئے ہم وصال سے بھی گئے
سبک ہوئے ہیں تو عیشِ ملال سے بھی گئے

زندہ دلانِ شوق نے رکھا بہار نام
اک موجِ خوں گئی سرِ گلزار دیکھتا

نہ فاصلے کوئی نکلے، نہ قربتیں نکلیں
وفا کے نام سے کیا کیا سیاستیں نکلیں

تمام منظرِ کون و مکاں ہے بے ترتیب
یہ تیری جلوہ نمائی کا وقت ہے کہ نہیں

شکر و سپاس کا مزہ، دے ہی گیا سکوتِ یار
وصل و فراق سے الگ درد کے حوصلے گئے

ختم ہوئی شبِ وفا، خواب کے سلسلے گئے
جس درِ نیم باز کے پیش تھے مرحلے گئے

مصطفیٰ زیدی



قبائے ساز
کوہ ندا
روشنی
گریباں
زنجیریں
موج مری صدف صدف

پیدائش سنہ ۱۹۳۰ء
وفات سنہ ۱۹۷۰ء

پھر ہوا یہ کہ اسی آگ کی ایسی رَو میں
ہم تو جلتے تھے مگر اس کا نشیمن بھی جلا
بجلیاں جس کی کنیزوں میں رہا کرتی تھیں
دیکھنے والوں نے دیکھا کہ وہ خرمن بھی جلا
اس میں اک یوسفِ گم گشتہ کے ہاتوں کے سوا
اک زلیخائے خود آگاہ کا دامن بھی جلا

پھر ہوا یہ کہ اسی آگ کی جیسی رو میں
ہم تو جلتے تھے مگر اس کا نشیمن بھی جلا
بجلیاں جس کی کنیزوں میں رہا کرتی تھیں
دیکھنے والوں نے دیکھا کہ وہ خرمن بھی جلا
اس میں اک یوسف گم گشتہ کے ہاتوں کے سوا
اک زلیخائے خود آگاہ کا دامن بھی جلا

مصطفیٰ زیدی
جہلم
۹/۱۲
۷۰

مصطفیٰ زیدی

یہ ۱۹۶۹ء کی بات ہے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ جن کی راتیں خنک ہوا کرتی ہیں۔ کراچی ٹیلیویژن کی جانب سے آرٹس کونسل میں ایک کل پاکستان مشاعرہ تھا۔ معلوم ہوا کہ مصطفیٰ زیدی بھی تشریف لا رہے ہیں۔ انہی دنوں میں شعراء کی سوانح لکھ رہی تھی۔ یہ سوانح انٹرویو فارم میں ہوتی تھیں۔ ان دنوں بہت چاہا کہ لاہور پہنچوں تاکہ جن ممتاز شعراء سے ملاقات نہ ہو سکی ان کی خدمت میں حاضری دے کر اپنی تحریر مکمل کروں لیکن عدیم الفرصتی نے مجھے اجازت نہ دی جن شعراء سے مشاعروں میں ملاقات ہو جاتی تھی میں وہیں سے ان کے بارے میں ان سے معلومات حاصل کر لیتی۔ مصطفیٰ زیدی مرحوم سے جب ٹی وی کے مشاعرے میں ملاقات ہوئی تو مشاعرہ شروع ہونے سے قبل اور چائے کے وقفے میں ان سے گفتگو ہوئی۔ ان دنوں وہ ڈپٹی سیکریٹری بنیادی جمہوریت کے عہدے پر فائز تھے۔ یہ یحییٰ خان سابق صدر پاکستان کا دور تھا۔ بہت سے سرکاری افسران کے لئے حالات ناسازگار تھے۔ مصطفیٰ بھی انہی میں سے ایک تھے... لیکن ان کی گفتگو اور طرزِ عمل سے کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ کس دور سے گذر رہے ہیں۔ میں نے اس چھوٹی سی ملاقات میں ان سے چند سوالات کئے ان میں سے ایک سوال یہ تھا کہ "سرکاری ملازمت کے بعد آپ کے شعر کہنے کی رفتار کچھ سست پڑ گئی ہے۔ کیوں؟" وہ جواب میں ایک لمحے کی تاخیر کئے بغیر بولے۔

"ایسا تو نہیں ہے۔ رفتار اتنی مدھم نہیں لیکن شاعری کس لئے کی جائے۔ دراصل"

میں شاعری اور سرکاری ملازمت دونوں ہی شعبوں میں اپنے آپ کو ناموزوں سمجھتا ہوں۔ شاعر کا ایک حلقہ ہوتا ہے نا۔ میرا کوئی حلقہ نہیں۔ میرے چند احباب ہیں جو اگر شاعر نہ ہوتے تو بھی میرے دوست ہوتے۔ اسی طرح افسری کے معاملے میں بھی اکھڑ سمجھا جاتا ہوں۔ ان معنوں میں کہ محدود حلقہ رکھتا ہوں۔ سو پھر یہ گاڑی چلے تو کیسے۔ میں اپنے افسران بالا اور ہم نشین افسران کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر شعر سناتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے جیسے یہ ایک مجبوری ہے۔ جیسے ان کے ذوقِ تفریح کی تسکین کا باعث بن رہا ہوں۔ اور اکثر شعراء نے مدعو کیا تو محسوس ہوا کہ وہ شاعر مصطفیٰ کو نہیں افسر مصطفیٰ زیدی کو مدعو کر رہے ہیں،

"اس مشاعرے کے بارے میں کیا کہیں گے۔ جس میں آپ شریک ہیں"

"یہ سرکاری مشاعرہ ہے۔ یہاں نہ کسی افسر نے مدعو کیا ہے نہ کسی شاعر نے۔ اس لئے آپ سے اتنی باتیں بھی ہو رہی ہیں۔ ویسے میں نے شعر کہنا تقریباً چھوڑ دیئے۔ بس اب جو شاعری ہو رہی ہے وہ صرف اور صرف اپنی ذات کے لئے ہے"

"محض اس بناء پہ آپ شاعری ترک کئے ہوئے ہیں؟

"نہیں۔ اور بہت سی وجوہ ہیں۔ پھر کبھی کسی ملاقات میں پوچھ لیجئے گا" میری پھر ان سے ملاقات تو نہ ہوئی لیکن مصطفیٰ زیدی نے اپنی آخری مجموعے "کوہ ندا" میں میرے اس سوال کا جواب دے دیا۔ وہ لکھتے ہیں" RECOGNITION (شناخت) کے بغیر ہمیشہ ہمیشہ شعر کہتے رہنا ناممکن ہے۔ میں نے کئی ایسے شعراء سے زیادہ ذہنی شعر کہے ہیں جنہیں ناقدوں نے RECOGNISE کیا ہے۔ یقیناً میری ذات یا میرے شعر یا دونوں میں کوئی ایسا عیب ہے جو اسے قابلِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ دس پندرہ سال جھک مارنے کے بعد جب میں نے وزیر آغا کی شاعری پہ ایک دبیز کتاب دیکھی جس میں چھوٹے سے چھوٹے شاعر کا ذکر تھا لیکن میرا نام تک نہ تھا تو میرا دل ٹوٹ گیا۔ فیروز سنز نے بھی اس نوعیت کی جو کتابیں شائع کی ہیں ان میں بھی یہی صورتِ حال ہے جب دس پندرہ سال کی شاعرانہ بادیہ پیمائی کا

یہ نتیجہ ہے تو آئندہ کس کے لئے شعر کہے جائیں اور ان کی کیا ضرورت ہے ۔ میرے ملک کے معاشرے میں اپنے جامد نظریئے کے علاوہ کسی اور نظریئے کو قبول کرنا تو کیا برداشت کرنے تک کا ظرف نہیں ہے ۔ جوش ملیح آبادی جیسے جیّد عالم اور کبیر شاعر یہاں حکومت اور عوام دونوں کے ہاتھوں ذلیل ہوتے رہے ہیں ۔ میں اور میرے تمام ہم عصر ان کے قدموں کی خاک بھی نہیں ۔ لہذا جب معاشرہ ایک فرد کو قبول نہ کرے اور فرد اس معاشرے سے مصالحت پہ آمادہ نہ ہو تو شعر لکھتے رہنا جیسی عبث اور فضول کوئی اور بات نہیں ہو سکتی اور بالخصوص جب ملک کا مذہبی نظریہ کاٹ کھانے کو دوڑتا ہوا دکھائی دے تو خودکشی یا فرار کے سوا ایک ہی چارہ اور رہ جاتا ہے کہ قصائیوں کی چھریوں سے خود کو ذبح کرانے کے لئے ہر وقت تیار رہا جائے ۔"

میں نے ان سے ایک سوال اور کیا تھا کہ "کامیاب شاعری داخلی اثرات کا نتیجہ ہوتی ہے یا خارجی ؟"

مصطفےٰ زیدی بولے ۔ کامیاب شاعری محض ذاتی اندرونی یا جذباتی واردات کی تفسیر نہیں ہوتی ۔ یہ خارجی اثرات بھی بھرپور انداز میں قبول کرتی ہے ۔ ہر دو صورت میں تحقیق اور کسب علم خاص طور پہ سائنسی اور فلسفیانہ علم کی آنچ اتنی پہنچی ہو کہ ہر جذبہ تربیت یافتہ ہو جائے اور ہر وجدانی کیفیت پہ مجذوب کی بڑ کا گمان نہ ہو ۔"

"آپ کی شاعری کس سے متاثر رہی ہے ۔۔۔ ؟"

"غالبؔ فراقؔ جوشؔ اور خود اپنی ذات سے ۔"

یہ خود پسند شاعر جس کا پورا نام سید مصطفیٰ حسین زیدی تھا ابتدا میں تیغ الہ آبادی تخلص کرتے تھے ۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو الہ آباد میں پیدا ہوئے ۔ بچپن سے ہی نہایت ذہین اور مطالعے کے گرویدہ تھے ۔ ۱۹۴۶ء میں میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا کرسچن کالج سے ۱۹۴۸ء میں انٹرمیڈیٹ بھی فرسٹ کلاس پاس کیا ۔ فرسٹ ایئر میں سارے کالج میں اول رہے اور اسکالرشپ حاصل کیا ۔ ۱۹۵۰ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے

کیا اور چھٹی پوزیشن حاصل کی۔ ایم اے پریویس کرنے کے بعد پاکستان ہجرت کر کے آگئے اور پھر ۱۹۵۲ء میں لاہور کے گورنمنٹ کالج سے انگریزی میں ایم اے کیا۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد اسلامیہ کالج کراچی اور پھر پشاور یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد رہے۔ ۱۹۵۴ء سول سروس کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔ ۱۹۵۶ء میں انگلستان سے تربیت حاصل کرنے کے بعد تمام یورپ اور مشرق وسطیٰ کا سفر کیا۔ پھر سیالکوٹ، ڈیرہ غازی خان اور مری میں اسسٹنٹ کمشنر کے طور پر تعینات رہے۔ کچھ عرصہ لاہور میں ڈپٹی سکریٹری تعلیمات کے طور پر بھی گزارا۔ حکومت پاکستان نے اعلیٰ کارکردگی کے سلسلے میں تمغۂ قائد اعظم دیا۔ ۱۹۶۲ء میں نیفلڈ اسکالرشپ پر مزید تربیت کے لئے لندن گئے ۱۹۶۹ء میں ڈپٹی سکریٹری بنیادی جمہوریت مقرر ہوئے۔ دسمبر ۱۹۶۹ء میں ہی ملازمت سے معطل ہوئے اور مئی ۱۹۷۰ء میں برطرف کر دیئے گئے۔ برطرفی کا فیصلہ سن کر مصطفیٰ نے اپنی ڈائری میں تحریر کیا۔

"۱۴ سال کی سرکاری ملازمت کے بعد برطرف کر دیا گیا۔ آزادیٔ عہد نو مبارک ہو"

۱۴ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو سیالکوٹ میں مصطفیٰ نے جرمن نژاد خاتون ویرا خان سے شادی کی۔ ویرا نے مذہب اسلام اختیار کیا تھا۔ ۱۹۵۸ء اور ۱۹۶۰ء میں پہلے بیٹا پھر بیٹی پیدا ہوئے۔ بیٹے کا نام اپنے بھائی کے نام پر مجتبیٰ رکھا تھا۔ جن کا ۱۹۵۸ء (ایران) میں کار کے حادثے میں انتقال ہوا تھا۔ بیٹی کا نام عصمت تھا۔ مصطفیٰ زیدی کے بچے اپنی ماں کے ساتھ جرمنی میں تھے۔ مصطفیٰ خود جرمن جانا چاہتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے چند ماہ میں جرمن زبان سیکھ لی۔ پھر اچانک وہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو اپنے گھر میں جہاں وہ رہتے تھے شہناز سلیم کے ساتھ بے ہوش پائے گئے۔ بعد میں شہناز تو بچ گئیں لیکن مصطفیٰ زیدی جانبر نہ ہو سکے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے خودکشی کی یا شاید انہیں قتل کر دیا گیا۔ جو بھی ہوا بہر حال اس المیے نے ایک ذہین شاعر کو وقت۔

قبل مار ڈالا۔ چالیس سال کی عمر میں ان کے چھ شعری مجموعے "زنجیریں ۱۹۴۹ء" روشنی ۱۹۵۰ء شہر آذر ۱۹۵۸ء موج مری صدف صدف ۱۹۶۰ء گریباں ۱۹۶۴ء اور قبائے ساز ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئے۔ کوہِ ندا ان کی نظموں کا آخری مجموعہ ہے۔

اصنافِ سخن میں زیدی کی طبیعت نظم پر مائل تھی۔ لیکن غزل کے بھی رسیلے تھے۔ کہتے تھے میں غزل کی نیم نگاہی کا نہ صرف قائل بلکہ گھائل ہوں۔ حد یہ ہے کہ "میں نے جوش جیسے کٹر او رغزل سے متعصب نظم گو کو غزلوں کا مجموعہ شائع کرنے پر آمادہ کرلیا ہے ..."

مصطفےٰ زیدی نے شاعری کے علاوہ کئی روگ اور بھی پال رکھے تھے۔ فوٹو گرافی کا شوق انتہا حد تک تھا اور چھوٹے ہوائی جہازوں کو اڑانے کا جنون بھی۔ پھر فوٹو گرافی کا شوق ہوا تو کئی برسوں تک اس موضوع پر ہر نوع کی کتابیں کھنگال ڈالیں اور جب طبیعت اکتا گئی۔ تو پھر رجحان کی باگ دوسری طرف موڑ لی۔ مصطفےٰ زیدی کی انتہا پسند طبیعت نے انہیں کبھی سکون سے نہ رہنے دیا۔ یہ کیفیت ان کے کلام میں بھی نظر آتی ہے۔
یہ انتہا پسندی شاید ان کی انتہائی ذہانت کے غلط استعمال ہی کا نتیجہ تھی۔

مصطفٰی زیدی

عکسِ فن

بڑے خلوص سے احوال پوچھنے کے لئے
گذر گئی شبِ فرقت تو میرے یار آئے

کچھ میں ہی جانتا ہوں جو مجھ پر گذر گئی
دنیا تو لطف لے گی میرے واقعات میں

ہم سے پہلے کبھی یہ مرتبۂ دار نہ تھا
عشق رسوا تھا مگر یوں سرِ بازار نہ تھا

سب نے اس کے حکم پر سجدے کئے
ہم اکیلے رہ گئے انکار میں

دنیا کی بے اصول عداوت تو دیکھئے
ہم بوالہوس بنے تو وفا عام ہو گئی

کیا کیا رہے ہیں حرف و حکایت کے سلسلے
وہ کم سخن نہیں تھا مگر دیکھنے میں تھا

منظر ایّوبی



پیدائش ۱۹۳۲ء

منظر ایوبی

مارچ ۶۷ء کی بات ہے۔ ٹنڈو آدم میں ایک مشاعرہ تھا۔ ہاں وہ واقعی مشاعرہ تھا بالکل روایتی انداز میں۔ جہاں سامعین ہر اچھے شعر پر کھل کر داد دے رہے تھے اور ناپسندیدہ اشعار پر خاموشی اختیار کر لیتے۔ یہی وہ ماحول ہوتا ہے جہاں شعراء شعری کیفیت میں ڈوب کر شعر پڑھتے ہیں اور تب کہیں جگر کی اور کبھی فانی کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ اس مشاعرے میں خیرپور کا ایک شاعر جب اسٹیج پر آیا تو زنان خانے میں دبی دبی سرگوشیوں نے سر اُبھارا۔ میرے قریب خیرپور اسکول کی ایک معلمہ بیٹھی تھیں۔ اور بہ حالت اضطراب کبھی ادھر پہلو بدلتیں کبھی ادھر۔ غالباً وہ کوئی فرمائش بھیجنا چاہتی تھیں لیکن چق کے پیچھے سے آواز لگائیں تو کیونکر؟

میں نے مشورہ دیا "ایک کاغذ پر فرمائش لکھ کر بھیج دیں"

دل شکستہ ہو کر بولیں "قلم نہیں ہے"

"میں نے قلم پیش کیا۔ انہوں نے فرمائش لکھی۔ اور چق کے پیچھے بھجوادی۔

شاعر موصوف اس وقت یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

سنگ کیا چیز ہے سولی پہ بھی نیند آجائے

تم جو دامن کی ہوا دے کے سلانا چاہو

مردانے میں داد کے ڈونگرے برس رہے تھے اور زنان خانے میں دبی دبی مسکراہٹوں

کے درمیان ہلکی ہلکی واہ واہ ۔ البتہ معلمہ صاحبہ داد دینے کے معاملے میں بہت پُر جوش نظر آ رہی تھیں ۔ اس " ہائے وائے " سے میں بھی لطف اندوز ہو رہی تھی ۔ غزل ختم ہوئی تو شاعر موصوف کے ہاتھ میں فرمائش تھما دی گئی ۔ اور بتایا گیا کہ یہ زنان خانے سے آئی ہے شاعر موصوف کا منہ بگڑ گیا ۔

" اونہہ نہیں بھئی ۔ یہ نہیں ہم دوسری سنا رہے ہیں "

خاتون معلمہ کے چہرے پر ناگواری کے شدید اثرات نمایاں ہوئے ۔ اس سے بے نیاز شاعر موصوف غزل پڑھتے رہے ۔ لیکن میرے کانوں میں تو پہلی غزل کی آواز گونج رہی تھی ؂

پردۂ ساز نہیں ہوں کہ جسے چھیڑ کے تم
اپنی آواز سے آواز ملانا چاہو

جانے غزل کب ختم ہوئی مجھے تو احساس اس وقت ہوا جب خاتون برقعہ اوڑھ کر دروازے سے باہر نکل رہی تھیں ۔

" ارے آپ جا رہی ہیں ؟ "

" ہاں ۔ بس اب جی نہیں چاہتا ۔ صبح جلد اٹھنا ہے ۔ اسکول بھی جانا ہے ۔ اس وقت بلاشبہ میں نے بھی شاعر موصوف کو دل ہی دل میں بہت بُرا بھلا کہا ۔ اور مشاعرے کے اختتام پر جب بالمشافہ ان سے گفت گو ہوئی تو انہوں نے راز کی بات یہ بتائی کہ ایک بار ایک خاتون کی فرمائش پر یہ غزل سنائی تھی ؂

دل نوازی کے وہ انداز نہیں ہیں نہ سہی
دوستی رسم سمجھ کر ہی نبھائیں آؤ

تو دو روز تک گھر میں فاقہ کرنا پڑا تھا ۔ چنانچہ اس دن سے توبہ کر لی ہے کہ کبھی کسی خاتون کی فرمائش پر غزل نہیں سنائیں گے (ویسے ہمیں اس واقعے کی صداقت پر اعتبار نہیں) ۔

وہ شاعر موصوف کون تھے پتہ ہے آپ کو ؟ یہی جناب منظرؔ ایوبی ۔ جن کی زندگی ایسے ایسے نہ جانے کتنے ہی دلچسپ شاعرانہ واقعات و حادثات سے بھری پڑی ہے لیکن خوف کی

وجہ سے حضرت سنانے پر آمادہ نہیں ۔

جغرافیائی حالات ہی کہ بدایوں (روہیلکھنڈ ۔ یوپی) جہاں کے پیڑے مشہور ہیں وہیں ۱۹۳۲ء میں پیدا ہوئے ۔ صبر ایوبی جنم لیتے ہی پایا تھا ۔ چنانچہ عزیز احمد ایوبی کے نام سے پکارے جانے لگے ۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی ۔ ۱۹۴۸ء میں میٹرک اور ۱۹۵۰ء میں اسلامیہ کالج بدایوں سے انٹر کامرس کا امتحان پاس کیا ۔ ۱۹۵۰ء میں ہی شادی بھی ہوگئی اور ہجرت بھی ۔ چنانچہ پاکستان آکر ملازمت بھی کی اور ۱۹۵۲ء میں اُردو فاضل کا امتحان بھی دے ڈالا ۔ ۱۹۵۵ء میں اردو کالج کراچی سے بی کام کیا اور ۱۹۵۹ء میں کراچی یونیورسٹی سے اردو میں ایم ۔ اے کی ڈگری لی ۔ موسیقی کا ذوق ورثے میں ملا تھا ۔ چنانچہ طبیعت کا شعر گوئی کی طرف مائل ہونا لازمی تھا ۔ پھر شہر کے ادبی ماحول نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا ۔ چونکہ زمینداروں کے ایک متوسط خاندان میں پیدا ہوئے تھے لہٰذا بچپن سے ہی زمینداروں کو غریب کسانوں اور مزدوروں پر ظلم کرتے ہوئے دیکھا تھا ۔ مظلوم کے لئے ہمدردی کے جذبات تو بچپن سے ہی دل میں تھے ۔ ہوش سنبھالا تو دل میں زمینداروں اور جاگیرداروں کے خلاف نفرت کا بیج جڑ پکڑ چکا تھا ۔ طالب علمی کے ابتدائی دور کے کلام میں یہ رنگ نمایاں ہوا گھر والوں سے چوری چھپے شاعری ہوتی رہی لیکن والد صاحب کے انتقال کے بعد گھر والوں پر جب ان کی شعر گوئی کا راز کھلا تو مزدوروں اور کسانوں کی حمایت میں لکھی ہوئی نظمیں نذرِ آتش کر دی گئیں ۔ البتہ روایتی غزلیں کہنے کی اجازت مل گئی ۔ منظر تخلص رکھا ۔ باقاعدہ شرفِ تلمذ تو کسی سے حاصل نہیں کیا ۔ البتہ اپنے ماموں غلام عارف ایوبی سے ابتدائی کلام پر اصلاح لی اور علم البیان اور علم العروض کے نکات سمجھے ۔ جامعہ کراچی کے شعبہ اُردو کے صدر جناب ڈاکٹر ابواللیث صدیقی سے خاص طور پر اکتسابِ فیض کیا ۔ نظم کے علاوہ نثری تخلیقات میں طنزیہ و مزاحیہ سات عدد ڈرامے بھی لکھ چکے ہیں ۔ چند تنقیدی مضامین کچھ ادبی شخصیتوں کے خاکے اور ریڈیائی فیچرز بھی لکھے ہیں ۔

میں نے ان سے پوچھا " کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ ٹکسال اور سکہ بند اردو کا حلیہ تیزی سے بگڑتا جا رہا ہے ؟ "

سوال سن کر میرا منہ تکنے لگے۔

میں نے دوسرا سوال کیا: "کیا موجودہ نصاب کی کتابیں اور اساتذہ اس کے ذمہ دار ہیں۔"

وہ پھر بھی چپ رہے، واضح ہو کہ منظر ایوبی خیرپور گورنمنٹ کالج میں معلم تھے۔ لہذا ان سوالات کے جوابات اپنے تجربے کی روشنی میں بہتر طور پر دے سکتے تھے۔ لیکن ان کی چپ دیکھ کر میں نے اُردو شعر و ادب کی ترقی کے لئے تجاویز پیش کرنے کو کہا۔

بولے۔ "زباں بند رہنے دیجئے۔"

میں نے کہا تو پھر آپ اپنا ایک شعر تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ سن لیجئے۔

؎ چھن گئی تجھ سے تری طاقتِ گفتار اگر

تیرے ہاتھوں میں ابھی لوح و قلم باقی ہے

حضرت جواب میں "آمین" کہہ کر رہ گئے۔

"اچھا یہ بتائیے شاعری میں "جدیدیت" سے آپ کی کیا مراد ہے کیونکہ آج کل یہ فقرہ عام ہے۔"

بڑی سہل اور مختصر سی تعریف انہوں نے یہ پیش کی۔

"میرے نزدیک جدیدیت کے معنی نئی اقدار کی تشکیل، موضوع، ہیئت اظہار اور ابلاغ کے تجربے ہیں۔ میں شاعری میں جدیدیت کو پسند کرتا ہوں لیکن اس سے کلام میں ابہام پیدا نہیں ہونا چاہیئے۔"

آزاد شاعری کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"یہ اصنافِ سخن میں یقیناً ایک اضافہ ہے لیکن میری نغمہ پسند طبیعت ساز و آہنگ کو شعر کی روح سمجھتی ہے۔ یہ صنف سخن میرے مزاج اور طبع سے قطعاً لگاؤ نہیں کھاتی آزاد شاعری میں نغمگی اور آہنگ کی محض ایک ہلکی سی جھلک پائی جاتی ہے۔"

منظر ایوبی بیسویں صدی کی شاعری کو شعر و سخن کی ترقی کے لئے ایک نیک فال تصور کرتے ہیں کہ یہ صدی ہنگاموں، شورشوں حادثوں اور انقلابات کے اعتبار سے اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ اس دور میں جتنی تیزی سے انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں تبدیلیاں ہوئی

ہوئی ہیں، اور سائنس کی نئی ایجادات علوم و فنون کی ترقی، مختلف سیاسی و سماجی اقدار کا ٹکراؤ اور متضاد فکری نظاموں کا تصادم ایک ادیب شاعر اور فن کار کے قلم میں نئی روح پھونکنے کا باعث ہے بشرطیکہ فن کار خود اپنی ذمہ داری صحیح معنوں میں محسوس بھی کرے۔ شاعری میں پرانی علامات کے استعمال پر اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ پرانی علامتوں کو بطور روایت ضرور استعمال کیا جائے لیکن مفاہیم کے ساتھ کیونکہ ایک ہی قسم کی علامتوں کا مسلسل استعمال ہر زمانے میں کیا جائے تو وہ اپنی افادیت کھو بیٹھتی ہیں لیکن نئے مفاہیم کے ساتھ پیش کرنے کے لئے ضروری ہے کہ شاعر ان علامتوں کے محل استعمال پر قدرت رکھتا ہو جدید اردو شاعری میں ایسی بیسیوں پرانی علامتیں مستعمل نظر آتی ہیں۔ جو پرانی ہونے کے باوجود زندگی کی موجودہ کشمکش اور انسانی اعمال و افعال کی ترجمانی کرتی ہیں۔ غزل میں نئے تجربے بھی ضروری ہیں لیکن غزل کے مخصوص مزاج اس کی تکنیک اور فارم اس کی صدیوں کی پرانی روایات کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ ان سے بے تعلق رہ کر غزل میں کسی قسم کا کوئی تجربہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ میرا ایک شعر اسی سے متعلق ہے۔

؎ موضوع فکر روح رہی یا بدن رہا
پیش نظر ہمیشہ تغزل کا فن رہا

منظر کی منتخب غزلوں نظموں اور گیتوں کا ایک مجموعہ "بارش سنگ" زیر طبع ہے توقع ہے کہ جلد ہی ان کے پڑھنے والوں تک یہ کتاب پہنچ جائے گی۔ منظر ان دنوں کراچی میں جامعہ ملیہ ملیر میں شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں۔

منظر ایوبی

عکسِ فن

ایک در بند ہوا ہے تو کوئی بات نہیں
اور بھی در ہیں اگر سر نہ جھکانا چاہو

وہی رہ گذر کہ جس میں کبھی کارواں لٹا تھا
مجھے کیا خبر کہ کب سے مری راہ تک رہی ہے

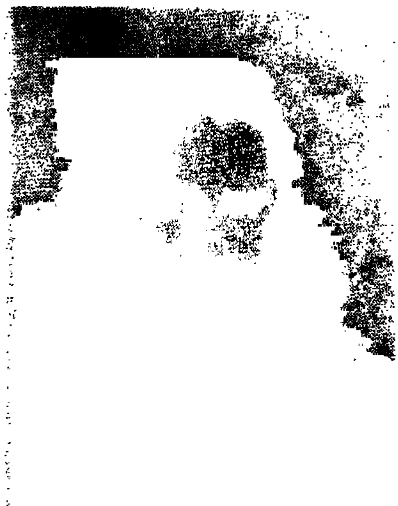
چھوڑ کر سایۂ کوچۂ گل رُخاں
اس کڑی دھوپ میں آ گئے ہم کہاں

دیدہ و دل لہو کریں، کس کے لئے غزل کہیں
شہر میں اک ترے سوا کون سخن شناس ہے

بڑے خلوص سے دنیا کرے گی یاد ہمیں
جہاں میں پیار کے کچھ بیج بو گئے ہم بھی

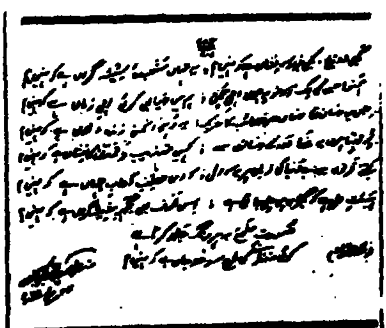
صبحِ چمن کے نغمہ سراؤں کو کیا خبر
پروردگارِ فصلِ بہاراں رہے ہیں ہم

منظر صدیقی اکبرآبادی



پیدائش ۱۹۱۰ء

وفات ۱۹۷۱ء



منظر صدیقی

شمشاد حسین نام۔ منظر تخلص، اکبرآباد وطن پیدائش سنہ ۱۹۱۰ء میں کانپور میں ہوئی۔ بچپن پہلے اجمیر اور پھر آگرے میں گذارا۔ ابتدائی تعلیم یتیم خانے کے مدرسہ میں پائی۔ نو سال کی عمر میں قرآن شریف ختم کر لیا۔ پھر شاہجہانی مسجد میں عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ شعیب محمدیہ ہائی اسکول آگرہ اور اینگلو ورنیکلر ہائی اسکول ٹونڈلہ سے میٹرک کیا۔ اس زمانے میں ان کے والد حضرت سیماب اکبرآبادی کا سارے ہندوستان میں طوطی بول رہا تھا۔ تلامذہ کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ شاگردوں کے اصرار پر سیماب صاحب زیادہ تر سفر میں رہتے ایک بار شمشاد حسین بھی ساتھ تھے۔ کانپور میں راز چاندپوری کے ہاں قیام تھا۔ وہاں راز صاحب نے سیماب صاحب سے دریافت کیا۔

"کیا یہ بھی شعر کہتا ہے؟"

"اجی یہ کیا کہے گا..." سیماب صاحب نے جواب دیا۔ حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ یہ حضرت چھپ کر شعر کہنے لگے تھے۔ البتہ والد صاحب کو دکھانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔

جب سیماب صاحب نے یہ بات کہی تو راز صاحب نے شمشاد میاں کی واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر بہت سے سلے ہوئے کاغذ نکال لئے۔ ان پر متفرق اشعار درج تھے اور سات آٹھ شعر کی ایک غزل بھی تھی۔ راز صاحب نے یہ غزل سیماب صاحب کے سامنے پیش کر دی۔ شمشاد میاں دل میں ڈر رہے تھے کہ اب کان کھینچے جائیں گے لیکن سیماب صاحب

غزل پڑھ کر مسکرائے اور رازؔ چاند پوری، ساغرؔ نظامی اور دوسرے تلامذہ کے سامنے اس غزل پر اصلاح دی اور فرمایا:-

"میاں شعر کہنے کا شوق ہے تو ضرور کہا کرو۔"

بس پھر کیا تھا۔ اسی وقت مٹھائی، ہار پھول اگر بتیاں وغیرہ آگئیں۔ استاد داغؔ کی روح کو ایصال ثواب کے بعد مٹھائی تقسیم ہوئی اور بیٹا باپ کا باقاعدہ شاگرد بن گیا۔ طوبیٰ تخلص تجویز ہوا کچھ دیر بعد سب لوگ مولانا حسرتؔ موہانی سے ملاقات کے لئے بساطی بازار گئے تو راستے میں حضرت سیمابؔ نے کہا کہ بھئی اپنے لئے بیاض خرید لو۔ ان کے شاگرد نیترؔ چاند پوری نے بڑے سائز کی ایک بیاض خرید دی جو منظرؔ کی زندگی تک ان کے پاس رہی۔

حسرتؔ موہانی سے سب کا تعارف کرانے کے بعد ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا۔

"اور یہ ہیں صاحبزادہ طوبیٰ اکبر آبادی خلف اکبر مولانا سیمابؔ اکبر آبادی۔"

اس پر مولانا حسرتؔ موہانی نے خوش ہو کر پاس بلایا۔ غزل سنی اور دعا دی کہ خدا تمہارے باپ کی طرح تمہیں بھی نامور شاعر بنائے۔"

آٹھ دس مشاعرے پڑھنے کے بعد ایک روز انہوں نے ساغرؔ نظامی سے کہا کہ مجھے طوبیٰ تخلص پسند نہیں۔ مولانا سے کہہ کر تخلص بدلوا دیجئے۔ ساغرؔ نظامی نے کہا میاں تمہیں کون سا تخلص پسند ہے؟ انہوں نے جواب دیا مجھے تو منظرؔ پسند ہے۔ بس یہ تخلص طے ہو گیا دوبارہ مٹھائی آئی اور طوبیٰ اکبر آبادی، منظرؔ اکبر آبادی بن گئے۔ انہوں نے پہلا مشاعرہ ٹونڈلہ میں اپنے اسکول میں پڑھا۔ غزل کے دو شعر ہیں۔

؎ فطرت کی گرمیوں نے سراپا جلا دیا
دل بھی دیا خدا نے تو بجلی بھرا دیا
جب دل جلوں نے اس کو پیام وفا دیا
اس نے وفا کا نام لکھا اور جلا دیا

ستمبر ۱۹۳۳ء میں سیمابؔ صاحب نے قصرالادب آگرہ کی بنا ڈالی برصغیر میں ادبی قسم کا اس سے زیادہ بڑا فعال اور کارگزار ادارہ آج تک قائم نہیں ہوا ادارے کا سارا دفتری

کام منظر صدیقی سنبھالتے تھے۔ اسی ادارے کے تحت دار الترجمہ اور دار الاصلاح قائم ہوئے ماہنامہ، پیمانہ، ہفتہ وار تاج، ثریا، شاعر، کنول، مشورہ، ایشیا وغیرہ متعدد پرچے شائع ہوئے ہفتہ وار ایشیا مسلسل پندرہ برس جاری رہا ان سب کی ادارت اور دوسرے انتظامی امور انہی کے سپرد تھے سیماب صاحب تو زیادہ تر باہر کے دوروں پر رہا کرتے تھے۔

یکم مارچ ۱۹۵۱ء کو منظر پاکستان آ گئے لیکن افسوس ہے کہ ان کے طویل تجربے سے یہاں کسی نے فائدہ نہ اٹھایا

منظر صدیقی اکبر آبادی کا خیال تھا کہ ترقی پسند ادب ایک فریب ہے یہ رائے خود علامہ سیماب کی بھی تھی یہ الگ بات ہے کہ اس دور کے بعض چوٹی کے ترقی پسند شعراء سے ان کے بیٹے مخلصانہ تعلقات تھے۔ اردو ادب میں جمود کا منظر صدیقی کو گہرا احساس تھا اور یہ شکایت بھی تھی کہ شعراء کی نئی نسل کو زبان کی صحت اور فن کا خیال نہیں ہے اردو شاعری کئی صدیوں کے ارتقا کے بعد نکھر کر اس روپ میں سامنے آئی ہے ان طویل روایات کے جو لوگ وارث ہیں ان سے زبان اور فن سیکھے بغیر جو لوگ قلم اٹھاتے ہیں وہ ادب اور زبان کی صحیح خدمات انجام نہیں دے سکتے۔

منظر صدیقی نے بلا مبالغہ ان گنت مضمون، افسانے اور ڈرامے وغیرہ بھی لکھے ایک زمانے میں وہ برصغیر کے نہایت زود گو شعراء میں شمار کئے جاتے تھے ان کی ایک کتاب "عام فہم عروض" کے تین ایڈیشن ہندوستان میں شائع ہو چکے ہیں۔ پھر ان کی صحت زیادہ تگ و دو کی اجازت نہیں دیتی تھی اس لئے تقریباً گوشہ نشین ہو کر رہ گئے تھے اس کے باوجود بزم سیماب کے مشاعرے پوری پابندی سے منعقد کراتے رہے بمبئی کے مشہور ماہنامہ "شاعر" کے بانی اعجاز صدیقی ان کے بھائی تھے۔

منظر صدیقی کا انتقال ۲ر اکتوبر ۱۹۷۱ء کو کراچی میں ہوا۔

منظر صدیقی

عکسِ فن

جینے کی آرزو ہے اگر بانکپن کے ساتھ
دیوانہ وار کھیلئے دار و رسن کے ساتھ

کتنے قرنوں سے ہے دنیا کی زباں پر یہ سوال
آدمی واقفِ آدابِ جہاں ہے کہ نہیں

تصوّر جب کسی کا آگیا گویا سمٹ آئیں
بہاریں زندگی کی دھڑکنیں رعنائیاں ساری!

جستجو یہ تھی کہ آخر کس کو کہئے راہزن
بات بڑھتے بڑھتے میرِ کارواں تک آگئی

اے ہم نفسو ہم ہوئے آسودۂ منزل
اب طعن نہ دینا ہمیں بے بال و پری کا

مَیں اور التجائے کرم آپ سے کروں
یہ بھیک دیجئے اسے جس کا خدا نہ ہو

پُوچھتا ہوں یہ نئے دَور کے انسانوں سے
کہیں تہذیب و تمدّن کا نشاں ہے کہ نہیں

ناصر کاظمی



برگ نے
پہلی بارش
دیوان

پیدائش ۱۹۲۵ء
وفات ۱۹۷۲ء

دائم آباد رہے گی دُنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا

ناصر کاظمی

یہ ۱۹۴۲ء کی بات ہے لاہور کے اسلامیہ کالج میں مشاعرہ تھا۔ جس میں اختر شیرانی سالک۔ اعجاز بٹالوی۔ اختر الایمان۔ حفیظ ہوشیارپوری اور دیگر شعراء شریک ہوئے مبتدی شعراء میں ایک سترہ سالہ طالب علم بھی تھا۔ اپنے وقت کے اتنے عظیم شعراء کے ہجوم میں اسٹیج پر آکر ایک مبتدی کا بے تحاشہ داد وصول کر جانا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ یہ یہ سترہ سالہ طالب علم جس کے جسم میں جھجھک اور انجانے خوف سے کپکپی سی طاری تھی۔ مشاعرہ لوٹ گیا۔ بڑے اعتماد سے اس نے غزل چھیڑی۔

ع اے دوست میں نے ترک محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

داد کے ڈونگرے برسنے لگے۔ داد تحسین کے ساتھ غزل پر انعام بھی ملا۔ مشاعرے کے دوسرے روز سارے شہر میں اس غزل کا چرچا ہونے لگا۔ تب ہی سے ایک شاعر آسمان ادب پر ابھرا۔ شہرت کا یہ عالم تھا کہ تین ماہ بعد ایک عید کارڈ ملا۔ جس پر ان کی غزل کا مندرجہ بالا شعر لکھا ہوا تھا۔ اتنی شہرت ایک ہی غزل کے ساتھ ان کے کسی ہم عصر کو نصیب نہ ہوئی اس سے ناصر کاظمی کو بھی اتفاق تھا۔

لیکن ناصر کاظمی کی اس شہرت نے جہاں ان کے لئے ترقی کی اور راہیں ہموار کر دیں۔ وہاں ایک اہم بات یہ بھی ہوئی۔ کہ ان کی والدہ ماجدہ نے جو ان کی شاعری کی سرے سے مخالف تھیں۔ یہ مشورہ دیا کہ ایک غزل یا نظم کی شہرت دائمی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ یوں سمجھو کہ یہ غزل ایک امتحان ہے ہر بڑے شاعر کو یہ بات گرہ میں باندھ لینی چاہیئے کہ اسے دوسری غزل بھی اسی پائے کی لکھنا ہے ناصر کاظمی نے اس مشورے کو تعویذ بنا لیا۔ چنانچہ ہمیشہ ان کی تازہ غزل نے ان کی پچھلی غزل کے

مقابلے میں ایک نیا سنگِ میل قائم کیا۔

ناصر کاظمی ۱۹۲۵ء میں انبالہ میں پیدا ہوئے۔ آٹھویں جماعت میں تعلیم پا رہے تھے تب ایک سلام لکھا۔ ان کے نانا اور والد صاحب شعر و سخن کے دلدادہ تھے۔ گو کہ والد کا تعلق فوج سے تھا۔ لیکن ادب کے سلسلے میں ان کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔ نانا اور والدہ کو موسیقی سے بھی شغف تھا۔ ناصر کاظمی نے ۱۹۳۹ء میں جب وہ نویں جماعت میں تھے باقاعدہ شعر گوئی کی ابتداء کی۔ ماں نے بچے کا یہ رجحان دیکھا تو ڈانٹ دیا کہ کس "بلا" کو گلے لگا لیا۔ اب ناصر کش مکش میں تھے کہ کیا کریں کیا نہ کریں۔ یہ کیفیت ۱۹۴۶ء تک رہی یہ وہی دور تھا جب نئی غزل کی بنا پڑ چکی تھی اور اس کا سہرا فراق گورکھپوری کے سر تھا۔ تقسیم کے بعد جن شعرائے اس پودے کو پروان چڑھایا اس میں ناصر کاظمی کا نام سرفہرست ہے۔

ناصر نے ابتدائی تعلیم انبالے میں حاصل کی۔ شملے سے مڈل کرنے کے بعد پھر انبالے آ گئے اور پھر لاہور آ کر تعلیم مکمل کی۔ حفیظ ہوشیارپوری کو ناصر اپنا استاد مانتے تھے۔ ویسے سے بھی انہوں نے فیض حاصل کیا۔ ابتداء میں اختر شیرانی کے رنگ میں سانیٹ اور نظمیں وغیرہ لکھیں۔ لیکن طبیعت نہیں جمی۔ چنانچہ غزل گوئی شروع کر دی۔ پہلی غزل "ادب لطیف" میں چھپی۔ اس کے بعد ہمایوں ادبی دنیا اور سویرا میں کلام شائع ہوتا رہا۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۸ء تک شعر گوئی ترک کر کے شکار شروع کر دیا۔ اس میں شیر، چیتے، ہرن مرغابیاں وغیرہ شامل کی جا سکتی ہیں۔ لیکن جلد ہی گھبرا گئے اور بندوق پھینک کر قلم سنبھال لیا شعر گوئی کے ساتھ نثر بھی لکھی اور اس لئے کہ بقول خود پائے کا شاعر بننے کے لیے یہ بہت ضروری تھا۔ نثر میں پانچ چھ مضامین اور پانچ سات مذاکرات بھی لکھے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں محکمہ خوراک میانوالی میں تقرر ہوا۔ لیکن شاعرانہ موڈ نے جانے کی اجازت نہ دی۔ چنانچہ سالک صاحب کے تعاون سے پولیس میں سب انسپکٹر ہو گئے۔ وردی پہن کر بڑے خوش تھے۔ دوسرے روز ہیڈ آفس میں دن بھر کی کارگزاری کی رپورٹ دے کر شام کو سالک مرحوم کے پاس چائے پینے چلے گئے۔ انہوں نے دیکھتے ہی کہا۔ آخاہ... تھانیدار صاحب تشریف لائے ہیں۔ بقول ناصر کے یہ جملہ ایک تیر بن کر ان کی انا کو زخمی کر گیا۔ تھانیدار کی وردی کے نیچے جو شاعر چھپا بیٹھا

تھا۔ اس نے جھنجھوڑا اور حضرت دوسرے روز اپنا استعفا دفتر داخل کر کے "شاعر" کو چھوڑ آئے۔ اس کے بعد سابق گورنر پنجاب جناب اختر حسین صاحب کے اصرار پر نائب تحصیلدار ہوئے۔ اسی دوران ایمپلائمنٹ ایکسچینج میں معاون مینجر کی ملازمت ملی اور سیالکوٹ چلے گئے تین ماہ ملازمت کی کہ اس دوران والدہ صاحبہ رحلت فرما گئیں۔ چنانچہ واپس آ گئے اور ریاض کے ساتھ مل کر "اوراقِ نو" نکالا جس کے سرپرست عبدالقادر صاحب تھے۔ تین ماہ بعد پرچہ بند ہو گیا۔ تو "آفاق" میں کالم نگاری شروع کر دی۔ ساتھ ہی دوسرے اخبارات میں بھی لکھتے رہے۔ یہ دور ان کی زندگی کا سنہرا دور تھا۔ احمد ندیم قاسمی۔ حفیظ ہوشیارپوری۔ اختر شیرانی۔ حمید نسیم۔ تاثیر۔ مجید بھٹی۔ چراغ حسن حسرت۔ تابش صدیقی۔ اور مولانا سالک جیسے مدبر انشاپردازوں کی صحبت نصیب تھی۔ شب و روز لکھنے کا شغل تھا۔ شب بیداری نے گو صحت تو کر دی لیکن اس محنت اور کاوش نے ناصر کے لئے نئی راہیں کھول دیں اور شاعر ستاروں سے آگے نئے جہاں کی تلاش میں عظمت کی بلندیوں کو چھونے لگا۔

ناصر نے ۱۹۵۲ء میں شادی کی دلہن کو بیاہ کر لائے تو مفلسی دروازے پر استقبال کو موجود تھی نہ ملازمت نہ مکان نہ زر پاس تھا۔ بس ایک رفیقہ حیات تھی۔ اور جیب میں کل چھ روپے، صبر اور ضبط البتہ اپنا سایہ کئے ہوئے تھا۔ ان ہی دنوں حفیظ صاحب کے کہنے سے "ہمایوں" کی ادارت سنبھال لی پانچ سال کے بعد جب پرچہ بند ہو گیا تو بے کاری پھر آ دامنگیر ہوئی لیکن کاظمی کو اپنی بے کاری سے زیادہ پرچے کی موت کا افسوس ہوا۔ اس کے بعد انتظار حسین کی ادارت میں "خیال" کی بنیاد ڈالی لیکن وہی زرد سیاہ کی بے رنائی سے یہاں بھی ڈالنے پڑے۔ پھر سوشل ویلفیئر میں بحیثیت ایڈیٹر ملازم ہوئے۔ پرچہ نکلنے سے قبل مارشل لاء کا نفاذ ہوا پروگرام تبدیل ہو گیا اور ناصر پھر بے کار ہو گئے۔ زندگی کی کڑی میں جدوجہد کرتے ہوئے ۱۹۶۴ء میں ریڈیو پاکستان لاہور پہنچے اور اس ادارے سے عرصے تک منسلک رہے۔

ناصر کے کلام کا ایک مجموعہ "برگ نے" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ مقبولیت کے باعث اس کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ دو نئے مجموعے بھی زیر ترتیب تھے۔

ناصر کاظمی

سخن ور (تذکرۂ شعراء)

زبان کے تحفظ کے سلسلے میں ناصر مطمئن تھے کہ جب تک غالب، میر اور انیس زندہ ہیں اردو بھی زندہ رہے گی۔ اردو ایک تہذیب ہے۔ چنانچہ مخالفت کی وجہ زبان نہیں بلکہ تہذیب ہے۔ ہم اگر تعصب کے عفریت کا گلا گھونٹ دیں تو اردو کو حیات خضر مل جائے گی۔ ہاں قومیت اور جدید زمانے کا شعور پیدا کرنے کے لئے اردو کے ساتھ ساتھ مقامی زبانوں کی ترویج و ترقی بھی از بس ضروری ہے۔

اردو شاعری میں نئی تشبیہات اور استعاروں کی کمی کی وجہ بتاتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ ہم ابھی تک دقیانوسیت کا شکار ہیں۔ اردو کو اس وقت جدید شاعری کی ضرورت ہے۔ چنانچہ شمشیر، تیر و تفنگ اور نشان حیدری جیسی اصطلاحات کی جگہ نئے استعاروں کا استعمال جب ہی عام ہو سکے گا جب ہم ماضی کی قدروں سے استفادہ کریں۔ کیونکہ ماضی کے بغیر مستقبل کا تصور ممکن نہیں۔

بچوں کے ادب کے سلسلے میں ناصر کاظمی نے بڑے دکھ کے ساتھ کہا کہ ہمارے ادیب و شعراء بچوں کے لئے لکھنا تضیع اوقات اور ایک گھٹیا کام سمجھتے ہیں اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ بچوں کا ادب تخلیق کرنا آسان کام نہیں اس کے لئے پختہ شعور اور گہرے فکر و نظر کی ضرورت ہے۔

ادب میں گھٹن کے احساس کی وجہ بتاتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ ہمارے شاعر و ادیب کی غیر یقینی سماجی حیثیت ہے۔ آج کا شاعر ہو یا ادیب وہ صرف اپنی قیمت وصول کرنا چاہتا ہے۔ اگر ہم منافقت چھوڑ کر حق گوئی کا راستہ اختیار کریں اور اس مقصد کے لئے ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کر لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ گھٹن کا یہ احساس دم توڑ دے۔ شاعری اور زندگی کو آپس میں گھل مل جانے کی ضرورت ہے۔ تب قدم قدم پر جو یہ ٹکراؤ اور تضاد ہے خود بخود ختم ہو جائے گا۔ اسے مان لیا کہ شاعر محض شاعر نہیں ایک انسان بھی ہے اور اسے ایک نارمل زندگی کی ضرورت ہے۔ لیکن افسوس کہ آج ہم محض ایک غزل کے ذریعہ امریکہ کا دورہ چاہتے ہیں۔ ریفریجریٹر اور دیگر آسائشوں کے طالب ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے زندگی کی حقیقتوں سے نظریں چرا رکھی ہیں۔

خوب صورت سوچ، حساس اور معصوم تمنائیں رکھنے والے اس شاعر نے مارچ ۱۹۷۲ء کی ایک صبح کو ہمیشہ کے لئے اس بدصورت دنیا سے منہ موڑ لیا۔ تب اس کے پڑھنے والوں اور اس

سے پیار کرنے والوں کو اس کا یہ شعر اتنا سچا معلوم ہوا کہ پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

؎ دل تو میرا اداس ہے ناصرؔ
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

ناصرؔ نے اپنے مجموعے 'برگِ نے' کے دیباچے میں اعتبارِ نغمہ کے عنوان سے خود لکھا ہے کہ " نالہ آفرینی جبر و اختیار کا ایک انوکھا کرشمہ ہے۔ قاری کے دل میں جگہ پانا بھی محض اس کے بس کی بات نہیں۔ آواز قوی ہو تو دور دور پہنچ جاتی ہے۔ نحیف ہو تو حلق سے باہر ہی نہیں نکلنے پاتی۔ صرف پہنچنے کی بات نہیں، دیکھنا یہ ہے کہ ایک آواز ہزاروں کی آواز بن بھی سکتی ہے یا نہیں۔ محض ہزاروں کا ذکر کرنے یا ہزاروں کو مخاطب کرنے سے ان کی دھڑکنیں اور لرزشیں ساز کی ہم نوائی نہیں کر سکتیں۔ نالہ محفلیں برہم نہیں کرتا۔ نالہ آفریں پر جو کچھ بھی گذری ہو اس کی فریاد فن کے سانچے میں ڈھل کر نغمہ نہیں بن سکتی تو محض چیخ و پکار ہے۔"

کیا ناصرؔ نے سچ نہیں کہا تھا؟

٭

ناصر کاظمی

عکسِ فن

تو نے تاروں سے شب کی مانگ بھری
مجھ کو اک اشکِ صبحگاہی دے!

رات بھر جاگتے رہتے ہو بھلا کیوں ناصر
تم نے یہ دولتِ بیدار کہاں سے پائی

شہر کی بے چراغ گلیوں میں
زندگی تجھ کو ڈھونڈتی ہے ابھی

جب سے دیکھا ہے ترے ہاتھ کا چاند
میں نے دیکھا ہی نہیں رات کا چاند

جی ٹھکانے نہیں جب سے ناصر
شہر لگتا ہے بیاباں مجھے

عشق میں جیت ہوئی یا مات
آج کی رات نہ چھیڑ یہ بات

کیا سے کیا ہو گئی دنیا پیارے
تو وہیں پر ہے جہاں تھا پہلے

احمد ندیم قاسمی



جلال و جمال

محیط

دوام

دشتِ وفا

رم جھم

شعلۂ گل

پیدائش ۱۹۱۶ء

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

احمد ندیم قاسمی

یکم فروری ۶۸ء

احمد ندیم قاسمی

کچھ لوگ جو نثر اور نظم دونوں لکھتے ہیں۔ اس سے شاکی رہا کرتے ہیں کہ جب نثر لکھنے والوں کا ذکر ہوتا ہے تو لوگ انہیں شاعر کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں اور جب تذکرہ شعرا کا ہوتا ہے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ تو نثر نگار ہے۔ لیکن احمد ندیم قاسمی کی شخصیت ایسی ہے کہ دونوں طبقے انہیں سر آنکھوں پر جگہ دیتے ہیں۔ وہ اس عہد میں اردو کے چند سب سے بڑے افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں اور بحیثیت شاعر بھی ایک اعلیٰ منفرد مقام کے مالک ہیں۔

ان کا پیدائشی نام احمد شاہ ہے۔ قاسمی خاندانی نسب ہے اور ندیم تخلص رکھا تھا۔ یوں احمد ندیم بنے اور قاسمی ہو گئے۔ ۲۰ر نومبر ۱۹۱۶ء کو سرگودھا کے ایک گاؤں انگہ میں پیدا ہوئے۔ آٹھ سال کے تھے کہ والد کا سایہ اٹھ گیا۔ لیکن چچا پیر حیدر شاہ نے سر پر ہاتھ رکھا اور بیٹا بنا کر پرورش کی۔ وہ سول سروس میں تھے اور آئے دن تبادلے ہوتے رہتے تھے۔ چنانچہ ندیم بھی جو ابتدائی تعلیم انگہ میں حاصل کر چکے تھے۔ کیمبل پور، شیخوپورہ اور بہاولپور میں تعلیم پاتے رہے۔ اس طرح ۱۹۳۵ء میں بی۔اے کر لیا۔

بچپن سے ہی ان پر سنجیدگی طاری ہو گئی تھی اور مطالعے کے انتخاب میں بڑوں کی پیروی کرتے تھے یہ اسی سنجیدگی کا نتیجہ تھا کہ جب مولانا محمد علی کا انتقال ہوا تو انہوں نے اس موقعہ پر ایک نظم کہی جو لاہور کے مشہور روزنامہ "سیاست" میں پہلے صفحے پر شائع

ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر صرف پندرہ سال تھی۔ نظم دیکھ کر چچا نے بتایا کہ یہ عروض اور فن کے نقائص سے پاک ہے۔ اس نظم کے سلسلہ میں چچا کو متعدد تعریفی خطوط بھی وصول ہوئے۔ وہ نظم اب ان کے پاس نہیں ہے۔

مشہور ادیب محمد خالد اختر بھاولپور کالج میں ان کے دوست تھے اور انگریزی ادب کے بڑے دلدادہ تھے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ نظم میں کیا رکھا ہے۔ نثر لکھو تب بات ہے چنانچہ دوست کے کہنے سے ۱۹۳۴ء میں انہوں نے اپنا پہلا افسانہ "بت تراش" لکھا جو اختر شیرانی مرحوم کے رومان میں شائع ہوا۔ اس کے بعد وہ غزلیں اور نظمیں بھی لکھتے رہے اور افسانے بھی۔ رومان میں دو تین افسانے شائع ہوئے تو سعادت حسن منٹو نے اختر شیرانی کو خط لکھا کہ یہ نوجوان کون ہے اور کہاں کا رہنے والا ہے اس کے افسانوں نے مجھے بڑا متاثر کیا ہے۔ اختر شیرانی نے وہ خط اٹھا کر انہیں بھیج دیا انہوں نے منٹو کو جواب لکھا اور پھر خط و کتابت کا یہ سلسلہ سعادت حسن منٹو کی کی وفات تک جاری رہا۔ احمد ندیم قاسمی نے منٹو کے خطوط کتابی شکل میں شائع کئے ہیں۔ ان میں یہ خط بھی شامل ہے۔

بی اے کے بعد ندیم چار سال تلاش معاش میں مصروف رہے ۱۹۳۹ء میں آبکاری کے محکمے میں سب انسپکٹر ہو گئے اور ملتان میں تقرر ہوا۔ ڈھائی تین سال یہ نوکری کی پھر استعفیٰ دے دیا۔ اس کی وجہ وہاں کا ماحول تھا جس میں جھوٹے مقدمے بنانا اور غریبوں کے گھروں پر چھاپے مارنا پڑتے تھے۔

ایکسائز نوکری سے مستعفی ہو کر وہ لاہور چلے آئے اور بچوں کے مشہور رسالے "پھول" اور تہذیب انسواں کے ایڈیٹر ہو گئے۔ پھر ادب لطیف کی ادارت بھی ان کے ہاتھ آگئی۔ یہ سلسلہ ۱۹۴۶ء کے شروع تک چلتا رہا۔ جب وہ بیمار ہو کر گاؤں چلے گئے۔ کئی ماہ کی بیماری کے بعد جب اچھے ہوئے تو پشاور ریڈیو اسٹیشن میں اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ اس ملازمت کے دوران لاہور سے "سویرا" جاری ہوا یہ پشاور میں بیٹھ کر اسے مرتب کرتے رہے، مارچ ۱۹۴۸ء میں ریڈیو کی ملازمت

چھوڑ کر لاہور آ گئے اور "سویرا" سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد ہاجرہ مسرور کے ساتھ مل کر ۱۹۴۸ء میں ہی نقوش جاری کیا۔ نقوش میں اور بھی حصے دار تھے۔ یہ دونوں یعنی احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور دو برس تک اس کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے لیکن ان کی پالیسی دوسرے حصہ داروں کو پسند نہ تھی لہذا ۱۹۵۰ء کے آغاز میں انہوں نے نقوش چھوڑ دیا۔ ایک سال یونہی گزرا اور پھر ۱۹۵۱ء میں سیفٹی کے تحت انہیں جیل بھیج دیا گیا۔ احمد علی خاں، حمید اختر، ظہیر کاشمیری، ظہیر بابر، فیض احمد فیض وغیرہ سب پہلے ہی جیل میں تھے۔ چھ ماہ جیل میں رہنے کے بعد ۱۹۵۱ء کے آخر میں رہا ہوئے۔ پھر قریب ایک سال بیکاری میں گزرا۔ ۱۹۵۳ء میں یہ روزنامہ امروز کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور اپریل ۱۹۵۹ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اسی دوران تین ماہ احتیاطی نظر بندی کے تحت جیل میں بھی رہے۔ جب حکومت نے امروز پر قبضہ کر لیا تو آپ مستعفی ہو گئے۔ اور ۱۹۶۳ء میں "فنون" جاری کیا۔ جو اب تک جاری ہے۔

احمد ندیم قاسمی ان لوگوں میں سے ہیں۔ جو خاموشی سے کام کرتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابوں کی تعداد سن کر وہ لوگ بھی چونک اٹھتے ہیں جو انہیں پڑھتے رہتے ہیں۔

"چوپال، طلوع و غروب، آنچل، آبلے، در و دیوار، آس پاس، سناٹا، بازار حیات، برگ حنا" وغیرہ وغیرہ غرض ان کے ۱۳ مجموعے تو فقط افسانوں کے شائع ہو چکے ہیں قطعات کا ایک مجموعہ "رم جھم" کے نام سے اور غزلوں اور نظموں کے مجموعے "جلال و جمال، شعلۂ گل، دشت وفا اور محیط شائع ہو چکے ہیں۔ کپاس کا پھول ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے جو چند سال قبل شائع ہوا ہے۔

احمد ندیم قاسمی سے میں نے سوال کیا "لوگوں کا کہنا ہے کہ کہانی یا افسانے کی اب وہ مقبولیت نہیں رہی جو پہلے تھی"۔ اس پہ وہ بولے۔

"شکر ہے آپ نے یہ سوال پوچھا۔ ایک ادبی رسالے کے مدیر کی حیثیت سے میں

کہہ رہا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ فنون کے کسی شمارے میں افسانوں کی تعداد کم ہو جاتی ہے تو قارئین شکایت کرنے لگتے ہیں۔"

انہوں نے بڑے دو ٹوک طریقے پر یہ کہا کہ شکار کے قصوں اور اس نہج کے دوسرے مواد کو ادب نہیں کہا جا سکتا۔ نہ یہ معلوماتی کہانیاں شمار کی جا سکتی ہیں۔

احمد ندیم قاسمی نے ایک بڑی باریک بات بتائی۔ انہوں نے کہا کہ تنظیم اور تحریک میں بڑا فرق ہے۔ پاکستان میں ترقی پسند ادب کی تنظیم ختم ہو چکی ہے لیکن تحریک جاری ہے اور اب بھی اسی تیزی سے لکھا جا رہا ہے۔ فرق محض اتنا ہے کہ پہلے رسالوں میں اس کی نمائندگی اجتماعی طور پر ہوتی تھی۔ اب نہیں ہوتی۔ انہوں نے کہا ترقی پسند ادب کے سلسلہ میں بعض لوگوں نے جو لیبل لگا رکھے ہیں میں اس کا قائل نہیں ہوں، اس سے میری مراد وہ لوگ ہیں جو ادب کو ایک خاص سانچے میں ڈھال کر اسے ترقی پسند کا نام دیتے ہیں ادب کو مخصوص سانچوں میں نہیں ڈھالا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اس سے اتفاق کیا کہ شاعری میں اور اب تو افسانوں میں بھی ابہام داخل ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ انہوں نے یہ قرار دی کہ تہذیبی اعتبار سے ہم ایک عبوری دور سے گذر رہے ہیں۔ ہمارے سامنے اپنے کلچر کے خطوط واضح شکل میں موجود نہیں ہیں۔ پرانی قدریں ختم ہو چکی ہیں یا شکستہ ہو چکی ہیں۔ اور نئی قدروں کی تخلیق یا تشکیل میں بہت تاخیر ہو رہی ہے۔ یوں ایک ذہنی خلا پیدا ہو گیا ہے جس کی وجہ سے ہمارا نوجوان ادیب اور شاعر محض اپنی ذات میں گم ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ ابہام ہے۔

احمد ندیم قاسمی نے بتایا کہ اسے ختم کرنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ نوجوان طبقے کے ذہن میں صحت مند مشرقی اقدار کا احساس اور احترام پیدا کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ مغربی تہذیب کی بعض قدروں سے محض اس بنا پر نفرت نہیں کرنا چاہئے کہ ان کا تعلق بدیسی تہذیب سے ہے۔ اگر جدید تہذیب کا متوازن امتزاج پیدا کیا جائے تو ہم کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ویسے یہ کیفیت عارضی ہے۔"

ادبی رسالوں کی زبوں حالی کے بارے میں انہوں نے کہا کہ "پاکستان میں صورت حال

زیادہ دردناک اس وجہ سے ہے کہ یہاں محض فروخت کے بل پر کوئی رسالہ کامیابی کے ساتھ جاری نہیں رہ سکتا۔ مختلف قسم کی صنعتوں سے وابستہ ایسے لوگ جو ادبی ذوق شوق رکھتے ہیں وہ عزت مندانہ سطح پر اشتہارات دے کر تعاون کریں تب ہی یہ پرچے زندہ رہ سکتے ہیں لیکن اس میں یہ خطرہ بھی ہے کہ وہ رسالوں پر نقطہ نظر ٹھونسنے کی کوشش کریں گے۔ یہ بھی بڑی مخدوش بات ہے۔ ادبی پرچوں کو زندہ رکھنے کی ایک اور صورت بھی موجود ہے اور وہ یہ کہ ادیبوں کے تعاون سے ایک انجمن بنائی جائے جو امداد باہمی کے اصول پر کام کرے لیکن اس میں قباحت یہ ہے کہ ادیبوں کی انا کی دھار بڑی تیز ہوتی ہے۔ امداد باہمی والے تعاون کے لئے بڑی قربانیاں درکار ہوں گی۔

میں نے پوچھا کہ نئے ادیبوں اور شاعروں کے لئے آپ کے پاس کیا پیغام ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ "جب تک کرہ ارض پر انسان موجود ہے، ہر شے میں حسن بھی ہے اور معنی بھی۔ جب انسان نہ رہے گا تو تاریکی اور ویرانی ہوگی۔ اس لئے نوجوان ادیب خواہ اپنی ذات کو ادب کا موضوع بنائیں یا کسی چیز کو، لیکن اس بات کا ضرور خیال رہے کہ آپ کی تحریر سے انسان میں ذہنی تناسب، حسن اور خیر و برکت کا جذبہ پیدا ہو۔ یہی ترقی پسند ادب کی کسوٹی ہے۔"

احمد ندیم قاسمی آج کل لاہور میں ہیں۔ ماہنامہ 'فنون' اب بھی ان کی زیر ادارت اسی آب و تاب سے نکل رہا ہے۔ قاسمی صاحب روزنامہ جنگ میں بھی ہفتہ وار کالم لکھ رہے ہیں۔

احمد ندیمؔ قاسمی

عکسِ فن

اے خدا، اب ترے فردوس پہ میرا حق ہے
تُو نے اس دور کے دوزخ میں جلایا ہے مجھے

وہ ایک بار مرے، جن کو تھا حیات سے پیار
جو زندگی سے گریزاں تھے، روز مرتے تھے

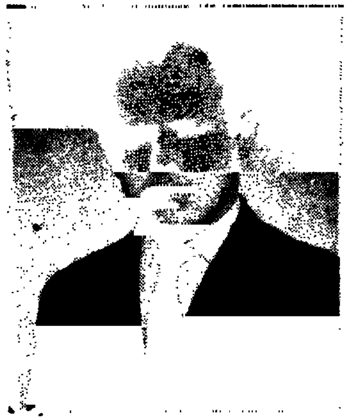
ظلمتِ شب میں بھی شرماتے ہو
درد چمکے گا تو پھر کیا ہوگا

زخم بھرتا ہے زمانہ، مگر اس طرح ندیمؔ
سی رہا ہو کوئی پھولوں کے گریباں جیسے

مری پہچان تو مشکل تھی، مگر یاروں نے
زخم اپنے جو کریدے ہیں تو پایا ہے مجھے

مَروں تو میں کسی چہرے میں رنگ بھر جاؤں
ندیمؔ کاش یہی ایک کام کر جاؤں

وزیر آغا



دن کا زرد پہاڑ
شام اور سائے
غزلیں



پیدائش ۱۹۲۲ء

جائیں گے ہم بھی خواب کے اس شہر کی طرف
ناؤ ملے تو آئے مسافر اُتار کے

وزیر آغا
۴ مارچ ۷۹ء

وزیر آغا

پورا نام وزیر آغا ہے۔ مئی ۱۹۲۲ء میں وزیر کوٹ سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ گو شاعری کا آغاز فرضی نام سے کیا لیکن جب ایک نظم بعنوان "دھوپ کی آواز" حلقہ ارباب ذوق کی نظموں کے انتخاب میں (۱۹۴۲ء) میں شامل ہوئی تو یہ نام ترک کر دیا۔

وزیر آغا کہتے ہیں کہ ان کے خاندان میں کسی نے شاعری کی طرف توجہ نہ دی اور جب سالہا سال بعد ان کے والد صاحب کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے سخت حیرت کا اظہار کیا لیکن حوصلہ شکنی نہیں کی۔ کیونکہ شاعر موصوف اس دشت میں اتنے آگے نکل چکے تھے کہ واپسی ناممکن تھی۔ ویسے وزیر آغا نے نظم کے مقابلے میں نثر بہت زیادہ لکھی ہے۔ نثر نگاری کی ابتدا مسرت کے موضوع سے ہوئی۔ انہوں نے ایک کتاب لکھی۔ جو "مسرت کی تلاش" کے نام سے شائع ہوئی۔ معاشیات میں ایم۔ اے کرنے کے بعد انہوں نے "اردو ادب میں طنز و مزاح" کے عنوان پر ایک مقالہ لکھا۔ جو ۱۹۵۸ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ انشائیوں کی دو کتابیں "خیال پارے اور چوری سے یاری تک" شائع ہو چکی ہیں۔ پی ایچ ڈی کے بعد انہوں نے تنقید کی تین کتابیں یکے بعد دیگرے بعنوان "نظم جدید کی کروٹیں، اردو شاعری کا مزاج اور تنقید اور احتساب" لکھ ڈالیں علاوہ اس کے لاتعداد مختلف موضوعات پر مضامین لکھے جو ملک کے مختلف اخبارات اور رسائل میں شائع ہو کر ان کی ادبی و تنقیدی حیثیت کا لوہا منوا چکے ہیں۔ ایک سفر نامہ

بھی لکھا ہے اور صرف دو افسانے۔

اپنی شاعرانہ زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہوئے وزیر آغا صاحب نے بتایا کہ "اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں میں نے چند نظمیں ماہنامہ ساقی (دہلی) کو روانہ کیں لیکن قبول نہ ہو سکیں۔ پھر میں نے ازراہ مذاق نصرت آرا نصرت کے نام سے چند بے معنی نظمیں ارسال کر دیں جو فوراً قبول کر لی گئیں۔ یہ سلسلہ سال بھر جاری رہا۔ لیکن اس دوران میں ایک نسبتاً بہتر نظم بھی چھپ گئی جو حلقۂ ارباب ذوق کے سالانہ انتخاب میں شامل ہو گئی۔ معاملہ سنجیدہ صورت اختیار کرنے لگا تو میں نے فرضی نام ترک کر دیا۔

وزیر آغا کا مطالعہ محض ادبی کتابوں تک محدود نہیں بلکہ مختلف علوم مثلاً تاریخ، فلسفہ، نفسیات، علم الانسان، علم الحیات اور طبیعیات سے بھی انہوں نے اکتساب کیا۔ ادب کی موجودہ رفتار کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ نئی غزل نے بڑی تازگی اور قوت کا ثبوت دیا ہے۔ نئی نظم میں ایک گہری بصیرت کی جھلک ابھری ہے۔ آج تنقید کا سارا اسلوب ہی بدل گیا ہے۔ اب ادب پاروں کو اپنے تاثرات کی روشنی میں ہی نہیں بلکہ اسطور اور آرکی ٹائپ اور سیاسی و سماجی کروٹوں کے حوالے سے بھی دیکھنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اور بحیثیت مجموعی تنقید کا تخلیقی پہلو منظر عام پہ آ رہا ہے۔ افسانے میں نہ صرف کردار نگاری کی طرف ایک کامیاب رجحان سامنے آیا ہے بلکہ ایک خوب صورت تجزیاتی انداز بھی ابھرا ہے۔ اسی طرح ناول اور انشائیہ میں بھی بڑی ترقی ہوئی ہے۔ چنانچہ پورے وثوق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ادب کی موجودہ رفتار قابل اطمینان ہے۔

اردو شعر و ادب کی ترقی کے لئے انہوں نے چند تجاویز بھی پیش کیں۔ مثلاً یہ نہایت ضروری ہے کہ سکول، کالج اور یونیورسٹی کی سطح پہ طلبا کو جدید اردو ادب اور اس سے وابستہ ادبی تحریکات سے نہ صرف روشناس کرایا جائے۔ بلکہ اس سلسلے میں طلبا کے ذوق کو بھی نکھارا اور سنوارا جائے۔ ایم۔ اے کی سطح پہ کورس میں جدید اردو ادب کا ایک الگ پرچہ ہونا چاہیئے۔ اس کے علاوہ یورپی شاعری اور اس کی تنقید سے بھی اردو کے طلبا کو روشناس کرانے کی سخت ضرورت ہے۔ نیز ملک میں ایسی لائبریریاں بنائی جائیں جو جدید اردو

ادب کی کتب حاصل کریں اور پھر عوام تک انہیں پہنچائیں۔ بک کلب کے ذریعے بھی یہ کام انجام پا سکتا ہے۔ تیسرے مشاعرے کے رواج کو کم کیا جائے۔ چوتھے اردو میں مختلف علوم پر تعارف کے متعدد سلسلے شروع کئے جائیں تاکہ اردو شعر و ادب کے لئے ایک وسیع پس منظر مہیا ہو سکے۔

پانچویں اردو ادب کے بہترین نمونوں کو غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ کرنے کا انتظام کیا جائے۔

"کیا بیسویں صدی شاعری کے لئے سازگار ہے؟"

میرے اس سوال کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ "بیسویں صدی باقی تمام صدیوں کی بہ نسبت زیادہ سازگار ہے۔ وجہ یہ ہے کہ آج سے پہلے شاعری فلسفہ کہانی اور ڈرامہ وغیرہ کا ذریعہ اظہار بھی تھی لیکن نثر کے ترقی پانے پر یہ اب سمٹ کر خالص شعری کیفیت کے اظہار کے لئے مختص ہو گئی ہے۔ اور موجودہ صورت میں یہ بیسویں صدی کی کلبلاتی اور بین کرتی ہوئی روح روح کو نسبتاً زیادہ تسکین مہیا کر سکتی ہے۔"

"شاعری میں جدیدیت کو آپ کیا معنے پہناتے ہیں؟"

چند لمحے سوچ کر انہوں نے فرمایا کہ "شاعری میں جدیدیت سے مراد یہ ہے کہ شعر اپنی آفاقی صورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ارد گرد کی اشیاء، تحریکات، آوازوں اور بصری تجربوں کی عکاسی کرے بلکہ وہ اس تشنج کی کیفیت کو گرفت میں لینے کا بھی اہتمام کرے جو فرد اور جماعت کے تصادم سے پیدا ہوتی ہے۔ نیز وہ اس "نئی روح" کو بھی محسوس کرے جو "قدیم" کے ملبے سے برآمد ہو رہی ہے۔ جدیدیت کوئی تحریک نہیں بلکہ ایک زاویۂ نگاہ ہے۔ یہ اس کرب کا اظہار ہے جو حساس فرد نے ماضی سے کٹ کر محسوس کیا ہے اور جو ایک نئی ہستی کے وجود میں آنے کی بشارت بھی ہے۔ اگر آج کی شاعری کا کوئی نمونہ "جدیدیت" کی اس روح سے بیگانہ ہے تو اسے شاعری کہنا بھی مناسب نہیں۔

وزیر آغا آزاد شاعری کے حامی ہیں۔ بقول ان کے آزاد شاعری میں بے پناہ توانائی اور گہرائی ہے۔ اسے محض افسانہ کہنا اس کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ کیونکہ اس نے اپنی پٹی ہوئی لفظی اور صوتی کھائیوں سے باہر آ کر شعری تجربات کی اصل صورت کو سامنے لانے کا اہتمام کیا

ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے ۔ جیسے اب پابند نظموں کا روایتی اور پامال آہنگ اور پٹی ہوئی مستعار خیال آرائی زیادہ عرصے تک مقبول نہ رہ سکے گی ۔"

وزیر آغا کے تنقیدی مضامین اور نظموں کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں شام اور سائے اور دن کا زرد پہاڑ ۔ ان کے مجموعوں کا نام ہے ۔ شام اور سائے میں صرف نظمیں ہیں اور دن کا زرد پہاڑ میں نظموں کے علاوہ غزلیں بھی شامل ہیں ۔ ۱۹۶۶ء میں ان کی غزلوں کا مجموعہ بعنوان غزلیں شائع ہوا ۔ جنوری ۱۹۶۹ء میں نظموں کا مجموعہ "نردبان" کے نام سے شائع ہوا ۔ یہ ان کی نظموں کا تیسرا مجموعہ ہے ۔ نردبان فارسی کا لفظ ہے جس کا لغوی مفہوم ہے زینہ یا سیڑھی اور اصطلاحی مفہوم ہے رفعت یا مرتبۂ بلند ۔ وزیر آغا نے نردبان کے دیباچے میں اس لفظ کی تشریح کرتے ہوئے بڑی سچی اور خوب صورت باتیں کہی ہیں جو بلاشبہ معلومات میں اضافہ کرتی ہیں ۔ آغا کا قلم اب بھی اسی تیزی سے رواں دواں ہے ۔ جیسا پہلے تھا ۔ آغا صاحب نے عارف عبدالمتین کے ساتھ مل کر کوئی دس سال قبل ادبی رسالے "اوراق" کا اجرا کیا ۔ چند سال پہلے عارف عبدالمتین علیحدہ ہو گئے ۔ اب سجاد نقوی اس پرچے کے مدیر ہیں ۔ اور وزیر آغا مدیر اعلیٰ ۔ وزیر آغا صاحب کی مستقل رہائش سرگودھا میں ہے ۔ کبھی کبھی لاہور آتے رہتے ہیں ۔

٭

وزیر آغا

عکسِ فن

لازم نہیں کہ تم سے ہی پہنچے ہمیں گزند
ہم خود بھی اپنے درپئے آزار ہو گئے

چھاؤں کا ایسا قحط پڑا اس برس کہ دھوپ
ہر سو کھتے شجر کے لئے سائباں ہوئی

وہ پھول ہے تو اپنی ہی خوشبو میں تر رہے
بے وجہ کیوں ہوا کی طرح دربدر رہے

روز رہا ہوں ایک مدت سے مگر
آنکھ سے آنسو کوئی ٹپکا نہیں

دھن اپنا لٹائے رات بھر وہ
شبنم کی اسی میں آبرو ہے

آخر اُسی نے تجھ پہ نچھاور کیا لہو
وہ شخص جس کو اپنا تو گردانتا نہ تھا

حادثہ

ہر بچے کو
اُڑتی تتلی سرگوشی میں بتلاتی ہے
ماں تیری ندیا کے اندر
دُودھ کا اک مشکیزہ لے کر
تیرا رستہ دیکھ رہی ہے
کون بتلائے گا ان بچوں کو
ماں ندیا کے اندر کب ہے
ماں تو خود اک تیز ندی ہے
ماں — اک دودھ بھری ندی ہے

ط ٠ م